DAMAGE BOOK



رپورٹ

متعلق بہ اجلاس سی و ششم

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

منعقدہ ۲۶ لغایتہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء بمقام علی گڑھ

جلد دوم

جس میں مختلف علوم و فنون کے ماہروں کے

۲۳ - لکچر اردو زبان میں ہیں

جو حسب ہدایت نواب صدیار جنگ مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری کانفرنس مرتب کی گئی

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوئی ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء

فہرست مضامین جلد دوم

جس میں مختلف علوم و فنون کے ماہروں کے تیئیس لکچر اردو زبان میں درج ہیں

فہرست مضامین

ضمیمہ جات تعلیمی لیکچرز (اردو)

علی گڑھ میں عظیم الشان تعلیمی نمائش

از خان صاحب مولوی ادریس احمد صاحب بی اے ایس سی ہیڈ ماسٹر

گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہاں پور

خان صاحب مولوی ادریس احمد صاحب کسی زمانہ میں کانفرنس کے سپرنٹنڈنٹ رہ چکے ہیں آپ کے زمانہ سپرنٹنڈنٹی میں کانفرنس نے بہت ترقی کی تھی۔ اب تک آپ کو کانفرنس سے بہت دلچسپی ہے اس لئے نمائش کا جو مختصر حال آپ نے لکھا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے)

اپنی ناواقفیت اور اپنے محدود مشاہدے کے ہاتھوں ہمارے دماغوں میں تعلیم کا مفہوم اس قدر مختصر اس قدر تنگ اور اس قدر غیر دلچسپ رہتا چلا آیا ہے کہ علی گڑھ کی تعلیمی نمائش کے اعلانات اخباروں میں پڑھ کر کم سے کم میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ بانی نمائش نے علی گڑھ میں تعلیم کا ساز و سامان اس قدر وافر جمع کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے نہایت وسیع اور بلند بالا ہال اور کمرے اس قدر تنگ ہو جائینگے کہ کثیر التعداد مشتاق نظارہ بین کی ٹولیوں کو اس نادر اور نظر فریب ذخیرہ کو جی بھر کر دیکھ لینے کی غرض سے ان ہالوں اور کمروں میں چلنے پھرنے کی بھی کافی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اب تک تعلیمی نمائش کا سب سے بڑا نقشہ جو ذہن میں محفوظ تھا وہ ۱۹۱۰ء والی الہ آباد کے مشہور و معروف نمائش کی یاد سے وابستہ تھا جس میں ایک کمرہ اس ضروری شعبہ کے لئے مخصوص تھا۔ مگر جس وقت علی گڈھ پہونچ کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تعلیمی نمائش تک رسائی نصیب ہوئی تو آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اور سب سے پہلے مجھے اس بات کا حیرت انگیز احساس ہوا کہ میرا وجود کسی طرح ایک کنوئیں میں رہنے والے مینڈک سے بہتر نہیں ہے جس کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہوتی اور جو گولر کے بھنگوں کی طرح اپنے مختصر ماحول ہی کو دنیا سمجھے ہوئے ہوتا ہے مجھکو اس بات کا یقین ہے اور میں نے بہت سے کہنہ سال بزرگوں کو جو کانفرنس کے اس سالانہ اجلاس میں شریک تھے بار بار یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ اب سے پہلے ہندوستان میں کہیں کسی مقام پر بھی ایسی عظیم الشان تعلیمی نمائش کبھی نہیں ہوتی۔ کاش اس نمائش کا کوئی پیمانہ یا معیار ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتا تو اس کے حوالہ سے پبلک کو اس کی اطلاع دی جاتی تاکہ

سب لوگ خصوصاً مسلمان اس نادر موقع سے استفادہ کرنے کی غرض سے اپنے سو کام ہرج کرکے زیادہ سے زیادہ تعداد میں علی گڈھ پہونچتے اور دنیائے تعلیم کی اس دماغ افروز تصویر کا بچشم خود مشاہدہ کرتے۔ مگر میرے خیال میں حسرت کے لحاظ سے وہ لوگ جنہوں نے نمائش کو دیکھا اور وہ لوگ جو اس موقع پر علی گڈھ نہ پہونچ سکے قریب قریب برابر رہیں گے۔

علی گڈھ یونیورسٹی کے دس گیارہ بڑے بڑے وسیع ہال اور کمرے فرش سے چھتوں تک سامان سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، جدھر آنکھ اٹھتی تھی وہیں نگاہ قید ہو کر رہ جاتی تھی۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا ایں جاست

بھلا تین چار دن کے عرصہ میں (اور وہ بھی ماہ دسمبر جب کہ دن بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں) کیونکر اس ذخیرہ کثیر کے دیکھنے کا حق ادا ہو سکتا تھا۔ مہینے نہیں تو چند ہفتے تو دیکھنے کو ملتے الغرض جو لوگ علی گڈھ پہونچ سکے وہ تو یہ حسرت دل میں ساتھ لئے جارہے ہیں کہ آئے بھی اور کچھ نہ دیکھ پائے۔ اور جو لوگ بد قسمتی سے بالکل ہی نہ پہنچ سکے وہ حضرات جس وقت اس نمائش کی تفصیل دیکھنے والوں کے زبانی سنیں گے، ان کی حسرت کا تو میں کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ جب نمائش کے کمرے بند ہو جانے کے بعد اسٹریچی ہال کے سامنے مجمع ہوا کرتا تھا تو عموماً نمائش کے فوائد پر بحث ہوا کرتی تھی۔ میں نے ہر دفعہ اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ سب سے بڑا فائدہ جو اس ذخیرہ کثیر کو ایک جگہہ فراہم دیکھنے سے ہم سب کو خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو پہونچا ہے وہ اپنی ناواقفیت اور جہل کا احساس ہے۔ ہم کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ تعلیمی جدوجہد کے میدان میں دنیا کی دوسری معاصر قومیں کہاں سے کہاں تک پہونچ چکی ہیں۔ نمائش کے دیکھ چکنے کے بعد اور تعلیم کے جدید دلاویز طریقوں کے مشاہدے کے بعد صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُن لوگوں کے مقابلہ میں جو ان جدید طریقوں کے موجد اور ان طریقوں سے بہرہ یاب ہیں ہم کو وہی نسبت ہے جو تاریخ کے سنگی زمانہ میں (یعنی اسٹون ایج (Stone age) والوں کو ہمارے زمانہ سے کیا فرق ہے اس شخص میں جو پتھر کے آلات و اسلحہ سے اپنی حفاظت اور اپنی شکم پری کیا کرتا تھا اور اس شخص میں جو ۱۹۲۲ء میں بھی بچوں کو تھپیوں سے مار مار کر حروف تہجی اور ان کے مرکبات رٹواتے ہیں، ترجمہ کی غلطیوں پر ان کی گوشمالی کرتے ہیں، غیر زبان کا ایک فقرہ بتلانے سے پہلے صرف و نحو کے قواعد بچوں کو ایک میعاد مقررہ کے اندر یاد کرلینے میں اور طمانچوں اور بید کی مدد سے پہاڑے اور حساب کے قاعدے چھوٹے چھوٹے بچوں کو از بر کرانے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم کو اپنی مختص الوقت ضرورتوں کا احساس ہی

نہیں ہے اور ہم یہ نہیں جانتے کہ دوسری معاصر قومیں تعلیمی دوڑ میں ہم سے کس قدر آگے نکل چکی ہیں۔ اگر علی گڈھ کی نمایش کے مطالعہ کے بعد اپنی اس پسماندگی کا ہمارے دلوں میں احساس پیدا ہو گیا تو تو سمجھنا چاہیئے کہ نمایش نے اس دفعہ ایک ہی موقع پر وہ کام کر دکھایا جس کے انجام دینے میں ہماری ایجوکیشنل کانفرنس ۳۶ سال سے مصروف رہتی چلی آتی ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ جو اس نمایش سے غالباً مقصود تھا یہ ہے کہ جو لوگ مسئلہ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں انکی رہنمائی ہو۔ مثلاً جب تک بھاپ کی قوت اور اسکے گوناگوں استعمال سے لوگ ناواقف تھے اس طرف توجہ کا رخ ہی نہیں ہوتا تھا۔ مگر جب ایک دن ایک مرد واحد نے چولھے پر دیگچی کا سرپوش پھڑپھڑاتے ہوئے نگاہ غور سے دیکھ لیا اور اس کا خیال بھاپ کی قوت کی طرف رجوع ہوا تو اسکی فہم کو تنگ دو کرنے کا راستہ مل گیا بس پھر کیا تھا اس ایک مرد نے اس قوت سے جو کام لیا اس کے مظاہرہ کے بعد سیکڑوں قسم کے انجن اور کارخانے اور جہاز بن گئے اب بجلی کی قوت سے طرح طرح کا کام لینے کی غرض سے لوگ اپنا دماغ لڑا رہے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ تعلیم جیسے فرسودہ روکھے سوکھے دل آزار کام میں آخر کہاں تک دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے اور "طفل بہ مکتب نمی رود ولے برندش" کے اصول کی کہاں تک اصلاح ہو سکتی ہے۔ مگر علی گڈھ کی نمایش میں بعض خواتین یورپ کی ایجاد کردہ تازہ طریقہ ہائے تعلیم کی تفصیلات مانٹی سوری (Montessory) طریقہ تعلیم کے مشاہدہ سے گویا آنکھیں کھولدیں۔ کہ کس طرح حقیقی تعلیم کو بچوں کی تفریح کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ تعلیم کے ماتحت تین چار برس کی عمر ہی سے بچوں کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ استاد کی نگرانی میں اس کی کسی مداخلت کے بغیر بچے کھیل کود میں غیر محسوس طور پر تعلیم پاتے رہتے ہیں اور انکو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم مکتب یا مدرسہ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اور اسی طرح وہ صرف معمولی تعلیم ہی نہیں پاتے بلکہ روز بروز ان کی قوت مشاہدہ تیز ہوتی جاتی ہے وہ اپنی غلطیوں کی خود ہی اصلاح کر لیتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں قوت تخلیق اور ایجاد اوّل ہی دن سے کام کرنا شروع کر دیتی ہو مگر کسی طرح واقعی مشاہدہ کے بغیر اس طریقہ تعلیم کی خوبیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں کو یہ خیال گذرا کہ اس طریقہ تعلیم کے لئے جو ساز و سامان درکار ہے اس کے واسطے رقم کثیر کی ضرورت ہے۔ مگر عزم مصمم شرط ہے جب آدمی کام شروع کر دیتا ہے تو وہ کام کا راستہ بھی خود تلاش کر لیتا ہے۔ مثلاً نمونہ کے طور پر بچوں کو اس جدید طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے جب دیکھا یا تو ان کو لکڑی کے تختہ پر بنی ہوئی بیش قیمت تصویروں کے ٹکڑے اس غرض سے دےتے گئے کہ ان ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر ان سے وہ

سالم تصویر بنالیں۔ انکے بجائے کپڑے کے تھانوں پر جو تصویریں بزازوں کی دوکان پر مفت مل سکتی ہیں قینچی سے کتر کر ٹکڑے کر دیتے جانے سے بالکل وہی کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قیمتی کھلونوں کے بجائے لکڑی اور مٹی اور ٹین کے کھلونے آسانی سے والدین اور استاد خود بنا سکتے ہیں۔ طریقہ تعلیم کا یہ جدید نمونہ دیکھ کر دماغ نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا اور کم سے کم میں تو یہ پختہ ارادہ ساتھ لیکر علی گڈھ سے واپس جا رہا ہوں کہ گھر پہونچتے ہی اپنے چھوٹے بچوں کو قرآن شریف اور اردو سکھانے کے لئے یہ طریقہ کام میں لانا شروع کر دوں گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جیسے اندھیری رات میں غیر معلوم راستہ سے بے دیکھے منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے کسی مسافر کو کوئی خدا کا بندہ لالٹین حوالہ کر کے صحیح سڑک پر ڈالدے وہی کام صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب نے تعلیمی نمائش کے ذریعہ انجام دیا ہے۔ راستہ بتلا دیا اور روشنی ہاتھ میں دیدی۔ دماغوں میں تحریک و ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور گھروں پر پہونچکر جدید طریقوں سے کام لینے کے دل ہی دل میں منصوبے گٹھ رہے ہیں۔

نمائش کی تفصیل تو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کی جا سکتی ہے ممکن ہے کہ کانفرنس کی رپورٹ میں اس کا تفصیلی تذکرہ ہو مگر ناظرین کی آگاہی کے لئے نمائش کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں درج کرتا ہوں جس سے اسکی اہمیت اور شان کا خفیف اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) مشتاق منزل میں بچہ کی پیدائش اور زچہ کی حفاظت کے متعلق نقشے اور تصویریں اور ماڈل جمع کیئے گئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر مسز ہیلو دیکھنے والوں کو اس مبحث پر ان نقشوں تصاویر اور ماڈلوں کے حوالہ سے سمجھاتی تھیں کہ دوران حمل میں اور پیدا ہونے کے بعد بچے کی حفاظت کیونکر کی جائے۔ بچے کی پیدائش کے وقت کیا کیا سامان موجود ہونا چاہئے۔ زچہ کی تیمارداری کیونکر ہو صحت کے دشمنوں مکھی مچھر وغیرہ سے محفوظ رہنے کی کیا تدابیر ہیں۔ ایک کمرہ صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھا جس میں مردوں کو جانے کی اجازت نہ تھی اس کمرہ میں عورتوں سے مخصوص ان کے نفع کی باتیں میم صاحبہ عورتوں کو بتلاتی تھیں اور جاہل دائیوں کے ہاتھوں جو نقصان اٹھاتی ہیں ان سے ان کو آگاہ کرتی تھیں۔

(۲) حمید اللہ خاں لکچر روم میں مونٹ سوری ڈالٹن اور کنڈر گارٹن طریقوں پر بچوں کو تعلیم دینے کا سازو سامان اور کتابیں نقشے تصویریں اور کھلونے کثرت سے فراہم کئے گئے تھے۔ چار چار پانچ پانچ برس کے بہت سے بچے کمرہ میں واقعی تعلیم پا رہے تھے ہر بچہ اپنی خوشی کے مطابق کام کرتا تھا۔ اور ان بچوں کی قوت مشاہدہ کو تیز کرنے ان کی معلومات میں اضافہ کرنے اور انکی قوت تخلیق اور ایجاد

کو حرکت میں لانے کے لئے طرح طرح کے کھلونے اور آلات و سامان ان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس مبحث پر بہت سی مفید کتابیں بھی موجود تھیں۔

(۳) نظام میوزیم کے ایک حصّہ میں طرح طرح کا قدیم و جدید کھیلنے کا سامان، آلات ورزش اور اسلحہ سجائے گئے تھے۔ قسم قسم کے ڈھال، تلوار، خنجر، برچھی، پھری، گتکا، مگدر، ڈنڈا کشی، لیزم، گیند بلے، گلی، ڈنڈے، بنیٹی، ڈمبل، کلبس، ٹینس، ہاکی، کرکٹ، اور فٹ بال کا سامان موجود تھا اور اسکاؤٹنگ کے متعلق مفید کتابیں جمع تھیں۔

(۴) نظام میوزیم کے تیسرے حصّہ میں تعلیم ریاضی کے بیشمار آلات فراہم تھے۔ ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی تعلیم کا سامان اور کتابیں اس کمرہ میں جمع تھیں۔ ریاضی، علم ہیئت و فلکیات اور طبعیات کے جن مسائل کے حل میں طلباء برسوں دماغ سوزی کیا کرتے ہیں ان کو محض نظر سے سمجھانے کے لئے جو عجیب و غریب آلات ایجاد ہوتے ہیں وہ سب موجود تھے۔

(۵) بیک منزل کے دو وسیع ہالوں میں مختلف حصص ہندوستان کے طلباء کی کھینچی ہوئی رنگین و سادہ تصویریں نقشے اور قدرتی مناظر ہر زبان اور ہر قسم کی خوشخطی کی وصلیاں اور طلباء کے ہاتھ کا بنا ہوا طرح طرح کا چوبی سامان ملکی مصنوعات از قسم پارچہ جات سوتی و ریشمی و سامان چوبی لوہے اور ہڈی کی اشیاء۔ اور لیتھو کی چھپائی کے نمونہ آراستہ کئے گئے تھے۔ اسی کمرہ میں سب سے زیادہ قابل قدر بہت پرانے پرانے قلمی نسخے مذہب اور مطلاً قرآن شریف اور حمائلیں اور دیگر کتابیں، شاہی فرمان، سندیں، اور پروانے موجود تھے۔ اس نادر ذخیرہ میں قرآن شریف، احادیث اور شمائل نبوی صلعم کے متعلق ایسی ایسی قلمی کتابیں بھی شامل تھیں جو شہنشاہ اورنگ زیب اور دیگر نامور بادشاہوں اور بیگمات کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادداشتیں ان کتابوں کے حاشیوں پر موجود ہیں۔ میر شاکر علی مرحوم خوشنویس و منصب دار حضور نظام کے ہاتھ کے لکھے محیر العقول کتبے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ کتبے شیشہ پر یا ریشم پر خط غبار اور خط گلزار میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایک فلسکیپ صفحہ پر تین سو صفحہ کی مکمل تاریخ انگلستان اردو میں مع تصاویر نہایت خوشخط نستعلیق لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک آئینہ پر گلستان کے دو باب نہایت خوشخط بشکل کھجور لکھے ہوئے ہیں اسی میں بعض مشاہیر متاخرین کے قلمی خطوط بھی نمایاں کئے گئے تھے۔ ہندوستان کے بعض موجودہ مصنفین اور مولفین نے اپنی تازہ تصانیف اور تالیف کے غیر مطبوعہ مسودات بھی بھیجے تھے جنکو لوگوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔

(۷) تصدق رسول خان لکچر روم میں تعلیم بالغان کے متعلق نہایت نادر اور کار آمد لٹریچر فراہم کیا گیا تھا۔ ان کتابوں میں بتلایا گیا ہے کہ دیہاتیوں، مزدوروں، اور پیشہ وروں اور شہر میں رہنے والے بڑی عمر کے ناخواندہ لوگوں کو کس طرح تعلیم دیجائے کہ وہ ملک اور سوسائٹی کے حق میں مفید ثابت ہوں اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اسی کمرہ میں یونان، مصر، چین، فارس اور انگلستان کے قدیم تمدن اور رسوم کو ظاہر کرنے والی تصاویر آویزاں تھیں۔ نیز ہندوؤں اور مغلوں کی طرز معاشرت کے مرقع بھی دکھلائے گئے تھے۔ ان تصاویر کی اہمیت کا اندازہ صرف ایک اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ مصری معاشرت کے سلسلہ میں چند تصویریں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ بعد مرگ روح کا وزن کیا جاتا ہے، اور معینہ وزن سے روح کے کم و بیش ہونے پر سزا و جزا کا انحصار تھا۔ تین تصویروں میں ایک مردہ کی روح کا وزن ہونا اور اس متوقع معیار کے مطابق پورا اترنا، اور ہر مردہ کا بہشت میں پہنچنا سب بالتفصیل دکھایا گیا ہے۔ ان تصویروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعد مرگ میزان سے کام پڑنے کا تخیل بہت پرانا ہے۔

(۸) آسمان منزل میں تاریخ اور جغرافیہ اور علم طبقات الارض کے متعلق بیشمار نقشے، خاکے، نمونے اور کتابیں جمع تھیں۔ اس کمرہ میں پروفیسر ابرار حسن صاحب قادری بدایونی کے بنائے ہوئے پانی پت کی معرکہ آرائیوں کے ماڈل اور سانچی ٹوپ (بدھ کے زمانہ کا یادگار گنبد) اور ماسٹر محمد یاسین صاحب کے بنائے ہوئے مختلف براعظموں کے ماڈل نیز ستون اشوکہ کا ماڈل جس پر بزبان ہندی کتبے لکھے ہوئے تھے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر قاضی جلال الدین صاحب کے مرتب کئے ہوئے دس نقشے موسوم بہ نقشہ جات ارض القرآن قابل دید تھے۔ ان نقشوں میں طوفان نوح سے لیکر حضرت رسول خدا صلعم کے زمانہ تک کے ان جملہ مقامات کو دکھایا گیا ہے جہاں جہاں انبیا علیہم السلام پیدا ہوتے یا جہاں جہاں انہوں نے تبلیغ کی۔ ان سب مقامات کو نمودار کیا گیا ہے اور اقوام عاد و ثمود وغیرہ کے ملکوں کا پتہ بتلایا گیا ہے۔

(۹) برکت علی روم میں سقیم الجسم یعنی اندھوں، بہروں، گونگوں، اور فاطر العقل لوگوں کی تعلیم و تربیت کا خاص سامان اور اس مبحث پر نہایت مفید مفید کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور عملی طور پر اس تعلیم کا مشاہدہ کرانے کی غرض سے ایک نہایت ہوشیار نابینا استاد اور اس کے چند نابینا شاگرد کمرے میں موجود تھے اس نابینا استاد کو عقل کا پتلا کہنا چاہئے۔ نہایت دلچسپ طریقہ سے جملہ حاضرین کو اندھوں کے تعلیم دینے کا طریقہ سمجھا دیا تھا۔ وہ ایک لوہے کے قلم سے ہاتھ سے بھی لکھتا تھا۔ اور ایک قسم کے ٹائپ رائیٹر

جیسے آلہ سے بھی کاغذ پر نقوش چھاپا جاتا تھا - اس تحریر کی بنیاد صرف چھا اُبھرے ہوئے نقطے ہیں - ان نقطوں کی مختلف تعداد سے مختلف حروف بنتے ہیں - اور نابینا شاگرد انگلی سے ان اُبھرے ہوئے نقطوں کو چھو کر بے تکلف اسی طرح عبارت پڑھتے ہیں جس طرح آنکھ والے لڑکے پڑھتے ہیں - اسی طرح اندھوں کی تفریح کے لئے خاص قسم کے تاش، گنجفے، شطرنج، چوسر وغیرہ بنے ہوئے ہیں اور مذکورہ بالا اُبھرے ہوئے نقطوں کی مدد سے اندھے یہ سب کھیل نہایت آسانی کے ساتھ کھیل سکتے ہیں - وقت پہچاننے کے لئے اندھوں کے واسطے خاص قسم کی گھڑیاں بھی بنی ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے وہ آسانی سے وقت پہچان لیتے ہیں۔

اسی کمرہ میں لڑکوں اور بچّوں کے پڑھنے کے قابل نہایت عجیب و غریب کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود تھا جن میں سے خود میں نے اور دیگر اصحاب نے بہت سی کتابوں کے پتے ان کے طلب کرنے کی غرض سے وہیں لکھ لئے - جہاں تک مجھے معلوم ہے اس قسم کی کتابیں ہنوز ہمارے ملک میں نہیں پہونچی ہیں - شکسپیر کے بہت پرانے پرانے نسخے موجود تھے اور دیواروں پر انسانی چہروں کی بہت سی تصاویر آویزاں تھیں جن میں مخارج حروف ادا کرنے کی ہیئت دکھلائی گئی ہے -

(۱۰) کالج کے کمرہ بیالوجی میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پروفیسر مسٹر شرما کی کھینچی ہوئی مختلف تاریخی اور صنعتی مناظر کی دلفریب تصاویر آویزاں تھیں - ان تصاویر میں روغنی تصویریں، واٹر کلر، چارکول، پنسل کا کام، برش کا کام اور مجسموں کی شبیہ، غرض فن مصوری کے جملہ اصناف کے نادر نادر نمونے دکھلاتے تھے -

(۱۱) محمود منزل میں کنڈر گارٹن کے گوناگوں سامان اور آلات، طرح طرح کے صنعتی کارخانوں کی مشینوں کے، ریلوے انجنوں کے، موٹروں کے، جہازوں کے، ہوائی جہازوں کے، مختلف قسم کے برقی پریسوں کے، پن چکیوں کے، ہوائی چکیوں کے ماڈل رکھے ہوتے تھے - نیز بذریعہ ماڈلوں کے آبشار اور پہاڑی مناظر بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھلائے گئے تھے -

نمائش میں جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اس کا صحیح اندازہ تحریر کے ذریعہ سے ہونا بہت دشوار ہے - اوپر جو کچھ عرض ہوا وہ محض مشتے نمونہ از خروارے، ایک جزوی خاکہ ہے - امید ہے کہ آئندہ نمائش کا سلسلہ جاری رہے گا - مگر نمائش میں مجموعی حیثیت پیدا کرنے کے بجائے اگر ہر سال اس کا کوئی خاص شعبہ تفصیلی معائنہ اور مطالعہ کے لئے منتخب کر لیا جایا کرے تو زیادہ مفید ہوگا۔

نمائش میں جس قدر سامان دیکھا اس کا بڑا حصہ غالباً ایسا ہی جو آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب انگلستان سے اپنے ہمراہ لائے ہیں - ایسا بھی مستعار سامان تھا جس کے مالک درخواست ہونے پر قوم کی تعلیمی اغراض کا لحاظ کر کے کانفرنس یا یونیورسٹی کو ہمیشہ کے لئے یا ایک معینہ میعاد کے لئے دے سکتے ہیں - کاش اگر ایسا سامان مستقل طور پر کانفرنس یا یونیورسٹی کے کمروں میں رکھ دیا جائے اور اس کی مکمل فہرست شائع کر دی جائے تو نہ صرف یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج کے طلبا - اور دیگر زیر تعلیم نوجوانوں کو بلکہ دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا کو بھی اس تعلیمی ذخیرہ سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہنے کا موقع ملے گا - اور اسی طرح رفتہ رفتہ علمی ریسرچ کا علیگڈھ مرکز بن جائے گا۔

(ب)

نمائش کا علمی حصہ

(نوشتہ مولوی محمد اکرام اللہ خانصاحب ندوی۔ سلطان جہاں منزل علیگڈھ)

نادر الوجود قلمی کتابیں، فرامین شاہی، قدیم تحریرات وکتبات

گزشتہ دسمبر ۱۹۲۲ء کے آخری ہفتہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس علی گڈھ میں منعقد ہوا، جس کا سلسلہ چھ روز تک جاری رہا، اس اجلاس کی نمایاں خصوصیت تعلیمی نمائش تھی جو اپنی نوعیت، اور فراہم شدہ اشیاء کی ندرت اور تنوع کے لحاظ سے قابل دید چیز تھی، جدید تعلیمی آلات، نقشہ جات، تصاویر اور قدیم وجدید کتابوں کا کافی ذخیرہ نمائش کے کمروں میں موجود تھا، انگلستان اور جرمنی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصص سے بکثرت چیزیں فراہم کی گئی تھیں، خصوصاً تاریخ، جغرافیہ، علم ہیئت وغیرہ کے متعلق کافی ذخیرہ موجود تھا، زنانہ دست کاری کے خوش نما نمونے بھی جا بجا نظر آتے تھے، ہندوستان کے مختلف اسکولوں کے طلبا کا کام بھی قابل تعریف تھا بعض پر انعامات بھی دیے گئے، غرض یہ تعلیمی نمائش، نہایت مفید دلچسپ اور سبق آموز تھی

نمائش کا ایک شعبہ نادر الوجود قلمی کتب، فرامین شاہی، اور قدیم کتبات کے لئے مخصوص تھا، اس شعبہ کا سامان فراہم کرنے کے لئے نہایت تنگ وقت میں کوشش کی گئی تھی، تاہم اس قدر ذخیرہ فراہم ہو گیا کہ جس کے رکھنے کے لئے بمشکل جگہ نکل سکی۔ یہاں تک کہ نمائش کے افتتاح کے بعد بھی قلمی کتابوں وغیرہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

ہم اس موقع پر صرف اسی ایک شعبہ کے مختصر حالات عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اس شعبہ سے ایک بڑا کام یہ لیا جا سکتا تھا کہ نادر الوجود قلمی کتب، اور فرامین شاہی کے متعلق مفصل نوٹ لکھے جاتے جن میں ان کتب و فرامین کی خصوصیات اور وجہ ندرت کا خاص طور پر ذکر ہوتا، خاص خاص فرامین کا جن سے اس عہد کے کسی خاص واقعہ یا تمدن پر روشنی پڑتی ہے، عکس لے لیا جاتا، تاکہ مصنفین وارباب ذوق تحقیق فائدہ اٹھاتے، لیکن یہ اُس وقت ممکن تھا جبکہ ہر کتاب اور فرمان یا تحریر کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جاتا مگر وقت ناکافی تھا اور پہلا موقع تھا، اس لئے جو کچھ ہو گیا وہ بھی اُمید سے زیادہ تھا۔

تقریباً دو سو شاہی فرامین، اور کتبات اور تخمیناً ڈھائی سو قلمی کتابیں نمائش کے کمرہ میں جمع تھیں، فرامین شاہی کا ذخیرہ غالباً اُس کی برابر کسی اسلامی کتبخانہ میں نہیں ہے، مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر و منیجر

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو فرامین شاہی، قدیم کتبات، اور قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق ہے، اُنھوں نے سالہا سال کی سعی و محنت اور تلاش و جستجو سے سینکڑوں شاہی فرامین اور مختلف قسم کی قدیم دستاویزیں اور تحریریں نیز ایک بڑا ذخیرہ عزیز الوجود قلمی کتابوں کا ہائی اسکول کی لائبریری کے لئے جمع کیا ہے، یہ ذخیرہ اس قابل ہے کہ اہل ذوق اگر اس کے دیکھنے کے لیے سفر کریں تو بالکل بجا ہے۔

اڈیٹر صاحب ممدوح نے اپنے خاص تعلقات کی بنا پر اس قیمتی ذخیرہ کا بہترین حصہ کانفرنس کی تعلیمی نمائش کے لئے علی گڑھ بھیجدیا تھا، اس ذخیرہ میں اکثر چیزیں ایسی نادر و نایاب تھیں کہ جو دیکھتا تھا تعجب کرتا تھا، متعدد فرامین اور مختلف قسم کے کاغذات شہنشاہ اکبر کے عہد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ تک سلسلہ وار موجود تھے، مثلاً فرامین متعلق بہ عطائے التمغہ واراضی یا مدد معاش، یا عطائے سند متعلق منصب قضا یا دوسرے کاغذات مثلاً وقف نامہ، اجارہ نامہ، کابین نامہ، معافی نامہ، پروانہ تقرری، بیعت نامہ، پروانہ راہداری، تحقیقات یا فیصلہ مقدمات وغیرہ۔

ان چیزوں کے علاوہ مختلف قطعات و کتبات بھی تھے، منجملہ اُن کے ایک انگریز میجر جان جیکب کا خط تھا جو اُس نے اپنے ہاتھ سے نہایت پاکیزہ خط نسخ میں کسی مغلیہ شاہزادے کے نام لکھا تھا، غرض مختلف قسم کی ۳۰۸ تحریریں اور فرامین تھے جو اٹاوہ سے آئے تھے۔

کاغذات و فرامین کے علاوہ قلمی کتابیں تھیں، جن کی تعداد ۸۰ تھی، بعض مطبوعہ کتابیں بھی تھیں جو اب بالکل نایاب ہیں، اور مولوی بشیرالدین صاحب نے ان کو بڑی تلاش کے بعد پرائیویٹ کتب خانوں سے جمع کیا ہے، زبان کے اعتبار سے زیادہ تر کتابیں فارسی کی تھیں جو ادب اور متعلقات ادب، اور تاریخ، تصوف، اور اخلاق پر مشتمل تھیں، اُردو کی بھی کچھ کتابیں تھیں جو زیادہ تر افسانہ اور نظم سے تعلق رکھتی تھیں، ان کتابوں سے اردو کے ابتدائی دور کی خصوصیات اور طرز تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربی کی متداول کتابیں بھی نمائش میں موجود تھیں جن کی نمایاں خصوصیت قدامت اور حسن کتابت تھی۔

اٹاوہ کے علاوہ حبیب گنج کے کتب خانہ سے چند نادرالوجود کتابیں اور دوسری چیزیں آئی تھیں، نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کا ذوق علمی محتاج بیان نہیں، ممدوح کا ذاتی کتب خانہ علمی زر و جواہر سے مالا مال ہے چنانچہ اس گنج گرانمایہ کا ایک حصہ ارباب ذوق کی نظر افروزی کے لئے تعلیمی نمائش میں موجود تھا، کتابوں کے علاوہ مشاہیر اہل قلم کے قطعات اور بعض دوسری چیزیں مثلاً عہد شاہجہانی کا اصطرلاب اور شمس الامراء نواب امیر کبیر کا آلہ ساعت نما بھی تھا جس پر ہر شخص کی نظر پڑتی تھی، ایک مرقع تصاویر و کتبات کا تھا جو آپ اپنا نظیر تھا۔

چند کتابیں جناب نواب صاحب گنج پورہ کے یہاں سے آئی تھیں، جن میں ایک مصور شاہنامہ اور مثنوی مولانا روم کا خوش خط نسخہ خاص طور پر قابل دید تھا، چند قلمی کتابیں منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اپنے کتاب خانہ سے بھیجی تھیں، کچھ کتابیں اور ایک کتبہ سید احسن شاہ صاحب تحصیلدار علی گڈھ نے عنایت فرمایا تھا آٹھ اعلی درجہ کے کتبات حافظ شرافت اللہ صاحب (علی گڈھ) کے یہاں سے آئے تھے۔ جو مشاہیر فن کے ہات کے لکھے ہوئے تھے، کچھ کتابیں اور نادر چیزیں میر وقار حسین صاحب لائے تھے، جن کے دیکھنے کے لئے نمائش گاہ میں ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ غرض نمائش کا یہ شعبہ بہمہ وجوہ نہایت دلچسپ وکامیاب رہا۔

اس شعبہ کی تمام چیزوں پر تبصرہ کرنا مشکل ہے، البتہ بالاجمال ایک مختصر تبصرہ ناموزوں نہ ہوگا جو حسب ذیل ہے۔

عربی ارباب ذوق کی روحانی لذت وسرور کے لئے متعدد مطبوعہ اور قلمی قرآن مجید نمائش گاہ کی عزت کا باعث تھے، جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز تھا مثلاً ایک مطلا ومذہب قرآن مجید جو اٹاوہ سے آیا تھا، حسن کتابت اور سنہری کام کی لطافت کے لحاظ سے بے نظیر تھا، سیاہی کی آب وتاب اور طلائی نقش ونگار کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ افسوس ہے کہ اس قرآن مجید کے کاتب اور سنہ کتابت کا حال معلوم نہ ہوسکا، قرآن مجید نہایت خوبی سے کاغذ کی ایک پٹی پر لکھا ہوا تھا جس کا طول ساڑھے چار گز اور عرض ایک گرہ سے زیادہ نہ تھا، خط اگرچہ خفی تھا تاہم بخوبی پڑھنے میں آتا تھا، ایک حمائل شریف کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی تھی کہ وہ شہنشاہ اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی تلاوت میں رہ چکی ہے، متعدد قرآن مجید خط نسخ کا ابتدائی نمونہ تھے، کاغذ سے قدامت کا پتہ چلتا تھا لیکن اُن پر سنہ کتابت موجود نہ تھا، جن کے سنہ کتابت کا پتہ چل سکا ان میں کوئی نویں صدی ہجری سے پہلے کا نہ تھا، حدیث کے سلسلہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مشکوٰۃ شریف کے قلمی نسخے قابل دید تھے۔

موخر الذکر کتاب پر جو اٹاوہ سے آئی تھی یہ لکھا تھا کہ یہ کتاب شہنشاہ اورنگ زیب کے زیر مطالعہ رہ چکی ہے، اور بادشاہ ممدوح کے ہات کے حواشی کتاب پر موجود ہیں لیکن سرسری تلاش میں یہ حواشی ہماری نظر سے نہیں گزرے، ایک عمدہ نسخہ شمائل ترمذی کا بھی تھا جو افراسیاب خاں نے شاہنشاہ اورنگ زیب کو نذر دیا تھا؛ بخاری شریف کا ایک پرانا نسخہ ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار کے یہاں سے بھی آیا تھا جس پر "ایک مالک کتاب" نے سنہ خرید ۱۰۴۲ھ لکھا تھا کتابت یقیناً اس سے بھی پہلے کی ہوگی۔

فارسی فارسی میں تصوف، اخلاق، دواوین، اور مثنویات کا حصہ زیادہ تھا حبیب گنج کے کتاب خانہ میں یہ ذخیرہ

نہایت وافر ہے، مولوی بشیر الدین صاحب نے بھی سالہا سال کی تلاش سے بہت کچھ جمع کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو نادر کتابیں نمائش گاہ میں موجود تھیں ان کا اکثر حصّہ انہی دو کتب خانوں سے آیا تھا۔

اجمالاً چند کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) شاہنامہ نوشتہ میر علی مشہدی سنہ ۹۹۵ھ

(۲) ہفت پیکر نظامی گنجوی نوشتہ سنہ ۱۰۲۰ھ

(۳) خمسہ حضرت امیر خسرو سنہ ۱۰۵۲ھ

(۴) قرآن السعدین سنہ ۱۰۱۰ھ

(۵) رقعات عالمگیری نوشتہ سنہ ۱۱۰۲ھ

(۶) ساقی نامہ ظہوری نوشتہ سنہ ۱۰۶۲ھ

(۷) ہفت نظر ہاتفی سنہ ۱۲۲۲ھ

(۸) دیوان خواجہ آصفی سنہ ۹۴۵ھ

(۹) مثنوی مولانا روم سنہ ۱۰۴۰ھ

(۱۰) قصائد حسین ثنائی سنہ ۱۱۵۶ھ

(۱۱) قطعات و مخمسات و رباعیات فیضی نوشتہ سنہ ۹۹۵ھ

(۱۲) کلیات جامی سنہ ۱۰۷۱ھ

(۱۳) دیوان مرزا مظہر جانجاناں سنہ ۱۱۸۳ھ

اس دیوان کا خط نہایت عمدہ ہے چند سطریں مصنف کے ہات کی لکھی ہوئی بھی ہیں۔

(۱۴) مثنوی ناصر علی نوشتہ سنہ ۱۱۰۵ھ

(۱۵) کریما نوشتہ میر پنجہ کش سنہ ۱۲۶۰ھ مطلا و مذہب قابل دید،

(۱۶) دیوان حافظ نوشتہ سنہ ۱۰۹۶ھ (ایک نسخہ سنہ ۱۰۳۰ھ کا بھی تھا)

(۱۷) سبحۃ الابرار نوشتہ سنہ ۹۴۶ھ

(۱۸) گوے چوگان نوشتہ میر علی کاتب در عہد بابر سنہ ۹۳۶ھ
حبیب گنج کے کتب خانہ سے آئی تھی،

(۱۹) نفحات الانس نوشتہ سنہ ۱۰۸۹ھ (اس کے علاوہ نفحات کا ایک اور نسخہ سنہ ۱۰۲۱ھ میں تھا)

(۲۰) نفحات الانس دستخطی مصنف (ملا جامی) نوشتہ سنہ ۸۸۳ھ

یہ گوہر بے بہا حبیب گنج کے کتاب خانہ سے آیا تھا،

(۲۱) سیر اکبر ترجمہ اپنشد دارا شکوہ ۱۱۴۱ھ

(۲۲) شمس المعارف صغری شرح اکابر اطراف ۱۰۹۷ھ

(۲۳) تاریخ قطب شاہی نوشتہ نواب سر سالار جنگ کے کتب خانہ سے آئی تھی۔

(۲۴) عظمی خاں آرزو

(۲۵) تذکرہ میر یعنی میر تقی میر کی خود نوشت سوانح عمری

جو اب تک طبع نہیں ہوئی، اٹاوہ سے آئی تھی قابل دید چیز ہے۔

اردو اردو کی قلمی کتابوں کے علاوہ متعدد مطبوعہ کتابیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ کی تھیں جو اب بالکل نایاب ہیں، قلت گنجایش کی وجہ سے ہم اُن کی تفصیل نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ صرف دو کتابوں کا تذکرہ کریں گے۔

(۱) انتخاب الاخوین، یہ کتاب ایک قانونی کتاب ہے جو سر سید مرحوم اور ان کے برادر اکبر نے ۱۸۴۱ء میں لکھ کر طبع کرائی۔

(۲) قواعد اردو یہ غالباً سر سید مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو اب تک نہیں چھپی سنہ تالیف ۱۸۴۱ء ہے، مولوی بشیر الدین صاحب کے ذوق و تلاش کی بدولت ہاتھ آئی ہے۔

اردو کتابوں کے سلسلہ میں مصنفین کے دست قلم کے چند مسودے بھی تھے، الفاروق اور البرامکہ کے مسودوں کو لوگ بڑے شوق سے دیکھتے تھے، البرامکہ کے اصلی مسودہ پر مولانا شبلی مرحوم کی اصلاحیں اور حاشیے جا بجا موجود تھیں،

نمائش کے علمی شعبہ کا یہ نہایت مختصر خاکہ ہے جو ہم نے پیش کیا، لیکن یہ سب چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں، الفاظ کے مساعدت سے صحیح کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی

محمد اکرام اللہ خاں ندوی

لیکچر نمبر ۱

تعلیمی اعتبار سے ابتدائی ریاضیات کی قدر و قیمت

از

مسٹر عبد المجید قریشی ایم اے ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تعلیم اور اس کا مقصد زندگی نام ہے ضروریات ذاتی کا اور انھیں ضروریات کی توسیع اور تکمیل کا وسیلہ محض تعلیم ہی۔ اب رہا یہ امر کہ ان ضروریات کی نوعیت کیا ہی اور ان کی توسیع اور تکمیل کس حد تک جائز ہی۔ یا ان کے جواز یا عدم جواز میں اخلاقی یا نفسیاتی اصول کہاں تک ہماری رفاقت ادا کرتے ہیں ایسے مسائل مہمہ ہیں جن پر بحث کرنا نفس مضمون کے اعتبار سے غیر متعلق ہوگا۔ میں اس وقت صرف مفہوم تعلیم کے متعلق کچھ خیالات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے آپ کم از کم یہ اندازہ لگا سکیں گے بلکہ نفس تعلیم کو مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں کس طور پر عملی جامہ پہنایا اور یہ بھی گو نفس مضمون سے انحراف ہوگا لیکن اس کو میں ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ جب کسی مضمون نصابی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہو تو خود مفہوم تعلیم سے آگاہی حاصل کرنا لابد ہے۔ ایک حد تک تو یہ کہا جا سکتا ہی کہ تعلیم فی الحقیقت عین فطرت ہے اور یہ دونوں نظریات ایک مستقل اور تفصیلی بحث کے محتاج ہیں اور ان میں موشگافیوں کی بے حد گنجائش ہی۔ اس لیے بنظر سہولت میں صرف یہ عرض کرونگا کہ اس وقت ہمیں تعلیم کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے یا جس پر مدت الایام سے ہم کاربند رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر تعلیم عبارت ہی ان ذرائع اور وسائل سے جن کے تصرف سے انسان اپنی ضروریات کے اعتبار سے حادثات اور موجودات فطرت پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہی یہاں پر ایک مسئلہ تشنۂ وضاحت

رہجاتا ہے جس کی اگر تشریح نہیں تو تصریح کر دینی ضروری ہے مسئلہ یہ ہے کہ آیا انسان جزو فطرت ہے یا انسان اور فطرت دو فریق ہیں۔ اس میں شک نہیں یہ دونوں حیثیات ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہیں۔ انسان جزو فطرت بھی رہ سکتا ہے اور فریق فطرت بھی۔ لیکن یہاں نفس تعلیم پر بحث کرنے کے لیے بنظر سہولت ہم کو یہ فرض کرلینا پڑیگا کہ فی الحقیقت انسان کو اپنے مقصد حیات کی تکمیل کے لیئے فطرت کے بے پایاں خزائن تفویض کیے گئے ہیں اور اسے ان استعدادات اور قابلیتوں پر قدرت دیدی گئی ہے جن کے تصرف سے وہ عطیات فطرت سے بہرہ اندوز ہوسکتا ہے۔

حضرات۔ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں مختلف طور پر محسوس کی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں مطلق پس وپیش نہیں ہے کہ ان مخصوص حالتوں میں جن مختلف نظریات پر حامیان یا مصلحان تعلیم کاربند رہے ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا مثال کے طور پر میں چند اُن نظریات کو آپ کے سامنے پیش کرونگا جن پر لوگ وقتاً فوقتاً عمل پیرا ہوتے رہے ہیں۔ بعض قوموں نے اپنے اوائل عروج میں محض ان معلومات پر دقوف حاصل کرلینا یا ان ذرائع اور رسائل پر دسترس حاصل کرلینے کا نام تعلیم رکھا جو روزانہ ضروریا زندگی کے لیے ناگزیر تھیں۔ ترقی یافتہ قوموں میں کہیں تو علمی تحقیقات اور اکتشافات سے قومی خدمت کا نام تعلیم ہوا۔ کہیں اس کا مقصد عین اچھے شہری پیدا کرنا ہوا کچھ اور ترقی کی تو یہ قرار دیا کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ تعلیم یافتہ اشخاص میں ایسے قوے پیدا کردیے جائیں جو غیر تعلیم یافتہ اشخاص میں نہ ہوں بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان میں ایسے عادات اور رجحانات پیدا کردیے جائیں جس سے اس کی قوائے فطری میں انشراح وانبساط اور خود اس میں وسعت نظر پیدا ہوجائے اور کہیں روح کو حسیات لطیف سے آشنا کرانے کا نام تعلیم ہوا۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ تعلیم علم حاصل کرلینے کا نام نہیں ہے بلکہ قوائے دماغیہ کی تربیت کا نام تعلیم ہے۔ رسکن کا خیال ہے کہ کسی شخص کو وہ چیز بتا دینا جس کو وہ نہ جانتا ہو تعلیم نہیں بلکہ اس کو وہ بنا دینا جو وہ پہلے نہ تھا تعلیم ہے۔ کوئی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد معرفت نفس بتلاتا ہے نہ کہ جلب منفعت۔ کسی کا یہ خیال ہے کہ علم تعلیم کے علاوہ باقی جتنے علوم ہیں وہ صرف کائنات کی حقیقت جیسی کہ وہ ہے بیان کرتے ہیں اور ان قوانین کو مرتب کرتے ہیں جو اس میں جاری وساری ہیں لیکن تعلیم اس علم کا نام ہے جو دنیا کو ترقی دیکر اس درجہ تک پہونچانا چاہتا ہے جہاں تک اس کی ترقی ممکن ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ جسم دماغ اور روح کو ترقی دینا اور سب کو درجہ کمال پر پہونچانا تعلیم کا کام ہے۔ کچھ ایسے مردمیدان بھی ہیں جن کی علم برداری صرف فرسودہ لکیروں کے پیٹنے تک محدود ہے کچھ غلامانہ شان قائم رکھنے کے لیے تعلیم کو محض ذریعہ معاش سمجھتے ہیں غرض یہ کہ تعلیم ممکن ہے کہ ایک بیداری رہی ہو۔ "اب تو کثرتِ تعبیر" نے اسے محض ایک "خوابِ پریشان" کی حیثیت دے رکھی ہے۔

حضرات ۔ زمانہ حال میں ایک مدت تک تعلیم کی نوعیت ایک خاص رجحان پر مبنی رہی ہے ۔ اور اس امر کی کوشش کی گئی کہ علم اور عقل سے محض دولت کمانے کا کام لیا جائے۔ صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنے کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تعلیم کا یہی مقصد عین قرار دے دینا ناروا بھی ہے اور خطرناک بھی ۔ دشکل یہ ہے کہ علم ہو یا جہالت ۔ نور ہو یا ظلمت اخلاقیات کے حدود سے ہم کسی طور پر قدم باہر نہیں نکال سکتے۔ ہر انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اس نے دنیا کے سرمایہ راحت و کامرانی میں کتنا اضافہ کیا ۔ اس حقیقت کو متعین کر لینا اور اسے بر سرِ کار لانا تعلیم کا مقصدِ کل ہے) بہر حال اب یہ فرض کر لینا کہ مندرجہ بالا قواعد محض اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب تعلیم کا مقصد ہی کلیتاً بدل دیا جائے صحیح نہیں ہے۔ ہم کو تعلیم اور مقصد تعلیم میں امتیاز رکھنا پڑیگا ۔ صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنا تعلیم ہے لیکن اسے اس طور پر حاصل کرنا یا اس لیے حاصل کرنا کہ اس سے بعض لوگوں کو اتنا ہی فائدہ پہنچے جتنا دوسروں کو نقصان، اخلاقیات اور مذہب دونوں کے خلاف ہے ۔

خود یورپ ایک عرصہ کے بعد اپنی غلطی محسوس کر رہا ہے ۔ جنگ عظیم کے بعد سے وہ اپنے مقاصد تعلیم پر نظر ثانی کر رہا ہے اس میں شک نہیں کہ یورپ میں جو تعلیم اب تک مقبول انام رہی ہے اس کا ایک روشن پہلو بھی ہے اس نے ایک طبقہ ایسا بھی پیدا کر دیا ہے جن کا ذہن و دماغ کلیتاً کاروباری ہے اور اس سے یورپ کے تجارتی افتادِ طبع کو کافی تقویت پہنچی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ اس نے سنگدلی اور ایک حد تک ناخدا ترسی بھی پیدا کر دی ہے اور حیاتِ لطیف کو فنا کر دیا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ جو تعلیم ذاتی اور مادی فوائد کو پیشِ نظر رکھتی ہے اس کا لازمی نتیجہ بد دلی اور بے اطمینانی ہے کیونکہ محض دولت طمانیت خاطر کا باعث نہیں ہو سکتی ۔ اور خود غرضی کا نتیجہ صریح اضطراب اور بد دلی ہے حقیقی تعلیم روحانی تعلیم ہے ۔ آپ لفظ روحانی سے گھبرائیں نہیں آپ مطمئن رہیں ۔ میرا مقصد کسی خاص عقیدے کی تلقین نہیں ہے۔ روحانی سے میرا مقصد صرف اس تعلیم سے ہے جس پر Mission رسالت انسانی کا دارومدار ہے یعنی وہ تعلیم جو ہر انسان کو خواہ وہ کسی حالت میں ہو ایک ہی شیرازے میں منسلک رکھے ۔ یعنی محبت اور موانست ۔

حضرات ۔ یورپ مادی تعلیم کے خطرناک اثرات سے آشنا ہو چکا ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ ملک و قوم کے لیے بھی وہی لوگ زیادہ مفید ہو سکتے ہیں جن کی تعلیم ہر پہلو سے مکمل رہی ہے ۔ یورپ نے دیکھ لیا کہ وہ سنگدل اور سفاک کارخانہ دار جن کی تعلیم و تربیت کماحقہ نہیں ہوئی ہے ترقی پا کر صرف حرص و آز کے بندے ہو جاتے ہیں اور محض جلب منفعت اپنا مقصد حیات قرار دے دیتے ہیں اور وہ کاریگر جو کسی خاص شعبے میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں وہی ہڑتالیں کرتے ہیں اور اپنے ذاتی نفع کی بنا پر جماعت بندی کر کے قوم و ملت،

کے فوائد کو قربان کر دیتے ہیں۔ یورپ نے محسوس کر لیا ہے کہ اب ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو صنعت و حرفت کی آشوب زائیوں کا ازالہ کر سکے۔ تعلیم کا سب سے بڑا وسیلہ ہمارے تجربات اور مشاہدے ہیں۔ یورپ نے اپنی ضروریات کو تشخیص کر لینے کے بعد جس طریقہ تعلیم کو اختیار کیا تھا اور اس کے تلخ تجربات سے آشنا ہونے کے بعد اس نے جس طریقہ کار پر عمل درآمد کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اس کا اقتضا ہے کہ ہم بھی اپنی ضروریات اور زمانے کے مطالبات کا جائزہ لیں اور اپنی علمی جدوجہد کو ایسے راستے پر ڈالدیں جو ہماری افرادی اور قومی نجات کا رہنما ہو۔

ان ضروریات اور مصالح کے اعتبار سے ہر نسل اپنی آئندہ نسل کے سامنے اس بات کی ذمہ دار قرار دیجائے گی کہ اس نے اپنے جانشینوں کے لیے علم و عمل کا کیا اور کیسا ترکہ چھوڑا۔ اس کے لیے عمیق غور و خوض استقلال۔ اعتماد علی النفس۔ ایثار۔ رواداری اور انتہائی فہم و فراست کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم کو اس راستے میں چند در چند دقتوں اور بابوسیوں کا سامنا کرنا پڑیگا ممکن ہے ایک نامعلوم عرصہ تک اس کے مرئی نتائج ہماری نظروں سے مستور رہیں۔ لیکن محنت اور محبت کا شجر کبھی بے ثمر نہیں رہتا۔ ہماری قربانیاں ہماری آئندہ نسلوں کی افتادِ ذہنی اور رجحانات دماغی کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ عقلی اور ذہنی انقلابات جلد رونما نہیں ہوتے پھر ہم کو کبھی یہ خیال دل میں نہیں لانا چاہیے کہ ہمارے ہر خلوص اور ہر قربانی کا کوئی معاوضہ فوراً ہونا چاہیے۔ ہر نیک کام بجائے خود ایک معاوضہ ہے اور ایک ایسا معاوضہ جس کے لیے ہم کو کسی کا احسان مند نہیں بننا پڑتا۔

حضرات۔ میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اسے خواہ آپ تمہید تصور کریں خواہ نفس مضمون سے ایک طویل انحراف۔ میں جو کچھ اب عرض کرنے والا ہوں اس کے لیے یہ ضروری تھا لہ میں آپ کو تعلیم کے چند عقائد اساسی سے آشنا کر دیتا۔ ہم کو اب یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائی ریاضی کی تعلیم گر صحیح طور پر دیجائے تو وہ تعلیم کے صحیح مفہوم یعنی دماغی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے کہاں تک مفید ابت ہو سکتی ہے۔ موجودہ طریقہ تعلیم جس کی رو سے استاد انسپکٹروں کے خوف اور ممتحنین کی ستم ظریفیوں سے بچوں کو محض چند باتیں بسا اوقات ازبر و رباز و رٹوا دیتے ہیں نہ صرف اصول نفسیات کے خلاف ہی بلکہ ود دماغی ترقی اور روحانی نمو کے لیے سخت مضرت ناک ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھا ہے کہ خود استاد کا مبلغ علم ھی صرف اسی علم سینہ پر مشتمل ہوتا ہے جو استاد الاساتذہ نے کبھی تلقین کیے تھے اور جن ملفوظات کو اب ہ بچوں کے ذہن و دماغ میں بھر دینا چاہتا ہے۔ معصوم بچوں کی قوت حافظہ اور اپنی تہی مائیگی کا سب سے یادہ ناجائز فائدہ وہ استاد اٹھاتا ہے جو اپنے طلبا کو رٹ لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ بتب کرٹین کا مقولہ

ہے کہ حافظہ ہمارے دماغی قوتوں میں سب سے زیادہ فضول چیز ہے۔ اگر اس مقولے کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر موجودہ اُستادوں کے طریقہ تعلیم میں اگر کوئی پسندیدہ چیز نظر آسکتی ہے تو یہ کہ اس سے ایک سب سے زیادہ مہمل قوت کی ترقی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ استاد اور طالبِ علم دونوں تمام عمر ایک ہی محور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ "تیلی کے بیل" کی شانِ نزول یہی ہو!

حضرات ۔ علمِ ریاضی کو زمانہ قدیم سے ابتدائی آزاد تعلیم کا جزوِ عین قرار دیا گیا ہے اگر افلاطون نے اپنے گھر کے دروازے پر یہ کتبہ آویزاں کر دیا تھا کہ وہ شخص جو علم ہندسہ سے ناآشنا ہو یہاں باریاب نہیں ہو سکتا تو اب بھی تمام عالم کی یونیورسٹیوں کے دروازے اس شخص پر بند ہیں جو ابتدائی ریاضی میں کامیاب نہ ہو سکا ہو لیکن جن وجوہ کی بنا پر اس مضمون کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا تھا وہ ایک بڑی حد تک نظر انداز کر دیے گئے ہیں اور مرورِ ایام نے اصل حقیقت پر بر خود غلط منسوخ ماہیوں اور تنگ زاویوں کا ایک گہرا نقاب ڈال دیا ہے جس کا برافگندہ ہونا بے حد دشوار ہے۔ اب اگر کوئی سوال کرتا ہے کہ ریاضی کی تعلیم کیوں لازمی قرار دی جاتی ہے تو جواب دیا جاتا ہے کہ مشینوں کی ساخت عمارتوں کی تعمیر۔ پلوں کے بنانے۔ ریلوں کے بچھانے۔ تجارتی اور ملکی فتوحات حاصل کرنے۔ ہوا میں پرواز کرنے کے لیے اس کی تعلیم ضروری ہے۔ لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ اول تو یہ چیزیں کچھ بجائے خود بہت گراں بہا نہیں ہیں دوسرے یہ کہ ان فوائد کے حصول میں ریاضی کی محض ابتدائی تعلیم تو کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی ان چیزوں کے لیے تو ریاضی کی انتہائی اور مکمل ترین تعلیم لازمی ہے پھر ہر ایک کو اس کا پابند بنانے سے حاصل؟ تعلیمی نصاب کا لازمی جز تو ان مضامین کو قرار دینا چاہیے جو مکمل انسان بنانے میں معین اور ممد ہوتے ہیں۔ اس دلیل کو ناکام پاکر یہ حقیقت پیش کی جاتی ہے کہ ریاضی انسان کے ذہن و دماغ کو مرتب کرتی ہے اور استعداد قبولیت پیدا کرتی ہے لیکن پھر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ریاضی کی تعلیم جس طور پر آج کل دی جاتی ہے اس سے دماغی ترقی صریحاً ناممکن ہے۔

حضرات ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ریاضی فی الحقیقت "تناسب" کا دوسرا نام ہے حُسن اور زیبائی عبارت ہے اس تناسب تامہ سے جو عالمِ خیال اور عالمِ محسوسات دونوں میں مشترک ہے۔ ہر وہ چیز جو حسین ہے فطرت کے احساس تناسب کی مظہر عین ہے۔ اس کلیہ کے ماتحت ریاضی کا رتبہ خود فنون لطیفہ سے بھی بلند ہے مصوری۔ مجسمہ سازی۔ موسیقی وغیرہ ہمارے لیے صرف "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ تناسب تامہ جس پر حسن معنوی یعنی سعادت اور صداقت یا نکوئی اور پاکی کا مدار ہے جو کلیدِ معرفت اور صحیفۂ عرفاں ہے اور جو عین مقصد حیاتِ انسانی ہے کچھ اور ہی چیز ہے۔

فنونِ لطیفہ فی الحقیقت ہماری ان رقیق حسّیات کو متہیج کرتے ہیں۔ ہماری خلقت میں فطرت نے مضمر رکھے ہیں۔ اور جن کو لبا اوقات ہم انسانی کمزوریوں سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ریاضی ہماری رہبری عرفان اور معرفت کے اس بے پایاں عمق کی طرف کرتی ہے جہاں پہنچکر ہم بالکل از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ ہماری روح اپنی اصل سے ہم آویز ہونے کے لیے مضطرب ہونے لگتی ہی اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں ان حقائق کو جو ہمارے محدود عقل اور فکر دونوں سے بالاتر ہیں۔ یہ ریاضی سمجھ لینے یا یاد کر لینے کی چیز نہیں۔ بلکہ خود حیات انسانی کا جزو بن جانے کی اور محبت کرنے کی چیز ہے۔

حضرات۔ نوجوانوں کی تعلیم میں اب تک جس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے یا جس کے لیے کوشش کی گئی ہے وہ یہ تھا کہ انکو آرٹ یا ادب کی حسن آفرینیوں سے آشنا کر دیا جائے لیکن جس چیز سے وہ اب تک بے بہرہ رکھے گئے ہیں وہ فہم و فراست کا نگارخانہ ہے جہاں صرف ذہن دماغ کو شرف باریابی حاصل ہو سکتا تھا اور جسے یونان کے عہد قدیم سے اب تک ہر مسلک اور عقیدہ کے لوگ تکمیل حیات انسانی کی شرط اولین قرار دیتے آئے ہیں ذہن و دماغ کی "جنت نظر" اب تک پوشیدہ رکھی گئی ہے اور یہ ایک سنگین فروگذاشت ہی جس کی تلافی ہر نوع ضروری ہے۔ ذہن و فکر کے وہ پائدار حصن حصین جن کی بنیاد ریاضیات کے "بنیان مرصوص" پر رکھی گئی ہے آرٹ اور ادب کے اس قصر خیالی سے کہیں استوار اور محکم ہیں جن کی اساس محض جذبات پر ہو۔ اتحاد فکر اور احساس حسن صرف ریاضی ہی کا رہین منت ہو سکتا ہے۔ وہ مذہبی عقائد اور اخلاقی فضائل کی معین ہوتی ہے اور ہم کو فضل و کمال کے بلند ترین مدارج پر فائز کر دیتی ہی۔

علمائے اسلام نے ریاضیات کو الٰہیات اور طبعیات کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے اور علوم نظریہ کو جن کا رکن رکین ریاضیات ہیں علم الٰہیات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک بہت بڑا رہنما تسلیم کیا ہے مولانا صدرالدین مصنّف صدرہ نے اس کو حکمتہ الوسطیٰ کا نام دیا ہے اور خود لفظ ریاضی اس امر کا شاہد ہے کہ ریاضت عقل و فکر کا یہ ایک بہت بڑا آلہ ہے۔

جیومٹیری یا علم ہندسہ "یہ ایک دیرینہ مقولہ ہے کہ علم ہندسہ بہترین منطق ہے"۔ یہ حقیقت ہر نوع تسلیم کرنی پڑے گی کہ جب تعریفات واضح ہوتی ہیں جب اصول موضوعہ ناقابل انکار ہوتے ہیں یا مسلمات ناقابل انحراف اور جب اشکال کے تقابل اور تخیل سے ان کے ان خواص کا استنباط کیا جاتا ہے جو دائماً نتائج کے ایک مربوط سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں اور دوسری طرف نتیجہ یا مقصود پیش نظر ہوتا ہے اور اس پر توجہ پورے طور پر قائم رہتی ہے اس وقت انسان میں بے کم و کاست باقاعدہ اور نہایت مربوط اور عمیق دلائل اور براہین کو بر سر کار لانے کی عادت پڑجاتی ہے جو انجام کار ذہن میں جودت اور صلابت

پیدا کرتی ہے اور جب کبھی یہ عادت دوسرے موضوع کی طرف منتقل کی جاتی ہے اس وقت تلاش حق و معرفت میں بے حد مفید اور سودمند ہوتی ہے۔"

افلاطون کا مقولہ ہے "خدا ہندسی کرتا ہے"

سسبر وایک جگہ پر لکھتا ہے "یونانیوں کے نزدیک علم ہندسہ سب سے زیادہ قابلِ احترام چیز تھی اس سے زیادہ رتبہ کسی اور علم کو حاصل نہ تھا لیکن اس کے افادات کو ہم نے صرف پیمائش اور اندازہ پیمائی تک محدود کر دیا ہے۔"

حضرات ۔ جامیٹری چند اصول موضوعہ اور بنیادی صداقتوں سے بذریعہ استقرا نتائج استنباط کرتی ہے اس لیے وہ فن استقرا کا نہایت اہم اور مفید جزہے۔ جامیٹری کی تعلیم حسب ذیل ضابطوں پر مبنی ہے۔

(۱) نقاط۔ خطوط اور سطوح کے باہمی تعلقات میں ضروری اور غیر متعلق امور میں امتیاز قائم کرنا۔

(۲) بعد ازاں ان پر دلیل کی مسلسل کڑیوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کرنا جس میں ہر کڑی بجائے خود مستقل اور مکمل ہو اور دوسرے کے ساتھ اس کا ربط صاف اور نمایاں ہو۔

(۳) دعوے (Hypothesis) ثبوت اور نتائج کے باہمی روابط کو نہایت مختصر اور واضح طریق سے پیش کرنا۔

حضرات ۔ ایک مستقل اور مربوط فکر ذہنی میں اسی قسم کے دلائل استقرائی کا کسی نہ کسی نہج پر برسرِ کار لایا جانا لازمی ہے اس لیے اس مضمون کی تعلیمی قدر و قیمت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی بالخصوص اس بنا پر کہ اس طور پر نتائج کا استنباط کرنا ایک حد تک بچوں کے لیے نہایت آسان ہوتا ہے اور اس کے نتائج عملی طور پر بچوں کے مشاہدے میں لائے جا سکتے ہیں یہ طریقہ کار اس لیے اور زیادہ اہم اور مفید ہو جاتا ہے کہ کم سن طالب علم بجائے اس کے کہ محض افکار مجردہ۔ خیالات۔ تاثرات اور قیاسات ظنی پر عقیدہ لاتا۔ ایک صحیح اور تسلی بخش نتیجہ منطقی پر پہونچ جاتا ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس مضمون کی تعلیم باقاعدہ اور خاطر خواہ نہیں ہوتی۔ اس مضمون کی تعلیم میں اس امر کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس کا مطالعہ بجائے خود ایک مقصد نہیں ہے بلکہ اس سے دماغ صحیح نتائج استنباط کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔

حضرات ۔ جامیٹری کے نصاب کے متعلق دو مختلف رائیں ہیں۔ یاد ش بخیر ! اقلیدس کی تعلیم ایک حد تک متروک ہو گئی ہے۔ اور اس کی بجائے ایک نہایت غیر مرتب اور غیر منضبط طریقہ جامیٹری کا ایجاد کیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلبا کی وہ استعداد استقرا جو اپنے وجود کے لیے اقلیدس

کے شاندار اصول تشریح و بیان کی رہین منت تھی مفقود ہو گئی ہے۔ میں یہاں اس بات پر زور نہیں دیتا کہ قدیم اور جدید طریقوں کو مخلوط نہ کیا جائے بلکہ میری رائے یہ ہے کہ عملی حصے کو پہلے کیا جائے لیکن اس میں ترتیب و انضباط نصاب کا خاص طور پر خیال کیا جائے اور نظری حصہ کو بعد میں پڑھایا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیدس کے طریقے کی اہمیت طلبا پر زیادہ واضح اور نمایاں ہو جائے گی اور وہی نتائج جو عملی طریقہ کے ذریعے حاصل کر چکے ہیں اب محض استدلال منطقی سے حاصل کر کے ان کو خاص مسرت روحانی ہوگی۔ اور اپنے طریقہ استدلال پر ان کو یقین پختہ ہو جائے گا۔

استقرائی علم ہندسہ کی اصول اولین کا عملی جامیٹری اور ڈرائینگ کے ساتھ مناسب اتحاد و امتزاج نہایت ہی شاندار نتائج پیدا کرے گا اور طلبہ کی دلچسپی بڑھ جائے گی۔

ابتدائے کار میں جامیٹری کے اصول مجردہ کو پیش کرنا نہایت سنگین اور اندوہناک نتائج کا باعث ہوگا ایک عرصے سے یہ خیال عام ہے کہ جامیٹری ایک معمولی ذہن و دماغ والے شخص کی رسائی سے بالاتر ہے یہ خیال ایک ایسے مضمون کے مقبول انام بنائے جانے میں حائل ہے جس کے آسان اور دلنشین مبادیات عملی صورت میں آشکار ہو کر اپنے دلکش پہلوؤں سے طالب علم کو والہ و شیدا بنا لیتے ہیں۔ اس طرح پر نہ صرف استقرائی استعداد و تربیت میں نمایاں ترقی ہوتی ہے بلکہ عملی ضروریات زندگی کو جن کے لیے اول اول موجدان علم جامیٹری نے اس کو وضع کیا تھا بھی بے حد امداد ملتی ہے۔

حضرات ۔ ہر طالب علم کو مختلف طریقوں اور مختلف نوعیتوں سے جلد یا بدیر عالم مجازیہ کے ان نقطہائے اتصال سے ہم آویز ہونا پڑتا ہے جن سے اس کے اغراض و مقاصد کی کڑیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ متذکرہ بالا طریقہ تعلیم میں یہ خلائے بسیط مع ان تمام حرکات کے جو اس میں ساری و سائر ہیں اور جن کی طرف موجودہ طریقہ تعلیم میں ابتدائی عمر میں بہت کم توجہ کی جاتی ہے ایک طالب علم کی تفتیش و تفحص کی وسیع جولانگاہ بن جائیگی اس طرح پر عملی اندازہ پیمائیاں جب ہندسی نصب العین میں منتقل کی جائیں گی تو وہ ایک اخلاقی درس بصیرت کی حامل ہونگی اور جامیٹری کی تعلیم شرف انسانیت کا ایک جزبن جائے گی اور پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ طلبا اس سے دلچسپی نہ لیں۔

جبر و مقابلہ

ڈی مارگن جو ایک بہت بڑا ریاضی داں گذرا ہے وہ رقمطراز ہے۔ "جبر و مقابلہ کے مخصوص فوائد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں وہ تمام خوبیاں اور فوائد ہیں جو عام طور پر ریاضیات میں دریافت ہو چکے ہیں۔ اور جن کا تذکرہ یہاں کچھ زیادہ ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا مطالعہ خواہ آپ اسے علم المقدار سمجھ کر کریں

یا لسان الاشیاء Language of symbols کی رو سے اس کے فوائد ان لوگوں کے لیے جو علم الحساب سے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں اور اس کی دقتوں سے عہدہ برا ہونے کے کافی بصیرت رکھتے ہیں، لاتعداد اور لاانتہا ہیں"

جبر و مقابلہ کی ابتدائی تعلیم میں بعض نہایت ذہین بچے بھی گھبرانے لگتے ہیں ان کے نزدیک حروف کا استعمال ایک ایسی چیستان ہے جو محض انھیں سرگرداں و حیران کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلبا کو پہلی مرتبہ الجبرا کی تعلیم میں ان حقیقتہائے عمومی سے آشنا ہونا پڑتا ہے جو صرف کسی مخصوص شے واحد سے وابستہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کا اطلاق اشیا کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ انھیں حقیقتوں کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں وہ ذہنی اور دماغی قوتیں عمل میں آتی ہیں جو بعد میں عالم امکان کی جملہ تنوعات پر حاوی ہونے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ جبر و مقابلہ کی تعلیم اپنے متلاشیوں کو انھیں نعائم ذہنی سے آشنا کراتی ہیں لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ معلم ان حقائق کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اور طلبا کی توجہ کو ان صداقتوں کی طرف منعطف نہیں کرتا تو بہت صدمہ ہوتا ہے۔ علم الحساب اور جبر و مقابلہ کے درمیان ایک وسیع اور عمیق خلیج حائل ہے اور وہ اس کو پاٹ کر طالب علم کو اس کے عبور کرانے میں ذرہ بھر امداد نہیں دیتا تو کچھ تعجب نہیں کہ غریب طالب علم ان حقائق پر وقوف نہ حاصل کرنے کی وجہ سے خود مضمون سے متنفر ہو جاتا ہے۔

حضرات ۔ وہ مقاصد خصوصی جن کی طرف تعلیم جبر و مقابلہ ہماری رہنمائی کرتی ہے حسب ذیل ہیں:

(۱) جب ہم مساوات کے ذریعہ سے کسی سوال کا حل کرتے ہیں تو خیالات کے مرتب کرنے اور سمجھانے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) جبر و مقابلہ کی تعلیم اگر معقولی طریقے پر دی جائے تو طالب علم کو خاص واقعات سے عام نتائج اخذ کرنے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ان حالات اور شرائط پر وقوف حاصل ہوتا ہے جن کی رو سے اسے فوراً اپنے طریقہ عمل کی صحت یا عدم صحت کا پتہ چل جاتا ہے۔

(۳) جبر و مقابلہ علم الحساب سے کہیں زیادہ مقادیر کے پختہ اور مفید وقوف کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور اس کی رو سے ہماری کاوش ذہنی زیادہ مکمل اور فطری ہو جاتی ہے۔ اعداد کے حیطے میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۴) جبر و مقابلہ مقادیر کی لحظہ لحظہ تبدیلی اور ایک تغیر پذیر مقدار کا دوسری تغیر پذیر مقدار سے ارتباط اور ان کے باہمی تغیر عملی سے ہم کو آگاہ کرتا ہے۔ اور طلبائے علم طبیعات کے لیے بے حد مفید طریقہ عمل پیش کرتا ہے۔

ایک ایسے مضمون کی تعلیمی قدر و قیمت کے متعلق جس کے متذکرہ صدر مقاصد ہوں اختلاف آرا کا امکان نہیں ہے لیکن موجودہ طریقہ تعلیم ایک حد تک ناقص ہے، طلبا کا ریاضیات میں دلچسپی نہ لینا اس باعث سے بھی ہے کہ ابتدائے ریاضیات میں جتنے موضوع شامل ہیں ان میں آپس میں کوئی ربط و اتحاد پیدا نہیں کیا جاتا۔

لیگرانج کا مقولہ ہے کہ "جب تک جبر و مقابلہ اور جامیٹری کی تعلیم متفرق طور پر ہوتی رہی ان کی ترقی سست اور ان کا اطلاق و عمل محدود رہا۔ لیکن جس وقت ان دونوں علوم میں اتحاد پیدا کیا گیا انھوں نے ایک دوسرے کو محکم و استوار کر دیا اور نہایت سرعت کے ساتھ منزل تکمیل کی طرف رہنموں ہو گئے"۔

جامیٹری اور علم الحساب جبر و مقابلے کے وہ دو رفیق ہیں جن سے اس کو تقویت پہنچتی رہتی ہے اگر اسے ان کی رفاقت سے محروم کر دیا جائے تو اس میں آثار انحطاط پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اور پھر اس کے علامات اور نشانات راز ہائے سربستہ ہو جاتے ہیں اور وہ خود ایک میکانیکی عمل رہ جاتا ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ استاد جبر و مقابلہ کے علامات اور نشانات کو علم الحساب کے اعداد سے جو خود بھی نشان ہیں زیادہ عام بنانے کی کوشش کرے۔ اور جلد سے جلد ان کی اہمیت کو طلبا پر آشکارا کرنے کی بطریق احسن کوشش کرے۔ اور صرف اسی حالت میں جبر و مقابلہ اپنے فوائد کے اعتبار سے ابتدائے نصاب تعلیم میں باریاب ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

علم الحساب

لیگرانج لکھتا ہے "ایک قدیم مصنف کا قول ہے کہ حساب اور علم ہندسہ ریاضیات کے دو شہپر ہیں۔ میں بغیر کسی شاعرانہ حسن بیان کا مرتکب ہوئے اس امر کا ادعا کر سکتا ہوں کہ یہ دونوں علوم ان تمام علوم کے جو مقدار سے بحث کرتے ہیں سنگ اساس ہیں بلکہ میرے نزدیک ان کی حیثیت سنگ فرق پوش کی بھی ہے۔ جب کبھی کوئی نتیجہ ریاضیات کے قواعد سے مستنبط ہوتا ہے تو اس کو سمجھنے کے لیے اسے اعداد یا خطوط میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اعداد میں تبدیل کرنے کے لیے علم الحساب کی کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور خطوط میں منتقل کرنے کے لیے جومیٹری کی امداد حاصل کرنا پڑتی ہے"۔

افلاطون لکھتا ہے "حساب کا اثر نہایت زبردست اور شاندار ہوتا ہے۔ وہ ہماری روح کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اعداد مجردہ پر غور و فکر کرے اور اگر ہمارے افکار ذہنی مرئی اور مادی اشیا خارجیہ سے متصادم ہوتے ہوں تو وہ قائل یا مطمئن ہونے سے انکار کر دے"۔

مائیسرز لکھتا ہے "حساب سلیم ہماری ان مساعی کا زبردست معین ہوتا ہے جن کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ وہ ہماری تمیز اور افکار کا ممد اور مقصد عمل میں صلابت اور

استقلال کا مؤید ہوتا ہے۔ وہ بیداری۔ ایمان بالصدق۔ انبساط کامرانی میں معاون ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چیزیں جو ایک اچھے اور قابل شہری پیدا کرنے میں معین ہوتی ہیں۔ حساب سلیم ہم میں بلند خیالی پیدا کرتا ہے ذہن و دماغ کو چار چاند لگا دیتا ہے اور حق و صداقت کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا کرتا ہے۔ اور ایک پاکیزہ حافظے پر ہمیں قدرت دیتا ہے"۔

حضرات۔ حساب کی تعلیم ایک عرصے سے اس طور پر دی جا رہی ہے گویا وہ ایک میکانیکی فن ہے اس سے جو مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طریقے سے اس کی تعلیمی قدر و قیمت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس طور پر یہ توقع کہ وہ ہماری ذہنی ترقیوں کا باعث ہو سکے گی بالکل نقش بر آب ہو جاتی ہے۔ اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ حساب کی تعلیم میں دو امور خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھنا چاہیے ایک طرف تو طلبا کے ذہن و فکر کو ترقی دینے کی اور دوسری طرف ان کو اس مضمون میں ایسی مہارت پیدا کر دی جائے کہ وہ دنیائے عمل میں روزمرہ کے حوائج اور ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ان میں سے نہ صرف ہر ایک بجائے خود مفید ہے بلکہ ان کے باہمی تعلقات اور ان کا باہمی عمل اور ردّ عمل اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ دونوں دوش بدوش رہنموں رہیں۔ طلبا کے سامنے ایسے اصول اور قوانین کا پیش کر دینا جو بجائے خود نہ تو صحیح معلوم ہوتے ہوں اور نہ غلط بلکہ محض استاد کا حکم ناطق معلوم ہوں اور جو صرف اس بات کا متمنی ہو کہ "تمنا بے قرار ہے تو ہے تماشا کامیاب" ہونا چاہیے مرے نزدیک ایک لایعنی فعل ہے۔ اس میں شک نہیں بعض عملی افادات کو مدنظر رکھتے ہوئے بسا اوقات یہ طریقہ ناگزیر بھی ہوتا ہے لیکن جہاں تک جلد ممکن ہو سکے استاد کو کسی نہ کسی طور پر ان رموز اور اصول کی تشریح کر دینا چاہیے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک ہمدرد استاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

حضرات۔ طریقہ تعلیم کی ایک معقول صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ استاد اپنے طلبا کے سامنے چند سہل اور سادہ اقتصادی اصول کو اس طور پر پیش کرے کہ وہ ایک معمولی اور متوسط درجے کے خاندان یا خود طالب علم کے جمع و خرچ پر منطبق ہوتا ہو اور جوں جوں طالب علم کا سرمایہ معلومات وسیع اور اس کے افکار ذہنی میں ترقی ہو اسے میونسپل یا سرکاری بجٹ سے آشنا کرایا جائے۔ اس طور پر بہت سے ایسے دلچسپ سوالات خود بخود معرض بحث میں آتے رہیں گے جو آمدنی کے مدخل و مخرج سے متعلق ہوں گے۔ اور رفتہ رفتہ طالبِ علم ان تخیلی اخلاقی عملی اور علمی حیثیات سے ترقی کرنے لگا جس کا اصلی سرچشمہ کچھ علم اقتصاد اور کچھ علم المدن ہے۔

Banking Arithmetic (حساب مبادلہ) اور Stock Exchange
نہایت برے طور پر سکھائی جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد ان کے اصول اور کلیات پیش کرنے میں صرف
ایک طوفان تکلم سے کام لیتا ہے اور بالکل غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں پر زور دیتا ہے۔ اور یہ مضامین
ایسے ہیں جو طلبا کی محدود معلومات سے کہیں بلند ہیں اور جن سے عہد طفولیت میں شاید ہی کوئی طالبعلم
آشنا ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اُستاد پہلے معاشری اور اقتصادی زندگی کے چند نہایت ابتدائی
اصول کو انتہائی ہوشیاری کے ساتھ طلبا کے سامنے پیش کرے اور وہ بھی اس طور پر کہ طلبا کو اُن کے سمجھنے
میں آسانی ہو Saving Bank کے مقاصد اور ان کا طریق عمل اگر طلبا کے سامنے پیش کیا جائے
تو امید ہے کہ وہ کافی دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ اخبارات کے وہ کالم جس میں مالیات کے متعلق معلومات ہوتی
ہیں طلبا کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

علم الحساب سے پورے طور پر مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر طالب علم اس دنیا اور ماحول کا مطالعہ کرے
جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اس کے بعد اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ طالب علم میں اس قسم کا رجحان پیدا کیا
جائے کہ وہ اپنی ترقی پذیر نصب العین کے مطابق اور اپنے ذاتی اصول کے ہم آہنگ خود اپنی دنیا بناتا اور بگاڑتا
رہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ شمار اور پیمائش کا اپنے آپ کو خوگر بنائے اندریں حالت
ظاہر ہے ہر اُستاد کو انتہائی شغف اور وابستگی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ یہی جذبات خود اس کے شاگردوں میں
بھی پیدا ہوں۔

حضرات ۔ ان حالات کے ماتحت ہم کو ابتدائی ریاضیات کے لیے ایک ایسے معقول اور سنجیدہ نصاب کی
ضرورت جس کی تعلیمی قدر و قیمت مسلمہ ہے۔ اور جس کی وقعت اور اہمیت کے قائل صرف ریاضی داں نہوں
بلکہ ہر تعلیم یافتہ شخص ہو یہ نصاب محض تعلیم ریاضی ہی کے لیے مفید نہو بلکہ دوسرے علوم کے تحصیل و اکتساب
میں بھی ان سے کافی امداد ملتی ہو۔

اس طور پر مجھے یقین ہے کہ عام طور پر ہر شخص ریاضیات میں دلچسپی لینے پر آمادہ ہو جائیگا۔ صرف ضرورت
اس امر کی ہے کہ اس کی تعلیم اس نہج پر ہو کہ ہر طالب علم یہ محسوس کرے کہ وہ اس کے افکار اور جذبات کے مطابق
ہے۔ اس کے مدرکات اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ فی الواقع کسی خاص مقصد کی طرف رہبری کر رہی ہے
اس وقت لڑکوں پر اس کی طرف سے جیسی کچھ ہیبت طاری ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ فی زمانا ریاضیات
کی تعلیم ناقص اور بے کیف ہوتی ہے۔ ہم لوگوں سے جن کے ذمہ تعلیم کا فریضہ مقدس سپرد کیا گیا ہے اس کے سنگین
نتائج کا مواخذہ کیا جائے گا۔ والسلام

لکچر نمبر ۲

علم طبیعات کے دلچسپ تجربے، اُس کا طریق تعلیم اور نصاب تعلیم میں اس کی اہمیت

از

مسٹر فیروزالدین مراد بی اے، ایم ایس سی چیرمین فزکس ڈیپارٹمنٹ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب صدر و حاضرین! میں نے اپنے لکچر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں چند دلچسپ تجربے کرکے دکھاؤں گا، ازاں بعد اپنا مضمون "طبیعات کا طریق تعلیم اور نصاب تعلیم میں سائنس کی اہمیت" آپ کی خدمت میں پڑھ کر سناؤں گا۔

میں نے مدارس کے معلمین سائنس کے فائدے کے لئے تجربات کے چند ایسے آلات منتخب کئے ہیں جو تعلیم سائنس کی دلچسپی بڑھانے کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوسکتے ہیں، اور جو بآسانی اور ارزاں داموں سے خریدے جاسکتے ہیں۔

آپ نے بجلی کی مشین ڈائنمو (Dynamo) اور موٹر (Motor) کا نام سُنا ہوگا۔ ڈائنمو سے بجلی حاصل کی جاتی ہے۔ میز پر آپ کے سامنے ایک چھوٹی سی ڈائنمو مشین رکھی ہے جس کے گھمانے سے برقی لمپ روشن ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے بجلی کا جیبی لمپ یا برقی مشعل (Electric torch) ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ بجلی کی جیبی لمپ کے لئے جیبی بیٹری (Battary) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو چند دنوں کے استعمال کے بعد بے کار ہوجاتی ہے۔ میرے پاس یہ آلہ ہینڈی لائٹ (Handilite) ڈائنمو اور بجلی کے جیبی لمپ کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعے سے اندھیرے میں روشنی کی جاسکتی ہے۔ یہ بآسانی جیب میں رکھا جاسکتا

ہے۔ اس کے لئے کسی قسم کے بیٹری کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ جس وقت روشنی کی ضرورت ہوئی، اس پرزہ کے دبانے سے بجلی حاصل ہوجاتی ہے اور برقی لمپ حسب پسند کم و بیش روشنی سے روشن کیا جا سکتا ہے۔ یہ آلہ دہلی، کلکتہ، بمبئی سے بہ قیمت بیس روپیہ خریدا جا سکتا ہے۔

پیدل چلتے ہوئے اپنی مسافت کی پیمائش کے لئے یہ آلہ پیڈومیٹر (Pedometer) ایک عجیب چیز ہے۔ اس کی شکل بالکل جیبی گھڑی کی سی ہے۔ یہ پیدل چلتے ہوئے خود بخود اس فاصلے کی پیمائش کرتا جاتا ہے جو کہ چلا جاتا ہے۔ اس میں چابی لگانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک قسم کا لیور (Lever) ہے جس کے ایک سرے پر تھوڑا سا بوجھ بندھا ہوا ہے۔ چلتے ہوئے آدمی کا قدم اوپر نیچے اٹھتا ہے اور اس سے تمام جسم قدرے قلیل ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر نیچے متحرک ہوتا ہے۔ یہ پیڈومیٹر صدری کی جیب میں رکھا جاتا ہے اور ہر ایک قدم کے جھٹکے سے اس کی سوئی ایک درجہ آگے کی طرف حرکت کرتی ہے اور فاصلہ گزوں اور میلوں میں ڈائل (Dial) کی سوئیوں کی مدد سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کی قیمت تقریباً پندرہ بیس روپیہ ہے۔ چُٹکی گھڑی (stop watch) کی مثل اس میں بھی یہ پرزہ ایسا ہے کہ اس کے دبا دینے سے اس کی کل سوئیاں صفر پر آ جاتی ہیں۔

آپ نے لٹّو ضرور دیکھا ہے، اس کی ترقی یافتہ شکل جائرسکوپ (Gyroscope) ہے اور میرے ہاتھ میں ایک شلنگ یعنی ۱۲ آنے کا یہ کھلونا (Gyroscope cyclist) ایک پہیہ کی سائیکل اور ایک پہیہ کی ریل گاڑی کی تشریح کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک پہیہ کی ریل گاڑی (Mono-rail) کی تشریح کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک پہیہ کی ریل گاڑی کے فوائد اظہر من الشمس ہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ گھومنے والی اشیاء اپنا توازن قائم رکھتی ہیں۔

ریڈیم (Radium) کے عجائبات آپ نے ضرور سُنے ہونگے۔ ریڈیم کے حیرت انگیز خواص کی تشریح کے لئے وقت کافی نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی خدمت میں صرف یہ آلہ جسے ریڈیم کی خُردبین یا سپنتھیرسکوپ (Spinthariscope) کہتے ہیں، پیش کرتا ہوں۔ ریڈیم ایک بیش بہا چیز ہے جس کی مجموعی مقدار دنیا میں چند تولوں سے زیادہ نہیں ہے اور جس کی ایک رتی کی قیمت کئی تولہ سونے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن ریڈیم کا یہ آلہ صرف ۷، ۸ روپیہ میں خریدا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی کامیابی کا انحصار محض اس امر پر ہے کہ اس میں کم سے کم مقدار ریڈیم کی استعمال کی جائے۔ اندھیرے میں ایک آنکھ سے اس کے اندر دیکھنے سے درخشاں ستارے نظر آتے ہیں اور ایک عجیب سما آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے اوپر ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ اس آلے کے اندر ہر لحظہ یہی حالت جاری رہتی ہے اور یہ حالت آئندہ ۵ ہزار برس تک

کم و بیش اسی نوعیت سے قائم رہے گی۔ اس کی ساخت حسب ذیل ہے: ایک سوئی کی نوک پر ریڈیم کی ایک نہایت ہی قلیل مقدار لگائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے سوئی کی نوک اس برتن کے پہلوؤں سے رگڑی جاتی ہے جس میں کبھی ریڈیم رکھی ہوتی تھی لیکن اب وہ برتن خالی ہے۔ محض اسی قدر قلیل مقدار اس آلہ کی ساخت اور کامیابی کی لئے کافی ہے۔ ایسی سوئی کی نوک پر سے ہر آن چالیس پچاس الفا (Alpla. particles) ذرات جو اجزائے لایتجزی یعنی جواہر سے بھی بدرجہا چھوٹے ہوتے ہیں۔ خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جسامت کے چھوٹائی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو ہزار برس تک ہر لحظہ ان کی اخراج کے باوجود سوئی کی نوک پر ریڈیم کی مقدار نصف سے کم نہیں ہوگی۔ یہ ذرات بیس تیس ہزار بلکہ چالیس ہزار میل فی ثانیہ کی محیر العقل رفتار سے خارج ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی قلیل جسامت کے لحاظ سے ان میں توانائی کی ایک عظیم مقدار ہوتی ہے۔
اس آلہ کے اندر سوئی کی نوک کے بالمقابل ایک کاغذ کا ٹکڑا رکھا ہے جس کے اوپر زنک سلفائیڈ (Zinc Sulphide) لگا ہے۔ ان سریع السیر الفا ذرات کے تصادم سے زنک سلفائیڈ کے ذرات میں سے روشنی پیدا ہو جاتی ہے جو اندھیرے میں دیکھنے سے ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی طرح چمکتی دمکتی نظر آتی ہے زنک سلفائیڈ کا یہ پردہ سال دو سال کے بعد متواتر صدمات کے باعث ناکارہ ہو جاتا ہے اس لئے سال دو سال کے بعد اس کا بدلنا ضروری ہے لیکن ریڈیم کے ذرات سوئی کی نوک پر سے مداومت کے ساتھ مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں۔ یہ آلہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے منظر کی خوبی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

حضرات! اس کے علاوہ چند اور سستے لیکن سبق آموز آلات میز پر رکھے ہیں جن کی تشریح کے لئے معمل طبعی زیادہ موزوں جگہ ہوگی۔ اب میں جناب صدر کی اجازت سے اپنا مضمون پڑھنا شروع کرتا ہوں۔

فیروزالدین مراد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

طبیعیات کا طریقِ تعلیم

اور

نصابِ تعلیم میں سائنس کی اہمیت

نوشتہ

فیروز الدین مراد صاحب بی اے ایم ایس سی، چیرمین فزکس ڈیپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھتیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۲۹ دسمبر ۱۹۲۳ء کو پڑھا گیا)۔

اس مضمون میں حسب ارشاد جنابِ صدر، ارادۃً سہل پسندی اور ابتدائی امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ یہ مضمون مڈل اور ہائی اسکولوں کے مدرسین سائنس کے لئے خصوصیت کے ساتھ مفید ہو سکے۔

نصابِ تعلیم میں سائنس کی اہمیت کے متعلق فی زمانناً دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ماہرانِ تعلیم متفق ہیں کہ سائنس، بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا ایک ضروری جزو ہونا چاہیئے۔ من جملہ دوسرے درسی مضامین کے سائنس کی خواندگی بھی کئی لحاظ سے مفید اور ضروری خیال کی جاتی ہے۔

سائینس تشحیذ الاذہان کا کام دیتی ہے۔ **تعلیم سائینس صیقل العقول ہے** ۔ طلبہ کے ذہن مطالعۂ فطرت سے جلا پاتے ہیں۔ ان کی عقلیں کارخانۂ قدرت کے گوناگوں مظاہر دیکھ اور سمجھ کر کند سے تیز اور تیز سے تیز تر ہو جاتی ہیں۔

سائینس بچوں کو راستی اور راست بازی سکھاتی ہے۔ طلبائے سائینس بخوبی جانتے ہیں کہ کسی تجربے کا غلط نتیجہ اُستاد کے سامنے ویسی ہی دیانت داری سے پیش کرنا چاہئے جیسے کہ صحیح نتیجہ۔ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے حاصل شدہ نتیجہ کی صحت یا غلطی بسا اوقات ہمارے مساعی سے بالاتر ہوتی ہے۔ طلبہ کو اس امر کی تلقین کی جاتی ہے کہ صحیح نتیجہ کے حصول کے لئے، مشاہدات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل جائز نہیں ہے۔ مثال کے لئے فرض کرو کہ ہم ایک طالب علم کو پانی کے نقطۂ جوش کی تخمین کے لئے تپش پیما اور دیگر آلات دیتے ہیں۔ طالب علم کو معلوم ہے کہ کرۂ ہوائی کے دباؤ کی تحت میں پانی کا نقطۂ غلیان ۱۰۰ درجہ مئی ہے۔ وہ اپنے تجربے میں پانی کو ایک کھلے منہ والے برتن میں کھولاتا ہے لیکن تپش پیما ۹۹ درجے سے اوپر نہیں بڑھتا۔ جو طالب علم سائینس کی اصلی غرض و غایت سمجھے ہوئے ہے وہ اپنے بیان میں مشاہدہ کردہ ۹۹ درجے کو ۱۰۰ درجے ہرگز ظاہر نہیں کرے گا۔ اُس کو معمل طبعی میں صاف اور واضح الفاظ میں سکھایا جاتا ہے کہ سچائی ہر ایک تجربے کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے بغیر سائینس کا کام ترقی پزیر نہیں ہوسکتا۔ ہم کسی تجربے کے نتیجے کی غلطی یا صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر طالب علم کو پانی کا نقطۂ جوش ۱۰۰ درجے کی بجائے صرف ۹۹ درجے حاصل ہوتا ہے تو نکتہ رس معلم، طالب علم پر خفا نہیں ہوتا۔ ہر ایک قابل استاد، طلبہ کی راست بازی، طرزِ تحریر، عمل کی صفائی اور صحتِ مشاہدات کو نتیجے کی سو فی صدی درستی پر مرجح سمجھتا ہے کیونکہ صحیح مشاہدات کے باوجود نتیجہ لازماً صحیح نہیں ہوتا۔ تجربہ بالا میں ممکن ہے کہ تپش پیما کی تعیر (**Calibration**) یا درجہ بندی ٹھیک طور سے نہ کی گئی ہو۔ ممکن ہے کہ غلطی کا باعث، بوقتِ تجربہ ہوا کے دباؤ کا معیاری دباؤ سے کم ہونا ہو یا ممکن ہے کہ جوشش دادہ پانی ناخالص ہو۔ ایسے حالات میں صحیح مشاہدات سے غلط نتیجے کا حصول نہ صرف قرین قیاس بلکہ ضروری ہے اور نتیجہ کی غلطی کے بجائے نتیجہ کی صحت قابل مواخذہ ہے۔ غرضیکہ، بسا اوقات نتیجہ کی غلطی کے بواعث ایسے ہوتے ہیں کہ طلبا کو ان پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے غیر اختیاری بواعث، جن کی وجہ سے تجربات کے نتائج ناقص حاصل ہوتے ہیں، سائینس کے طالب علم کو قدم قدم پر پیش آتے ہیں۔ ان کو ٹھیک طور پر سمجھنا اور راستی کے ساتھ اپنے محتاط مشاہدات کے اوپر بھروسہ رکھنا، طلبائے سائینس کی تعلیم کا ایک ضروری عنصر ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ بیس سال کے عرصہ میں، انسان اس امر کا امتحان بخوبی کرسکتا ہے کہ طلبائے

سائینس معمل سائینس کے اندر کس درجے تک سچ کے عادی ہوتے ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور، مدرستہ العلوم علی گڑھ اور متعدد دوسرے کالجوں کے معامل طبیعیات میں گزشتہ بیس سال کے طویل عرصہ میں صرف ایک واقعہ معلوم ہوا ہے، جہاں طالب علم نے اپنے تجربی مشاہدات اور نتائج پیش کرتے ہوئے عمداً دروغ بافی کی۔ اس طالب علم کو یونیورسٹی کے امتحان میں ممتحن نے سادہ رقاص کے ساتھ اسراع جاذبہ زمین تخمین کرنا تفویض کیا تھا۔ طالب علم کا نتیجہ غلط نکلتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے صحیح مشاہدات لکھنے کی بجائے من گھڑت مشاہدات درج کردیئے یعنی اسراع کی صحیح قیمت فرض کرکے، اُس نے ضابطہ کے بموجب، رقاص کا طول اور وقتِ دوران شمار کرلیا۔ یہ مستنبط طول واقعی طول سے مختلف تھا۔ سائینس دان کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے یہ حیثیت ممتحن میں تاڑ گیا کہ مندرجہ طول واقعی طول سے مختلف ہے۔ پیمائش نے طالب علم کا پردہ فاش کردیا اور اس نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ بات دراصل یہ تھی کہ محض امتحان کی خاطر، تجربی مہارت اور راستی کے امتحان کی خاطر، متعلم کو اس کے علم کے بغیر، ایک غلط چلنے والی گھڑی دی گئی تھی جس سے رقاص کے وقتِ دوران کی تخمین کے متعلق اس کے مشاہدات کا غلط ہونا ایک ضروری امر تھا۔

افسوس ہے کہ سائینٹفک سچائی کی یہ تعلیم طلبائے سائینس کی زندگیوں میں، سوسائٹی کی خرابی کے باعث ہمارے ملک میں نمایاں طور پر محسوس نہیں ہوتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سائینس کے پڑھانے والے خواہ وہ مدارس کے معلم ہوں یا یونیورسٹیوں کے پروفیسر، روزافزوں شدت کے ساتھ، تعلیم سائینس کے اس پہلو کی طرف توجہ کریں۔ میرے نزدیک تعلیم سائینس کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ راستی، راست بازی اور حق پرستی کی تلقین ہے جس سے نوجوانوں کی سیرت پر ایک اعلیٰ اثر پڑتا ہے۔

تحقیقِ حق اور ابطالِ باطل کے علاوہ سائینس جزئیات کے غامض مطالعہ کا عادی بناتی ہے۔ اعلیٰ دماغی قابلیت کی تعریف ایک محقق کے قول[ل] کے مطابق جزئیات کی نگہداشت کے لئے غیر محدود استعداد ہے۔ جب تک سائینس داں کی نظر اپنے مخصوص مسئلہ کے متعلق تمام امور کے اوپر حاوی نہیں ہوتی، تحقیقاتِ عالیہ کا راستہ بند رہتا ہے۔ اس شرط کا اطلاق اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم سائینس پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ بندی اور منتہی دونوں کو اس امر کی مساوی ضرورت ہوتی ہے کہ پیش نظر مسئلہ کے متعلق

ل Genius is an infinitre copacity for going into details

جملہ معلومات صحت کے ساتھ بہم پہنچالیں۔ سائنٹیفک ترقی کے لئے وسعتِ نظر اور دقّتِ نظر دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔

سائنس کا مطالعہ دو طور پر کیا جاتا ہے۔ نظری طور پر اور عملاً یعنی استعمال کے نقطۂ نگاہ سے صحیفۂ فطرت کا نظری مطالعہ انسانی دماغ کا بہترین کارنامہ ہے۔ علوم جدیدہ کی ترقی کا اصلی محرک حقائقِ فطرت کی نظری دریافت ہے۔ دنیا کے بکھیڑوں سے الگ اور اغراض کی آلائش سے پاک، سائنس داں محض تلاشِ حق کے لئے اپنے معامل میں شب و روز سرگرم کار رہتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر، عملی فوائد اور مفید نتائج سے بالاتر ہوتا ہے۔ حق کی دریافت سے جو روحانی خوشی انھیں حاصل ہوتی ہے وہی ان کی مساعی کا محرک اور وہی ان کی محنت کا ثمرہ ہے۔

لیکن مبتدی طلبائے سائنس کے لئے یہ امور چنداں زیادہ دلچسپ نہیں ہو سکتے۔ ان کے ذہن میں تحقیقاتِ عالیہ کا نقش بہت دھندلا ہوتا ہے۔ اس لئے اعلیٰ مسائلِ سائنس میں ان کی دلچسپی بڑھانے کی خاطر، معلمین کو چاہیے کہ طلبہ کے سامنے ایسے مسائل بوضاحت پیش کریں۔ جہاں تک ممکن ہو کوشش کرنا چاہیے کہ ہمیشہ سائنس کا روشن پہلو طلبہ کے پیش نظر رہے۔ سائنس کے روشن پہلو سے ہماری مراد، ماہرانِ سائنس کی بے غرضانہ تحقیقات، رازہائے قدرت کا انکشاف، بنی نوع انسان کے علمی مطامحِ نظر کی بلندی اور تہذیب حال میں سائنس کی عملی خدمات اور گوناگوں مفید ایجادات و اختراعات ہیں۔

معلمین سائنس کو چاہیے کہ بفحوائے کَلِّمِ النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِھِم طلبہ کو ابتدائی مسائل عام فہم پیرایۂ بیان سے سمجھائیں اور عام سائنس کی تعلیم میں بالعموم اور تعلیم طبیعیات میں بالخصوص، طلبہ کے سامنے ان علوم کے تجربے، تاریخی اور صنعتی پہلو نمایاں طور پر پیش کریں۔ کسی مسئلہ کی تفہیم تامہ کے لئے نفسِ مضمون کے علاوہ اس کی ابتدائی تاریخ اور اس کے عملی فوائد کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً روشنی کے اسباق میں بصریات کے عنوان کے ماتحت طلبہ کو بتانا چاہیئے کہ اشیا یا تو اپنی ذاتی روشنی سے یا منعکس روشنی کے باعث نظر آتی ہیں۔ پہلی قسم کی اشیاء مثلاً روشن شمع، سورج وغیرہ سے روشنی کی لہریں ہماری آنکھ سے متصادم ہو کر اُن اشیاء کی شبیہ ہمارے دماغ میں پیدا کرتی ہیں۔ آنکھ کی پتلی اور دماغ کے درمیان عصبۂ مجوّفہ (optic nerve) رابطۂ اتحاد ہے۔ اگر آنکھ کا عدسہ (Crystalline Lens of the eye) ناقص ہو تو یہ شبیہ ناقص بنتی ہے اور اشیاء دھندلی نظر آتی ہیں لیکن اگر عصبۂ مجوفہ میں کسی قسم کا نقص ہو تو آنکھ بے نور رہتی ہے۔ بیرونی اشیا بالکل دکھائی نہیں دیتیں۔ عدسۂ چشم (Crystalline Lens of the eye) کے نقائص سے

کوتاہ نظری (Short sight Myopia) دراز نظری (Long sight or Hypermetropia)
دو نظری (Diplopia) اسٹگماٹزم وغیرہ عوارض لاحق ہوتے ہیں جن کا طبی علاج معروف ہے
عصبۂ مجوفہ اور پردۂ شبکیہ کے فقدانِ حس سے نابینائی لازم آتی ہے اور انسان مستقل طور پر اندھا ہو جاتا
ہے۔ اس ضمن میں افلاطون کے نظریۂ بصارت کا مختصر ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ افلاطون کا قیاس تھا
کہ بینائی کے لئے حسب ذیل عناصر ثلٰثہ ضروری ہیں۔ اول ایک قسم کے یزدانی نور کی موجیں جو چشم بینا میں پیدا
ہوتی ہیں۔ دوم آفتابِ عالمتاب کی روشنی جس کے ساتھ نورِ بصر مل جاتا ہے۔ ثالثاً ان دونوں کا اتحاد
اس اشعاع کے ساتھ ہوتا ہے جو مرئی اشیاء سے خارج ہوتا ہے اور اس طور پر بینائی کا فعل مکمل ہوتا ہے۔
اس قیاس کو مبتدی طلبہ بھی بآسانی باطل ثابت کر سکتے ہیں۔

تعلیم طبیعیات میں سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ طلبہ کے دلوں میں یہ احساس پیدا
ہو جائے کہ وہ کسی مسئلہ کے مالۂ و ماعلیہ کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ احساس غرورِ نفس کی بجائے مستحسن نتائج کا
باعث ہوتا ہے۔ افلاطون کے غلط قیاس کے متعلق ایک آسان تجربہ طلبہ بطور خود یوں کر سکتے ہیں کہ چند سفید و
سیاہ چیزیں کسی تاریک کمرے کے اندر مختلف جگہوں پر رکھیں۔ کامل تاریکی میں کوئی چیز بھی نظر نہیں آئے گی
لمپ یا سورج کی روشنی میں آنکھ نہ صرف ان کے وجود کا احساس کر سکتی ہے بلکہ ان کے رنگ اور شکل
کے اختلافات کو بھی بخوبی جانچ لیتی ہے۔ طالب علم اس قسم کے تجربوں سے یہ امر بوضاحت سمجھ لے گا کہ اشیاء
یا تو خود منبع نور ہونے کے باعث یا انعکاسِ نور کی قابلیت کے باعث نظر آتی ہیں۔ جو اشیاء جملہ الوان نور
کو یکساں طور پر منعکس کرتی ہیں وہ سفید کہلاتی ہیں۔ جو اشیاء بعض رنگوں کو جذب اور بعض کو منعکس کرتی
ہیں، ان کا رنگ دوگونہ ہوتا ہے۔ منعکس روشنی سے ان کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے اور ان کے آر پار گزر جانے
والی روشنی سے ان کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے۔ لیکن دونوں حالتوں میں جو کیفیت آنکھ میں منتج ہوتی ہے وہ روشنی
کی ان لہروں کے مطابق ہوتی ہے جو آنکھ سے متصادم ہوتی ہیں۔ مینار نور (Light house) میں
بڑے بڑے عدسوں کے استعمال سے روشنی کی تیز متوازی شعاعیں سطح سمندر کو منور کرتی ہیں۔ اب اگر یہ
شعاعیں کسی جہاز سے منعکس ہو کر کسی آدمی کی آنکھ میں داخل ہوں تو وہ جہاز اسے نظر آجاتا ہے۔

اگر اشیاء کو سفید روشنی کی بجائے کسی اور رنگ کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کا رنگ مختلف
نظر آتا ہے۔ اسی لئے لمپ کی روشنی میں پارچہ جات کی صحیح رنگت شناخت نہیں کی جا سکتی۔ لمپ کی روشنی
بظاہر سفید معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل سورج کی روشنی کی مثل سفید نہیں ہوتی۔ سفید روشنی اس
روشنی کو کہتے ہیں طیف شمسی (Solar spectrum) یا قوس قزح کے سے الوانہائے مختلفہ کی

آمیزش اسی تناسب سے ہو جیسا کہ سورج کی روشنی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ درختوں کے پتے دن کے اجالے میں سبز نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورج کی روشنی میں سے زرد و سرخ رنگ کی شعاعیں جذب کر لیتے ہیں اور سبز رنگ کی شعاعیں منعکس کر دیتے ہیں۔ اگر انھیں رات کے وقت سرخ رنگ کی روشنی سے دیکھا جائے تو چونکہ یہ سرخ رنگ کی شعاعیں تمام تر جذب کر لیتے ہیں اس لئے بالکل سیاہ نظر آئیں گے۔ ایک اور عام فہم مثال خالی از دلچسپی نہ ہو گی۔ جب آپ کسی خاص رنگ کا کپڑا خریدنا چاہتے ہیں اور دوکاندار آپ کے حسب منشاء اس خاص رنگت کا کپڑا نہیں دکھا سکتا۔ یعنی فرض کیجئے کہ آپ ایک خاص قسم کے سرخ رنگ کا کپڑا چاہتے ہیں، دوکاندار مختلف وضع کے متعدد سرخ کپڑے پیش کرتا ہے جنھیں آپ بمقابلہ اپنے پسندیدہ رنگ کے اختلاف رنگ کے باعث ناپسند کرتے ہیں۔ چالاک دوکاندار ان حالات میں یک لخت سرخ کی بجائے شوخ سبز رنگ کے کپڑے دکھانے شروع کر دیتا ہے۔ آپ حیران ہوتے ہیں کہ سبز کپڑے ناحق دکھا رہا ہے۔ لیکن ان کے فوراً بعد جو سرخ پارچہ جات دکھائے جاتے ہیں ان کا رنگ اب آپ کی آنکھوں میں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سبز رنگ کے کپڑے دیکھتے ہوئے سرخ رنگ کے احساس والی نسوں کو ستانے کا موقع مل جاتا ہے اور سبز و سرخ کے تعامل سے جو کپڑے بوجہ ناقص رنگت پہلے غیر مرغوب تھے وہی اب پسند آ جاتے ہیں۔

طلبہ کو ان امور سے آگاہ کرنا اور اسی قسم کی متعدد مثالیں دے کر ابتدائی مسائل سمجھانا بہت نافع ثابت ہوتا ہے۔ طبیعیات کی ابتدائی تعلیم میں اس امر کی بیش از بیش ضرورت ہے کہ صرف عام فہم مثالیں طلبہ کے سامنے بکثرت پیش کی جائیں اور ایک ہی امر کی تشریح کے لئے متعدد تجربے دکھائے جائیں۔ انتخاب امثلہ میں موضوع کے دلچسپ تاریخی حالات اور روزمرہ زندگی میں اس کے مفید استعمالات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ طبیعیات بالخصوص اور سائنس بالعموم متمدن زندگی کے ہر ایک پہلو میں نمایاں حصہ لیتی ہے۔ اس لئے ایسی ایجادوں کا واضح بیان جو تعلیم گاہ کے معمل یا نزدیک کے مقامات میں دیکھی جا سکتی ہوں ہر حالت میں علمی دلچسپی کا محرک ثابت ہوگا۔

طبیعیات کی ابتدائی تعلیم کے لئے قندیل مناظر (Optical lantern) کے ذریعے سے مختلف مباحث کی توضیح بہت ہی مفید پائی گئی ہے۔ میجک لینٹرن کی ترقی یافتہ شکل، بائسکوپ یعنی آلہ تصاویر متحرک، تعلیم اطفال کو مفید و بار آور بنانے کے لئے بہت ہی موثر ہے۔

معلمین کو چاہیے کہ طلبہ کو حتی الامکان پیچیدہ مباحث کی الجھن سے الگ رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو سادہ باتیں عمدگی کے ساتھ ذہن نشین کرانے کی کوشش کریں۔ نیز بہت زیادہ تعداد میں متفرق امور کو ادھورے طور پر بتانے کی بجائے معدودے چند مسائل ٹھیک طور پر سمجھا دینا بدرجہا بہتر ہے۔ مثال کے لئے ایک دفعہ ہم پھر علم مناظر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ میں نے مختلف مدارس کی اعلیٰ جماعتوں کو

عملی امتحانِ سائنس لیتے ہوئے طلبہ میں یہ کمی محسوس کی ہے کہ وہ محدب عدسہ (Convex Lens) کے استعمال سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ معلمین ان کو عدسہ کی چھ بلکہ چھ سے زائد اقسام طوطے کی طرح خوب رٹوا دیتے ہیں، عدسہ میں سے انعطافِ نور کی توضیح کے لئے اُسے بے شمار مشورہائے مثلثی کا مجموعہ بھی یاد کروا دیتے ہیں لیکن بطور آتشی شیشہ یا سادہ خُردبین، اس کا استعمال شاذ ہی سمجھاتے ہیں۔ حالانکہ ہر ایک شوخ طالب علم کے پاس کم سے کم ایک لینز ضرور ہونا چاہیئے جس سے وہ اپنے دوستوں کے ہاتھ جلا سکے یا ان کے سیاہ کوٹوں میں سے دھوئیں کے بادل اڑا سکے۔ گھر میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو موم بتی کی غیر معمولی بڑی تصویر سفید دیواروں پر ڈال کر دکھا سکے یا گھڑی سازوں کی طرح ننھی ننھی اشیاء کو نمایاں طور پر دیکھ سکے۔

آتشی شیشہ یا سادہ خُردبین کے لئے کسی قیمتی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ برف کا ایک ٹکڑا یا بکری کی آنکھ کا عدسہ بہت کافی ہیں۔ صاف شفاف برف کے ایک ٹکڑے کو چھری سے کھرچ کر اور ہاتھ کی گرمی سے پگھلا کر، عدسہ کی شکل کا بنا لو اور سورج کی روشنی میں اس کی وساطت سے آگ جلانے کا تماشہ بچوں کو دکھا کر انھیں لینز کے استعمال کا گرویدہ بناؤ۔ مذبح سے بکری یا مینڈھے کی آنکھ میں سے عدسہ نکال کر اور کتاب کے اوپر رکھ کر حروف بڑے کرکے طلبہ کو دکھاؤ، پھر دیکھو کہ سائنس کی تعلیم کا وقت بچوں کے لئے کیسا خوشگوار اور سبق آموز بن جاتا ہے۔ برف یا بکری کی آنکھ میسر نہ ہو تو شیشے کے دو مقعر ٹکڑے، واچ گلاس لے کر ان کو گوند یا سیکوٹین سے جوڑ لو اور ان کے درمیان پانی بھر لو۔ پانی کا یہ محدب الطرفین عدسہ Biconvex lens شیشہ کے معمولی لینز کی مثل کام دے گا۔ اس کے ماسکہ (Focus) کے اوپر سورج کی مجتمع گرمی سے سیاہ اشیاء بآسانی جلائی جا سکتی ہیں اور بچوں کی تفریح اور تعلیم دونوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اس تجربے سے ضمناً یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورج کی گرمی ہوا، برف یا پانی میں کم جذب ہوتی ہے کیونکہ برف کے لینز سے چیزیں جلائی جا سکتی ہیں حالانکہ برف کا لینز اپنی حالت پر کم و بیش قائم رہتا ہے اور پانی کے عدسہ میں تپش پیما کے ذریعے سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ تپش چنداں متغیر نہیں ہوتی۔

ا ب ج س د

یہ امور نئے نہیں ہیں۔ ارسٹوفنیز Aristophanes نے ۴۲۴ ق۔م میں ایک ڈراما "بادلوں کی کامیڈی" لکھا تھا۔ اس میں دو اشخاصِ ڈراما حسب ذیل دلچسپ گفتگو کرتے ہیں:-

"کیا آپ نے دوائی فروش کی دوکان پر وہ شفاف پتھر دیکھا ہے جس سے آگ جلائی جاتی ہے؟"

"وہی نہ جسے شیشہ بھی کہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہی"

"اچھا تو پھر آپ اس شفاف پتھر سے کیا کام لیں گے؟"

جب میری طرف عدالت سے سمن آئے گا تو میں اس پتھر کو ہاتھ میں لے، سورج کے بالمقابل کھڑا ہو کر فاصلہ سے ہی اس کی تحریر کو پگھلا دونگا"

(واضح ہو کہ اس زمانہ میں تحریر کا طریقہ یہ تھا کہ کسی ٹھوس چیز کے اوپر موم کی ایک تہ پھیلا دی جاتی تھی اور اس کے اوپر عبارت کسی نوک دار چیز سے کھرچ دی جاتی تھی)

مشہور مورخ پلینی (Pliny) بھی شیشے کے کُروں کا ذکر کرتا ہے جن کو سورج کے سامنے رکھنے سے آگ پیدا کی جا سکتی تھی۔ اور اسی زمانہ ۳۰۳ء کے ایک اور مصنف لکٹینٹس (Lactantius) کا بیان ہے کہ شیشہ کے ایک کرہ میں پانی بھر کر سورج کے سامنے رکھنے سے، سردسے سرد موسم میں آگ جلائی سکتی ہے

طلبہ کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اس قسم کی عام فہم مگر سبق آموز تاریخی باتوں کا تذکرہ بہت ضروری ہے سکولوں کے معلمین سائنس کو چاہیئے کہ طبیعیات اور کیمیا کی درسی کتابوں کے علاوہ

۱- بکلے کی مختصر تاریخ علوم طبعی (Buckley's short History of natural science)
۲- گینو کا فلسفہ فطرت Ganot's natural philosophy
۳- علم الکیمیا کے کمالات مصنفہ جے سی فلپ Achievements of chemical science by. J. C. Phillip (Macmillan & co)
۴- علم الکیمیا بہ حیثیت خادم انسان مصنفہ فنڈلے Chemistry in the service of man by Findlay

وغیرہ وغیرہ دلچسپ اور آسان کتب کو بھی اپنے زیر مطالعہ رکھیں۔

طلباء سائنس کی مناسب تفریح کے لئے اوقاتِ فرصت میں علمی قصہ کہانیوں کا مطالعہ بہت ہی سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ سائنٹفک افسانے ابھی تک اُردو میں ناپید ہیں۔ میری نظر سے اس وقت تک کوئی سائنٹفک افسانہ یا کہانی بزبان اُردو نہیں گزری۔ سائنٹفک کہانیاں تو ایک طرف، اُردو میں سرے سے عام سائنٹفک کتب کا ہی قحط ہے (اس کمی کو پورا کرنے کے لئے، میں نے دو کتابیں تحفۂ سائنس اور بادل کے بچے یعنی سائنس کا ایک افسانہ شائع کی ہیں اور ارادہ ہے کہ بشرط فرصت سائنس کی اعلیٰ ایجادات اور جدید انکشافات مثلاً لاسلکی Wireless Telegraphy + Telephoney رانجن شعاعیں، عجائباتِ ریڈیم، جواہر کی ساخت Structure of the atom نظریہ نسبیہ Theory of Relativity وغیرہ کے متعلق، انشاء اللہ القوی عام فہم مضامین اور دلچسپ سائنٹفک کہانیوں کا ایک مجموعہ مرتب کروں) سائنٹفک افسانوں کے دوش بدوش سائنٹفک نظمیں بھی بہت ضروری ہیں۔ تفریح طبع کے لئے اس سے بڑھ کر شاید ہی اور کوئی مشغلہ مل سکتا ہے۔

اساتذہ کو چاہیئے کہ طلبہ کے ساتھ سہ پہر کے وقت سیر کے لئے باہر نکل جائیں۔ اور سبق آموز پیرایہ میں انھیں صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کا شوق دلائیں۔ ایسے سیروں میں نہ صرف "مطالعۂ فطرت" یا نیچر اسٹڈی، بلکہ طبیعیات کے مختلف شعبہ جات کے متعلق بھی قدم قدم پر مفید اور دلچسپ باتیں بتائی جا سکتی ہیں۔

معلمین سائنس کا فرض ہے کہ طلبہ کی قوت مشاہدہ کے مناسب نشو و نما کا خیال رکھیں۔ مشاہدات بعض اوقات کان کے ذریعے سے اور بعض اوقات ناک کے ذریعے سے کئے جاتے ہیں لیکن اکثر مشاہدات آنکھ کے ذریعے سے ہی صورت پزیر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ آنکھوں کے صحیح استعمال کا مسئلہ ہے۔ طلبہ کو سکھایا جائے کہ اپنے ماحول کو بامعان نظر دیکھنے کے عادی بنیں۔ اپنے گرد و پیش کی اشیاء اور حوادث کو بغور دیکھا کریں اور جہاں تک ممکن ہو بیدار مغز رہیں۔

ایک اور درخواست جو میں اساتذۂ سائنس سے کرنا چاہتا ہوں، طلبہ کی آزادانہ ذہنی ترقی کے متعلق ہے۔ ہونہار بچے بالعموم عجیب و غریب سوالات پوچھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ معلمین کو چاہیئے کہ سوالات پوچھنے کی اس نیک عادت کی حوصلہ افزائی کریں۔ کند ذہن بچے عام طور پر جماعت میں ساکت رہتے ہیں۔ شوخ اور تیز فہم بچے، بعض اوقات اپنے انوکھے سوالات سے استاد کی پریشانی کا باعث ہوتے ہیں یہ پریشانی آخرکار دونوں کے توسیع علم کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ لائق استاد ہونہار طلبہ کو بہت کم ڈانٹتے ہیں۔ علم کی شان یہ ہے کہ اگر کسی سوال کا صحیح جواب معلوم نہ ہو تو غلط سلط جواب دے کر دھوکا دینے یا سائل کو ڈانٹ کر مرعوب کرنے کی بجائے اپنی معذوری تسلیم کرے اور بعد ازاں تحقیق و تفتیش سے اس سوال کا صحیح جواب بہم پہنچائے۔

کلارک میکسویل، جو حکمائے انگلستان میں ایک ممتاز رتبہ رکھتا ہے، ۴ برس کی عمر میں اپنے باپ سے مختلف سوالات پوچھنے کا عادی تھا۔ اس کے باپ کا بیان ہے کہ جب میں تسلی بخش جواب دینے سے قاصر ہوتا تھا اور سطحی جواب دے کر ٹالنا چاہتا تھا تو کلارک میکسویل، دہرا کر اپنا سوال یوں پوچھا کرتا تھا "لیکن ابا جان اس بات کا خاص سبب کیا ہے؟"

طلبائے سائنس کی امتیازی خصوصیت، تحقیقات اور حق پرستی کے علاوہ استقلال اور ارادہ کی پختگی ہونا چاہیئے۔ اس بارے میں مادرِ ہند کے سپوت، ہندوستانی علمائے سائنس کے سرتاج سر ڈاکٹر جے سی بوز کے وہ شاندار الفاظ، جو انھوں نے ۳۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو بوز انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہے تھے، آپ صاحبان کے غور و تعمق کے لائق ہیں:-

"ذاتی اور عام حقانیت، جس کی یادگار میں یہ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جاتا ہے یہ ہے:-

جب کوئی فرد اپنے آپ کو کلیتہً کسی اہم مقصد کے لئے وقف کر دیتا ہے، بند دروازے کھل جاتے ہیں اور بظاہر ناممکن امور اس کے لئے ممکن بن جاتے ہیں"

طلبائے سائنس کو یکسوئی کے ساتھ مرکزی مقاصد ہمہ کی تکمیل میں کوشاں رہنا چاہیے اور اپنی محدود توانائی کو متفرق مشاغل میں لاطائل طور پر صرف نہیں کرنا چاہیے۔ (اسی ضمن میں مزید اشارات و توضیح کے لئے میں "سائنٹفک ایجوکیشن اینڈ انڈیاز نگلیکٹ آف سائنس" مصنفہ خود، اساتذہ اور طلبائے سائنس کے لئے موزوں خیال کرتا ہوں)

طبیعیات کی تعلیم میں ایک خاص امر جس کا لحاظ ازبس زیادہ ضروری ہے، سائنس کے مخصوص اسلوبِ تحقیقات کی تعلیم ہے۔ طلبائے سائنس کو بوضاحت معلوم ہونا چاہیے کہ تلاشِ حق کا بہترین طریقہ سائنٹفک طریقہ ہے۔ جو تمام تر واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔ سائنس کے قوانین اور نظریئے ہر حالت میں عقل اور واقعات کے تابع ہوتے ہیں اگر کوئی نظریہ واقعات سے سرِمو انحراف کرے تو وہ باطل سمجھا جاتا ہے اور اس میں ترمیم لازم آتی ہے۔ قوانین سائنس معلوماتِ انسانی کے مختصر لیکن جامع ومانع بیانات ہوتے ہیں جو نہ صرف معروف واقعات کی تشریح و توجیہہ کرسکتے ہیں بلکہ آئندہ ترقی کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

بعض اوقات تعلیمِ سائنس کو دہریت آموزی بلکہ بے دینی کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ غلط اتہام محض بے بنیاد ہے اور بے سمجھی پر مبنی ہے۔ میں اس موضوع پر اپنے خیالات ایک مضمون "تطبیق مذہب و سائنس" مطبوعہ حصہ سائنس کانفرنس گزٹ جولائی ۱۹۱۹ء میں بوضاحت پیش کر چکا ہوں (اور تمام ان اصحاب سے جو اس متنازعہ فیہ مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں بزور سفارش کرتا ہوں کہ اس مضمون کو نیز منظوم مکالمہ واعظ و طبیعی مطبوعہ کانفرنس گزٹ فروری ۱۹۱۹ء کو بغور پڑھیں۔ علاوہ ازیں میں متعدد مضامین انگریزی و اردو میں، زیرِ عنوان "سائنس اور اسلام" "مذہب و سائنس کی مخالفت یا مطابقت کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس لئے یہاں مختصراً اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ ایک سائنس داں اگر چاہے تو بہترین خداپرست اور موحد بن سکتا ہے۔ امرِ حق یہ ہے کہ ایک خوش خلق عالمِ سائنس کو صنعتِ کردگار سے واقف ہونے اور کارخانہ قدرت کی گوناگونی سے آگاہ ہونے کے بعد، سوائے توحید کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ میرے اس بیان کی تائید میں جمہور علمائے سائنس کی خداپرستانہ زندگیاں شاہدِ عادل ہیں۔ معلمین اور طلبائے سائنس کو متیقن رہنا چاہیئے کہ سائنس کی صحیح تعلیم سرچشمۂ ہدایت و معرفت ہے۔

سائنس کے فروغ کے لئے ایک ضروری امر یہ بھی ہے کہ طلبائے سائنس کو مسائل طبعیات اور علم کیمیا، انگریزی میں رٹوانے کی بجائے ان کی مادری زبان میں بوضاحت سمجھائے اور ذہن نشین کرلئے جائیں معلمین کی طرف سے پہلی کوشش ہونی چاہیئے کہ سبق یا لکچر کے موضوع کے اوپر کامل عبور حاصل کرلیں۔ کامل عبور کے لئے اصلی شرط سمجھ ہے نہ کہ بار بار پڑھنا یا بلند آہنگ الفاظ اور پیچیدہ مساواتوں کا استعمال۔ خود صحیح طور پر سمجھ لینے کے بعد مدرسین سائنس کو چاہیئے کہ سائنس کی تعلیم کو ایک زندہ چیز کی زندہ تعلیم بناکر دکھائیں۔ طلباء کے لئے سائنس ایک زندہ چیز جبھی ہوسکتی ہے جب ان کے سامنے سائنس کے استعمال اور ایجادوں کا تذکرہ عام فہم پیرایہ میں کیا جائے۔ اگر یہ نہیں تو مردہ سائنس ایک بے کار چیز ہے۔

علوم دو قسم کے ہوتے ہیں :- اول روشنی پھیلانے والے علوم دوم پھل دینے والے علوم۔ ہم چاہیں تو سائنس کی تعلیم سے روشنی بھی پھیلا سکتے ہیں اور پھل بھی حاصل کرسکتے ہیں لیکن سردست ہمارے ہاں کی ناقص تعلیم سائنس سے ایسے خوشگوار نتائج کی توقع رکھنا خیال خام ہے۔

اردو کی ترقی کے بغیر تعلیم سائنس کا فروغ ایک مشکل امر ہے۔ اگر طالب علم غیر زبان کے الفاظ، ان کے معانی اور بندشوں کی الجھن میں پھنسا رہے تو علمی خیالات اس کے دل و دماغ کو منور نہیں کرسکیں گے۔ جامعۂ عثمانیہ کی قابل قدر مثال، ہمیشہ مدرسین سائنس کے پیش نظر رہنی چاہیئے۔

"ہندوستان میں سائنس کا آفتاب ابھی تک اپنی پوری آب و تاب سے نہیں چمکا۔ ترقی یافتہ اقوام عالم کے مقابلہ میں ہم بلحاظ اپنی سائنٹفک پستی اور علمی تنزل کے کامل ایک صدی پیچھے ہیں۔ گلستان سائنس کے گوناگوں دلآویز مناظر، غیر زبانوں کی رکاوٹ کے باعث عوام الناس کی آنکھوں سے تا حال اوجھل ہیں۔

"مہذب اقوام کے دوش بدوش ہونے کے لئے اطراف ہند میں مملکت سائنس کی سرحد پر جماعات محققین، موجدین صناعین اور معلمین کے فروغ کی بیش از بیش ضرورت ہے۔ ان مقاصد عالیہ کے حصول کے لئے، علوم جدیدہ کی اشاعت اور توسیع و ترقی اردو کے لئے جس قدر کوشش کی جائے تھوڑی ہے ...... ابتدائے کار کے لئے سائنٹفک مباحث اور علمی مضامین کو بزبان اردو عام فہم بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ اپنی ملکی اور قومی زبان' اردو' کی علمی ترقی کے بغیر کسی قسم کی حقیقی ترقی محال ہے۔" (ماخوذ از دیباچہ تحفۂ سائنس مصنفہ فیروز الدین مراد)

ہر ایک سائنس داں کو رَبِّ زِدْنِی عِلْماً کا وظیفہ کرنا چاہیئے اور آیۂ قرآنی "مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً" کو پیش نظر رکھ کر غرور و کبر سے بچتے رہنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ اَیْنَمَا وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا اور خدائے بزرگ و برتر کا فرمان "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیْراً" ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔

خاتمہ پر میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں اور درگاہ رب العالمین سے دست بدعا ہوں کہ ہمیں نور ہدایت عطا فرمائے اور بحیثیت سائنس داں گمراہی سے بچائے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَآءِ کَمَا ھِیَ

لکچر نمبر ۳

علم کیمیا

از

ڈاکٹر قاسم علی منصوری صاحب بی اے ایم ایس سی پی ایچ ڈی ایف ایس سی
ممبر انسٹی ٹیوٹ آف میٹلز لندن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کش مکش زندگی فی زمانہ اس قدر کٹھن ہوتی جاتی ہے کہ بڑی بڑی قوموں کو اپنی زندگی عزت و آبرو سے گزارنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ آج کل انگلستان میں کئی لاکھ آدمی موجود ہیں جن کو کوئی مزدوری نہیں مل سکتی۔ اسی طرح امریکہ میں بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں اور ہندوستان میں تو ایسے لوگوں کی تعداد کا شمار ہی کیا ہو سکتا ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں مرد و عورت ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو بوجہ افلاس فاقہ کشی کی تکلیف سے ہر سال راہی ملک عدم ہو جاتے ہیں۔ کیا ہر روز ہر قصبہ اور گاؤں میں ہمیں بیسیوں ایسے نیم برہنہ مرد و عورت اور بچے نہیں ملتے جو بوجہ سردی سکڑتے پھرتے ہوں۔ کیا ایک مخلوق کی مخلوق ہندوستان میں ایسی نہیں ہے جو تمام عمر متلاشی روزگار پھرتی رہی اور تادم مرگ بھی انہیں ایسا کوئی کام نہ ملا جس سے ان کی اور ان کے بال بچوں کی زندگی عزت آبرو اور آزادی سے گزر سکے۔

اہل یورپ اور امریکہ نے مدت ہوئی اس مرض مہلک یعنی افلاس کی تحقیقات شروع کر دی تھی

اور اپنے اپنے ممالک کو آسودہ بنانے کے بہت سے طریقے نکالے تھے چنانچہ بہت سے ان طریقوں پر اب تک وہ کاربند ہیں اور اسی کو یورپ اور امریکہ کی ترقی کہا جاتا ہے جو تمام عالم کی آنکھوں میں ایک چکا چوند پیدا کئے ہوئے ہے۔ اس ترقی کو اکثر مادّی کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اہل یورپ کو اپنا افلاس دُور کرنے کے لئے اس دنیا کی چیزوں سے کام لینا پڑا اور انھوں نے انھیں اشیاء کے خواص معلوم کرکے ان کو اس قابل بنا لیا کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے کارآمد ثابت ہوں تاکہ ان کارآمد اشیاء کے ذریعے سے تجارت ہوسکے اور قوموں کا افلاس دُور ہو۔

اہل یورپ و امریکہ کا یہ نسخہ ایسا مفید ثابت ہوا کہ صرف تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ان کے افلاس کو دُور کردیا اور آج اسی کی بدولت یہ قومیں پچھلے جنگ یورپ کے بربادکن اثر کو دُور کرکے پھر متمول، فارغ البالی اور آزادی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور امن وامان سے اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ درحقیقت ہندوستان کے پچھلے چند سالوں کی کشمکش بھی صرف مالی مشکلات کی وجہ سے ہے اور ارباب حل وعقد کا محض جزیات کے ذریعے سے اس کو حل کرنا کبھی بھی سودمند نہ ہوگا۔

مگر شاید یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ جب کہ اس مادّی ترقی نے یورپ کے اخلاق کو بگاڑ دیا تو پھر یہ بنی نوع انسان کے لئے کیسے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سوال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دراصل یہ مادّی ترقی نہیں ہے جس نے اہل یورپ کے اخلاق کو بگاڑا ہو بلکہ وہی پُرانی بیماری تمول۔ یہ تمول کی بیماری ایسی مہلک ہے کہ اس نے اسلام جیسے پختہ مذہب کے پیروکاروں کو تقریباً صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا جس طرح ہمارے آبا واجداد اپنی ملک گیری کی تکمیل ترقی کے بعد مالدار ہوکر عیش وعشرت کی زندگی میں پڑ گئے اور اپنے تمام اخلاق اور پاک مذہب تک کو بھلا بیٹھے اسی طرح اہل یورپ بھی اب اسی چکر میں آ گئے ہیں اور دولت کی زیادتی کے باعث دنیا ومافیہا کو بھولتے جاتے ہیں۔ ورنہ غور کیا جائے تو یہ اسی مادّی ترقی کی بدولت تھا کہ انگلستان میں ملکہ وکٹوریا اور اس سے کچھ قبل کا زمانہ انگلستان کی تاریخ میں سنہری زمانہ خیال کیا جاتا ہے اور اسی طرح جرمنی، فرانس اور امریکہ کا قبل جنگ یورپ کا زمانہ جب کہ اس مادّی ترقی کی بدولت ان ممالک کا افلاس دُور ہوچکا تھا مگر اب تک ان میں اتنا تمول نہ پیدا ہوا تھا کہ تعیش کی زندگی میں پڑ سکیں پس یہ امر تو صاف ظاہر ہے کہ کسی قوم کے افلاس کو دُور کرنے کا بہترین طریقہ مادّی ترقی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں یہ تجربہ ہوچکا ہے اور وہ قومیں اب تک اس سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔

دوسرا طریقہ کسی قوم کی ترقی کا روحانی ہے۔ یعنی روح کو اس قدر قوی بنایا جائے کہ وہ ہر شئے کو اپنے تابع کرلے۔ مگر اس میں دقت یہ ہے کہ شارع کے بعد اس کی شریعت کی بہت سی تاویلیں ہونے لگتی

ہیں اور تمام مسائل ایسے خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ ان کے سلجھانے کی کوشش سوائے اس کے کہ انہیں اور اُلجھا دے اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ بے شک نبیوں کے مختلف زمانے میں قوموں کی کایا پلٹ ہوئی مگر اب نبی پیدا ہونے بند ہوگئے ہیں اور اب کوئی شخص اگر اس طریقے سے قوم کی درستی شروع کرتا ہے تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی جی اور جمعیتِ علما کی کوششوں کا وہ نتیجہ نہیں نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

پس مسلمانانِ ہند کے سامنے یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے کہ وہ اپنے روز افزوں افلاس کا کیا علاج نکالتے ہیں۔ اگر وہ اس اُمید پر بیٹھے رہیں کہ زمانہ خود اس کو حل کردے گا تو یہ افلاس بڑھکر جلد ہی اس حد تک پہنچ جائے گا کہ پھر مسلمانوں میں سکت بھی نہ رہے گی کہ اپنی فیصلہ شدہ تجویز پر کاربند بھی ہو سکیں۔ کیا قوم کی مالی حالت ہمارے سامنے موجود نہیں ہے کہ اکثر اوقات نہایت ضروری سے ضروری کاموں کے لئے اب بھی مسلمان کافی سرمایہ جمع نہیں کر سکتے اپنی مسلم یونیورسٹی کا بنارس ہندو یونیورسٹی سے ہی مالی حالت میں مقابلہ کیجئے یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ مسلمانوں کو اپنی یونیورسٹی سے محبت نہیں ہے۔ نہیں بلکہ ناداری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ

گر جاں طلبی مضائقہ نیست

ور زر طلبی سخن دریں ست

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ پریشان ہو جانے کا سرسید نے یہ علاج تجویز کیا تھا کہ وہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کریں تاکہ وہ سرکاری ملازمتوں میں حصہ لے سکیں۔ اس وقت اس تجویز سے نہایت عمدہ نتیجہ نکلا اور آج مسلمانوں میں جو سکت باقی ہے وہ دراصل اسی کی وجہ سے ہے مگر صرف سرکاری ملازمتیں کسی قوم کو متمول نہیں بنا سکتیں اور نہ ہر ایک تعلیم یافتہ شخص ان کو حاصل ہی کر سکتا ہے چنانچہ آج کل ہزاروں ایم اے اور بی اے مفلسی میں مبتلا ہیں اور تلاشِ روزگار میں دربدر مارے پھرتے ہیں۔ درحقیقت سرسید کا مشن اب پورا ہوگیا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے سے سرسیدؒ کا پیغام ہر گوشہ ملک میں پہنچ چکا ہے اور مسلمانوں میں انگریزی زبان کی تعلیم پھیلتی جاتی ہے مگر جہاں ہم سرسید کے پیغام کے ممنونِ احسان ہیں وہاں ہم اس کو ہمیشہ کے لئے اور قوم کے ہر درد کے لئے مکمل نسخہ تصور نہیں کرتے۔ بلکہ اگر آج سرسید زندہ ہوتے تو ہمارا یقین ہے کہ وہ اپنے نسخے میں خود ہی تبدیلی تجویز فرماتے۔

دنیا ہمیشہ ترقی کرتی رہتی ہے اور کسی قوم کا ایک جگہ پر ٹھیر جانا ہی اس کا تنزل کہلاتا ہے۔ دوسری قوموں نے اپنے افلاس کے دُور کرنے کے لئے جدید طریقے نکال لئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہندو بھائیوں نے کلکتہ میں سائنس کالج قائم کرلیا ہے جو تیس لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے شروع کیا گیا تھا اور بعد میں جس کے لئے اور بہت سا چندہ جمع ہوگیا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں بھی سائنس کی تعلیم کا نہایت عمدہ انتظام ہوگیا ہے اور صنعت و حرفت کی تعلیم بھی

وہاں شروع ہی سے جاری کی گئی ہے جاپان کی پچھلے چند برسوں کی حیرت انگیز ترقی بھی سائنس کی وجہ سے ہی اور جرمنی کی تمام چہل سالہ ترقی کا دارومدار صرف سائنس پر ہے۔ پچھلے جنگ یورپ نے درحقیقت دنیا کی آنکھیں کھولدی ہیں اور یورپ کے تمام ممالک اور امریکہ اب اس کوشش میں ہیں کہ جس علم کے ذریعے سے جرمنی نے اتنی حیرت انگیز ترقی اس سرعت کے ساتھ کرلی اس کی توسیع اپنے ہاں کیوں نہ کی جائے۔

ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے افلاس کو دُور کرنے کا بھی وہی ایک طریقہ ہوسکتا ہے جو دوسری قوموں نے اختیار کیا ہے اور جس پر وہ نہایت تیزی کے ساتھ کاربند ہوتی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ حصول علم سائنس ہے۔

پچھلے چار یا پانچ سال سے بذریعہ مسلم یونیورسٹی گزٹ ہم اس مسئلہ کو قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ قوم نے اس کی طرف اس قدر توجہ مبذول نہیں کی جس قدر کہ ضروری ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ مسلمان اپنے افلاس کا کوئی علاج ضرور تلاش کریں ورنہ جس طرح سرسید کی آواز کو سردمہری سے سن کر ہم انگریزی زبان کی تعلیم میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے اندیشہ ہے کہ اس وقت کی سردمہری ہمیں اس میدان ترقی میں بھی کہیں پیچھے نہ ڈال دے۔

ہماری ناچیز رائے میں تو مسلمانوں کے روز افزوں افلاس کا صرف یہی ایک علاج معلوم ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے دوش بدوش وہ بھی میدان ترقی میں آئیں اور علم سائنس اور صنعت وحرفت سے اپنے افلاس کو دُور کریں۔ اتنا وقت تو ہمارے پاس آج نہیں ہے کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر ہم اسی وقت روشنی ڈال سکیں اور بتلاسکیں کہ علم سائنس کے ہر شعبہ میں عملی طور پر ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ البتہ علم سائنس کی صرف ایک شاخ سے ہم بحث کرسکتے ہیں جو اس علم اور تمام صنعت وحرفت کی بنیاد ہے۔ یہ علم، علم کیمیا کہلاتا ہے اور ہمارے آباو اجداد نے اس کے ترقی دینے میں جو کوشش کی ہے وہ جابر بن حیام، علی بن ایدر اور بوعلی سینا جیسے گرامی ناموں اور ان کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ مگر آج ہماری پست ہمتی کا یہ عالم ہے کہ اس ضروری علم کو ہم نے یہ کہکر پس پشت ڈال دیا ہے کہ

کیمیا و سیمیا و ریمیا
کس داند جز بذاتِ اولیا

ہمارے چند ہوسین صرف اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ تانبے کو سونا کس طرح بنایا جائے۔ مگر آپ ملاحظہ فرمائیے کہ یورپ کے سائنس داں اس علم کے ذریعے سے مٹی کو سونا کس طرح بناتے ہیں۔

تجربہ (۱) ایک شیشہ کی نلی میں کچھ خالص گندھک کا تیزاب لو اور اس میں دو تین چٹکی معمولی مٹی ڈال کر گرم کرو اس کے بعد اس میں چولھے کی معمولی راکھ ڈالتے جاؤ حتیٰ کہ بلبلے اٹھنے بند ہو جائیں۔

صاف محلول کو تقطیر کرکے دھوپ میں یا آگ پر خشک کرو۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت سی قلمیں محلول کے خشک ہونے کے بعد باقی رہ جائیں گی۔ ان کو چکھنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خالص پھٹکری ہے۔ اب اس کو بیچ کر سونا حاصل کر لیجئے اسی طریقے سے یہاں ہندوستان میں بھی انگریزی کمپنیاں ہر سال ہزاروں من مٹی سے سونا بناتی ہیں کیونکہ ان کی ہزاروں من پھٹکری بڑے بڑے واٹر ورکس میں پانی صاف کرنے کے کام آتی ہے۔

تجربہ (۲) ایک شیشہ کی نلی میں سیسہ کا محلول لو اور اس میں معمولی سوڈے کا محلول ملا دو۔ جو سفید سفوف بنے وہ وہی ولایتی سفیدا ہے جو ہزاروں من کی مقدار میں پینٹ بنانے کے کام آتا ہے۔

تجربہ (۳) اسی طرح سیسہ کے محلول میں پوٹاسیم بائی کرومیٹ یا کرومیٹ کا محلول ملا دو۔ یہ زرد رنگ بھی ہزاروں من ہر سال ہندوستان میں آکر فروخت ہوتا ہے

تجربہ (۴) یہ زرد رنگ بیریم کے محلول اور پوٹاسیم بائی کرومیٹ یا کرومیٹ کے ملانے سے بھی بنتا ہے۔

تجربہ (۵) لوہے کے محلول میں جو معمولی زنگ کو نمک کے تیزاب میں حل کرنے سے بنتا ہے پوٹاسیم فیرو سائینائڈ ملا لو۔ جو نیلا رنگ حاصل ہو یہ پرشین بلو کہلاتا ہے اور عام روزمرہ کے استعمال کی روشنائی بنانے اور مختلف قسم کے نیلے رنگ بنانے کے کام آتا ہے۔

تجربہ (۶) اسی لوہے کے محلول میں امونیا ملا لو۔ یہ بھورا رنگ بڑی مقدار میں روزمرہ آپ کا فرنیچر رنگنے کے کام آتا ہے۔

تجربہ (۷) معمولی توتیئے کے محلول میں پوٹاسیم فیرو سائی نائڈ ملانے سے نہایت خوش نما کتھئی رنگ بنتا ہے۔

تجربہ (۸) پارے کے محلول میں پوٹاسیم آئی ڈائڈ ملانے سے نہایت عمدہ سرخ رنگ بنتا ہے جو چینی سیندور کے نام سے بہت بکتا ہے۔

تجربہ (۹) منگنیز کے محلول میں امونیم سلفائڈ ملانے سے گلابی رنگ بنتا ہے۔

تجربہ (۱۰) کرومیم کے محلول میں امونیا ملانے سے آسمانی رنگ بنتا ہے۔

یہ تمام رنگ بڑی مقدار میں پینٹ اور وارنش بنانے کے کام آتے ہیں ان کو صرف السی کے تیل میں ملا لیا جاتا ہے اور اس کو پتلا کرنے کے لئے تارپین کا تیل ملا دیتے ہیں۔

کیا یہ علم کیمیا کا کرشمہ اس قابل نہیں ہے کہ مسلمانانِ ہند کے افلاس کو دور کر سکے کیا اسی کی بدولت ہمارا کروڑوں روپیہ ممالک غیر کو نہیں چلا جاتا؟ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ مفصلہ بالا ہر دوا خود بہت سے

کام آتی ہے اور ہزاروں قسم کی روزمرّہ کے استعمال کی اشیا اسی طرح ادویات کے ملانے سے بن سکتی ہیں۔ علم کیمیا کے ذریعہ سے ہم یہ تمام ادویات اور کارآمد اشیا بنا سکتے ہیں۔ اپنے کچّے مال کو جو ہم دوسرے ممالک میں کوڑیوں کے مول فروخت کرتے ہیں خود استعمال کے قابل بنا کر تجارت کر سکتے ہیں پھر بتلایئے کہ آپ کی دولت آپ کے پاس رہتی ہے یا نہیں۔ غرض علم کیمیا ہی وہ علم ہے جس کو موجودہ تمدن کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ تمام اشیا جو ہماری نظر سے گزرتی ہیں ان کی ساخت میں کیمیاداں کا ہاتھ کہیں نہ کہیں ضرور رہتا ہے۔ بلکہ یورپ کے اصحاب حل وعقد کا تو یہ مقولہ ہے کہ کسی ملک کے تمدن کی حالت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہاں گندھک کا تیزاب کس قدر بنتا ہے کیونکہ اس تیزاب سے ہی اکثر ادویات بنائی جاتی ہیں جو تمدن کی دیگر اشیا، بنانے کے کام آتی ہیں۔

پس ان تجارب اور دلائل سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اس زمانہ میں زندہ رہنے کے لئے علم کیمیا کس قدر ضروری ہے اور جو قوم اس علم کو اپنے ہاں رواج دینے میں سرد مہری سے کام لے وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے آپ کو کہاں پائے گی۔ اب یہ عرض کرنا باقی رہ گیا کہ آخر اس علم کو کس طرح حاصل کیا جائے اور اس کی صحیح تعلیم کے لئے مسلمانان ہند کو کیا انتظام کرنا چاہیئے۔ سب سے ضروری امر یہ ہے کہ اس کا انتظام صحیح قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں دیا جائے۔ یعنی ایسے لوگ جو اس علم سے اچھی واقفیت بھی رکھتے ہوں اور مسلمانوں کی حالت سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ پہلو میں دردمند دل بھی رکھتے ہوں۔ ورنہ نتیجہ وہی نکلے گا جو اب تک نکل رہا ہے۔ یعنی یہ علم ہم کو ایسے ہاتھوں سے پہنچتا ہے جو ہمارے ملک کی حالت سے واقف نہیں ہیں اور اسی وجہ سے اپنی لاعلمی کے باعث ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے بلکہ بعض وقت اُلٹا نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تیار کردہ نصاب پر عمل کرنے سے جو ایم ایس سی بی ایس سی ہماری قوم میں پیدا ہوئے ہیں وہ بالکل بے کار ثابت ہوئے ہیں۔ جب صحیح قسم کے آدمی مل جائیں تو اس تعلیم کا تمام کام ان کے سپرد کر دینا چاہیئے اور اگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے تو قوم براہ راست ان سے باز پرس کرے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بغیر مصالح کے کوئی معمار بھی عمارت کھڑی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر قوم نے اس کام کو بہترین سے بہترین شخصوں کے بھی سپرد کیا اور پھر سرد مہری اختیار کر لی تو حسب سابق کچھ بھی نتیجہ نہ نکلے گا۔ یہ دوڑ جس میں دوسری قومیں کروڑوں روپیہ لگا رہی ہیں کوئی آسان دوڑ نہیں ہے کیسا ہی شہسوار ہو بغیر اچھے گھوڑے کے اس گھڑ دوڑ کو نہیں جیت سکتا۔ البتہ اگر تمام قوم کی قوم اپنے روز افزوں افلاس کی بیماری کو پہچان لے اور اس کے علاج کے لئے کسی قیمت کو گراں نہ سمجھے تو آسانی سے اس تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔

اب اگر فرض کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو ایسے صحیح قسم کے آدمی بھی دستیاب ہو جائیں جو ان کی خدمت کے لئے آمادہ ہوں اور مسلمان بھی ان کے لئے کسی نہ کسی طرح اپنی کوشش سے ایک اسپ تازی بھی مہیا کر دیں تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ اس دوڑ کو جیتنے کے لئے عملی طور پر کیا کرنا ہو گا۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ اپنے چند ماہران علم سائنس اور چند ماہران تعلیم و بزرگان قوم کی ایک جماعت مقرر کی جائے جس کے رکن پانچ یا چھ سے تعداد میں زیادہ نہ ہوں۔ یہ جماعت تمام قوم کی تعلیمی حالت کو دیکھے اور پھر اس کے حسب حال سائنس کی تعلیم کو رواج دینے کے لئے ایک نصاب تعلیم مرتب کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ جیسا کہ اب ہو رہا ہے اعلیٰ جماعتوں میں اس علم کو شروع کرنے سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ ابتدائی مسئلوں کے سوا ہم طالب علموں کو کچھ اور سکھا سکیں چنانچہ ہمارے ایم۔ ایس سی بھی اتنا ہی سیکھ سکتے ہیں جتنا جرمنی کے جمنیزیم یعنی انٹرمیڈیٹ کالجوں میں سکھایا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ جرمنی اور یورپ کے دیگر ممالک میں سائنس کی تعلیم سکولوں کی ادنیٰ جماعتوں سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور وہاں کے طالب علموں کو ہم سے کہیں زیادہ وقت اس علم کے سیکھنے کا ملتا ہے جس کی وجہ سے جب وہ یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس قابل ہوتے ہیں کہ تحقیق و تدقیق کا کام شروع کر سکیں۔ ہمارے یہاں تحقیقات کے کام کا کہیں نام و نشان بھی نہیں یہاں تک کہ ہمارے پروفیسر بھی بوجہ ابتدائی تعلیم کے کام میں مصروف رہنے کے اعلیٰ تعلیم کی طرف کبھی توجہ بھی نہیں دے سکتے۔ یورپ کے مصنفوں کی چند کتابیں ہمارا نصاب ہے اور ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ ان کو کسی نہ کسی طرح حفظ کر کے امتحان پاس کر لیا کریں۔ اب غور فرمائیے کہ ایسے مردہ سائنس کی تعلیم سے کسی قوم میں زندگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

اس مرض کو دور کرنے کے لئے ہمارے لئے بھی یہ نہایت ضروری ہے کہ اسکولوں کی ادنیٰ جماعتوں سے علم سائنس کی تعلیم کو شروع کر دیں۔ مگر بڑی دقت اس کے لئے یہ ہے کہ ہماری زبان میں علم سائنس کی کتب کا ذخیرہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو غیر زبان کے ذریعے سے کوئی مضمون ہرگز نہیں سکھلایا جا سکتا۔ چند صوبہ جات مثلاً صوبہ پنجاب وغیرہ میں اسکولوں کی ادنیٰ جماعتوں میں سائنس کی تعلیم کے جو نصاب بنائے گئے ہیں وہ انگریزی کتب کے ترجمے ہیں۔ اول تو وہ ترجمے ہی اس قدر بھدے ہیں کہ ان سے طالب علموں کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا دوسرے جن کتب کے وہ ترجمے کئے گئے ہیں وہ انگلستان کے بچوں کے لئے لکھی گئی تھیں چنانچہ جو چیزیں انگلستان میں روزمرہ گھروں میں کام آتی ہیں ان کے ذریعے سے سائنس کے مسائل وہاں کے بچوں کے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ ہمارے بچے ان اشیا کے نام سے بھی ناآشنا۔ اپنا تمام وقت ان ناموں کے یاد کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اور اس نام یاد کر لینے کو علم سائنس خیال کر لیتے ہیں۔ مثلاً سریت حرارت کے مسئلہ کو سمجھانے کے لئے یہ بیان ہوتا ہے کہ ایک پوکر لو اور اس کے ایک سرے کو گرم کرو وغیرہ وغیرہ۔ اب پوکر ایک ایسی چیز ہے جو انگیٹھی میں آگ ہلانے کے لئے انگلستان میں ہر وقت کام آتی ہے مگر ہندوستان میں کوئی اس کو جانتا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے اس مترجمہ نصاب سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ پھر یہی نصاب آگے چل کر انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ غرض ایک اچھا خاصا گورکھ دھندا ہے کہ اس سے چھٹکارا

حاصل کرنا کبھی نصیب ہی نہیں ہوتا۔ اس اصول پر کاربند ہونے سے اور اس قسم کے مترجمہ نصاب سے تعلیم دینے سے ایک اور بہت بڑا نقصان ہمیں پہنچ رہا ہے اور وہ یہ کہ کیمیا جیسے ضروری علم کی اصطلاحات کا باوجود برسوں کی کوشش کے اب تک کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے تقریباً ہر سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں اس مسئلہ پر شد و مد کے ساتھ بحث سنتا چلا آیا ہوں لیکن اب تک اس کا نتیجہ کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ اب تک ہم اس توقع میں بیٹھے ہیں کہ کس طرح یہ ترجمہ ہو اور کب ہم اس کو اپنے اسکولوں کے نصاب میں شامل کریں مگر میری ناچیز رائے میں یہ توقع بالکل بے سود ہے۔ علم کیمیا کی بہت سی اصطلاحات کا مناسب ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے اصول بنائے جائیں جن کے ماتحت سب اشیا کے نام بن سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نام ہمارے لئے اور نیز تمام دنیا کے لئے بالکل نئے ہوں گے اور جو دقت ہمیں اشیا کے انگریزی نام سیکھنے میں ہوتی ہے وہی ان نئے غیر مانوس ناموں کے سیکھنے میں ہو گی۔ کیونکہ یہ عربی یا فارسی سے مشتق شدہ الفاظ انگریزی الفاظ سے کچھ کم مشکل نہ ہوں گے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے ایک اور دقت کا اندیشہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بھائی ہندو ہمارے عربی اور فارسی کے الفاظ کو مشکل سے اپنے ہاں مستعمل کریں گے اور ان کو سنسکرت کے اصولوں سے بنانے کی کوشش کریں گے۔ پس ملک میں کم سے کم دو قسم کی اصطلاحات سائنس رائج ہو جائیں گی نہ مسلمان ہندوں کے سائنس کو سمجھیں گے اور نہ ہندو مسلمانوں کے اور یہ تمام الفاظ خواہ ہندوانی ہوں یا مسلمانی تمام دنیا کی اصطلاحات سے نرالے ہوں گے اس وجہ سے ہم دنیا سے لین دین بھی آسانی سے نہ کر سکیں گے۔ فرض کیجئے ہائڈروجن کا نام مسلمان تو مارے سے مایہ رکھ لیں اور ہندو جل سے جلیہ اور اب ایک مسلمان ہائڈروجن ایک بنیہ خریدنے نکلے تو اس کو کوئی ہندو دوکاندار نہ سمجھ سکے گا۔ اور اگر وہ یہ چاہے کہ یورپ یا امریکہ سے اس کو منگائے تو وہاں سوداگر بھی اس کو نہ سمجھ سکیں گے۔ غرض مسلمان تمام دنیا سے علیحدہ ہو کر اور اپنے گھر میں مقفل ہو کر بیٹھ رہیں گے۔

علم کیمیا کی اصطلاحات کے ترجمہ کی ان پیچیدگیوں کی وجہ سے اب تک یہ ضروری اور کارآمد علم ہمارے اسکولوں کے نصاب میں شامل نہیں کیا جا سکا ہے اور نہ کبھی شامل ہو سکتا ہے جب تک کہ قوم تمام امور کو مدنظر رکھ کر کسی عملی نتیجے پر نہ پہنچ جائے۔

ہماری ناچیز رائے میں تو اس کا قدرتی حل یہی ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ جب کوئی قوم کسی علم کو کسی دوسری قوم سے لیتی ہے تو تمام اصطلاحات کو اسی طرح لے لیتی ہے جیسا کہ اس قوم نے وضع کئے ہوں۔ چنانچہ اہل یورپ نے جب علم کیمیا کو مسلمانوں سے لیا تو اس کے ساتھ اس کے الفاظ مثلاً الکحل، القلی وغیرہ بھی ان سے لے لئے اور اپنی زبان میں داخل کر لئے۔ اسی طرح آج کل الومنیم، پوٹاش، سوڈا وغیرہ الفاظ ہماری زبان میں خود بخود

داخل ہوچکے ہیں اور داخل ہوتے جاتے ہیں اب یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ان تمام الفاظ کو جو ہندو مسلمان۔ عیسائی سب میں رائج ہوگئے ہیں نکال کر ان کی جگہ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہی چنے۔ ہمیں یہ چاہیئے کہ جیسا کہ یورپ و امریکہ نے کیا ہے اور اہل جاپان و مصر اور دیگر ممالک اب کر رہے ہیں جو الفاظ ہماری زبان میں موجود ہیں ان کو برقرار رکھیں۔ مثلاً تانبہ، سونا، چاندی، گندھک وغیرہ کی جگہ انگریزی الفاظ جاری کرنا غیر ضروری ہے۔ لیکن الومینیم میگنیشیم ریڈیم وغیرہ جن کے لئے ہماری زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں انھیں ویسے ہی اپنی زبان میں داخل کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فوراً علم کیمیا ہمارے اسکولوں کے نصاب میں شامل ہوسکے گا بلکہ کچھ اعلیٰ جماعتوں میں بھی ایسے نصاب سے جس میں صرف چند اشیا کے نام تو انگریزی ہوں لیکن تمام عبارت ملک کی اپنی زبان میں بیحد فائدہ ہوگا۔ ایسے نصاب کی ترتیب میں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ صرف غیر زبان کی کتابوں کا ترجمہ نہ ہو بلکہ ملک کے مذاق کے مطابق اول ابتدائی جماعتوں میں تجربوں کے ذریعے سے صرف واقعات کے سمجھنے پر زور دیا جائے اور صرف کیمیاوی اصولوں سے بحث ہو اور یہ نہ کیا جائے جیسا کہ موجودہ نصاب میں پایا جاتا ہے کہ طلبا رات دن چند اصطلاحات مثلاً ایٹم، مالیکیول وغیرہ کی تعریفیں یاد کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور سب سے قابل وہ طالب علم خیال کیا جاتا ہے جو ان تعریفوں کو حرف بحرف امتحان کے پرچے میں لکھ سکے۔ سائنس کی تعلیم کا یہ طریقہ نہایت غلط ہے۔ علم سائنس ایک زندہ علم ہے اور اس کا ہر ایک اصول تجربے کے ذریعے سے سمجھایا جاسکتا ہے جو طلبا آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ دکھلانا ہو کہ کیمیاوی مرکبات کس طرح بنتے ہیں اور ان کے کیا معنی ہیں تو اس کو اس طرح پر آسانی سے ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے کہ

تجربہ ۔ لوہے کے نہایت باریک تار کو دیکھو اور اس کو وزن کرلو۔ پھر اس کو جلاکر دیکھو۔ جلا ہوا تار لوہے سے بالکل مختلف ہوگا اور اس کا وزن زیادہ ہوگیا ہوگا۔ اسی کو زنگار کہتے ہیں اور یہ لوہے اور آکسیجن کا مرکب ہے۔

اس سے چھوٹی جماعتوں کو صرف قدرت کے واقعات کا مشاہدہ کرایا جائے۔ مثلاً بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے بارش کس طرح ہوتی ہے وغیرہ۔

تجربہ ۔ مخراج الہوا سے ایک شیشہ کے ظرف کی ہوا بہت تیزی سے خارج کردو۔ شیشہ میں بخارات آبی منجمد ہوکر بادل کی شکل میں نظر آئیں گے اب اگر ان کو سردی پہنچائی جائے تو وہ اور بھی بھاری ہوکر نیچے گر پڑیں گے اور بارش ہونے لگے گی یہی اصول بادلوں اور بارش کا ہے۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ سائنس کی تعلیم کا انتظام بوجہ آلات وغیرہ بہت گراں ہوجاتا

حاصل کرنا کبھی نصیب ہی نہیں ہوتا۔ اس اصول پر کار بند ہونے سے اور اس قسم کے مترجمہ نصاب سے تعلیم دینے سے ایک اور بہت بڑا نقصان ہمیں پہنچ رہا ہے اور وہ یہ کہ کیمیا جیسے ضروری علم کی اصطلاحات کا باوجود برسوں کی کوشش کے اب تک کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے تقریباً ہر سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں اس مسئلہ پر شد و مد کے ساتھ بحث سنتا چلا آیا ہوں لیکن اب تک اس کا نتیجہ کچھ بھی بر آمد نہیں ہوا۔ اب تک ہم اس توقع میں بیٹھے ہیں کہ کس طرح یہ ترجمہ ہو اور کب ہم اس کو اپنے اسکولوں کے نصاب میں شامل کریں مگر میری ناچیز رائے میں یہ توقع بالکل بے سود ہے۔ علم کیمیا کی بہت سی اصطلاحات کا مناسب ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے اصول بنائے جائیں جن کے ماتحت سب اشیا کے نام بن سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نام ہمارے لئے اور نیز تمام دنیا کے لئے بالکل نئے ہوں گے اور جو دقت ہمیں اشیا کے انگریزی نام سیکھنے میں ہوتی ہے وہی ان نئے غیر مانوس ناموں کے سیکھنے میں ہوگی۔ کیونکہ یہ عربی یا فارسی سے مشتق شدہ الفاظ انگریزی الفاظ سے کچھ کم مشکل نہ ہوں گے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے ایک اور دقت کا اندیشہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بھائی ہندو ہمارے عربی اور فارسی کے الفاظ کو مشکل سے اپنے ہاں مستعمل کریں گے اور ان کو سنسکرت کے اصولوں سے بنانے کی کوشش کریں گے۔ پس ملک میں کم سے کم دو قسم کی اصطلاحات سائنس رائج ہو جائیں گی نہ مسلمان ہندوؤں کے سائنس کو سمجھیں گے اور نہ ہندو مسلمانوں کے اور یہ تمام الفاظ خواہ ہندوانی ہوں یا مسلمانی تمام دنیا کی اصطلاحات سے نرالے ہوں گے اس وجہ سے ہم دنیا سے لین دین بھی آسانی سے نہ کر سکیں گے۔ فرض کیجئے ہائڈروجن کا نام مسلمان تو مارے سے مایہ رکھ لیں اور ہندو جل سے جلیہ اور اب ایک مسلمان ہائڈروجن ایک بیبہ خریدنے نکلے تو اس کو کوئی ہندو دوکاندار نہ سمجھ سکے گا۔ اور اگر وہ یہ چاہے کہ یورپ یا امریکہ سے اس کو منگائے تو وہاں سوداگر بھی اس کو نہ سمجھ سکیں گے۔ غرض مسلمان تمام دنیا سے علیٰحدہ ہو کر اور اپنے گھر میں مقفل ہو کر بیٹھ رہیں گے۔

علم کیمیا کی اصطلاحات کے ترجمہ کی ان پیچیدگیوں کی وجہ سے اب تک یہ ضروری اور کار آمد علم ہمارے اسکولوں کے نصاب میں شامل نہیں کیا جا سکا ہے اور نہ کبھی شامل ہو سکتا ہے جب تک کہ قوم تمام امور کو مدنظر رکھ کر کسی عملی نتیجے پر نہ پہنچ جائے۔

ہماری ناچیز رائے میں تو اس کا قدرتی حل یہی ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ جب کوئی قوم کسی علم کو کسی دوسری قوم سے لیتی ہے تو تمام اصطلاحات کو اسی طرح لے لیتی ہے جیسا کہ اس قوم نے وضع کئے ہوں۔ چنانچہ اہل یورپ نے جب علم کیمیا کو مسلمانوں سے لیا تو اس کے ساتھ اس کے الفاظ مثلاً الکحل، القلی وغیرہ بھی ان سے لئے اور اپنی زبان میں داخل کر لئے۔ اسی طرح آج کل الومنیم، پوٹاش، سوڈا وغیرہ الفاظ ہماری زبان میں خود بخود

داخل ہو چکے ہیں اور داخل ہوتے جاتے ہیں اب یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ان تمام الفاظ کو جو ہندو مسلمان۔ عیسائی سب میں رائج ہو گئے ہیں نکال کر ان کی جگہ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہی چنے۔ نہیں یہ چاہیئے کہ جیسا کہ یورپ و امریکہ نے کیا ہے اور اہل جاپان و مصر اور دیگر ممالک اب کر رہے ہیں جو الفاظ ہماری زبان میں موجود ہیں ان کو برقرار رکھیں۔ مثلاً تانبہ، سونا، چاندی، گندھک وغیرہ کی جگہ انگریزی الفاظ جاری کرنا غیر ضروری ہے۔ لیکن الومنیم میگنیسیم ریڈیم وغیرہ جن کے لئے ہماری زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں انھیں ویسے ہی اپنی زبان میں داخل کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فوراً علم کیمیا ہمارے اسکولوں کے نصاب میں شامل ہو سکے گا بلکہ کچھ اعلیٰ جماعتوں میں بھی ایسے نصاب سے جس میں صرف چند اشیا کے نام تو انگریزی ہوں لیکن تمام عبارت ملک کی اپنی زبان میں بیحد فائدہ ہوگا۔ ایسے نصاب کی ترتیب میں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ صرف غیر زبان کی کتابوں کا ترجمہ نہ ہو بلکہ ملک کے مذاق کے مطابق اول ابتدائی جماعتوں میں تجربوں کے ذریعے سے صرف واقعات کے سمجھنے پر زور دیا جائے اور صرف کیمیاوی اصولوں سے بحث ہو اور یہ نہ کیا جائے جیسا کہ موجودہ نصاب میں پایا جاتا ہے کہ طلبا رات دن چند اصطلاحات مثلاً ایٹم، مالیکیول وغیرہ کی تعریفیں یاد کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور سب سے قابل وہ طالب علم خیال کیا جاتا ہے جو ان تعریفوں کو حرف بحرف امتحان کے پرچے میں لکھ سکے۔ سائنس کی تعلیم کا یہ طریقہ نہایت غلط ہے۔ علم سائنس ایک زندہ علم ہے اور اس کا ہر ایک اصول تجربے کے ذریعے سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ جو طلبا آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ دکھلانا ہو کہ کیمیاوی مرکبات کس طرح بنتے ہیں اور ان کے کیا معنی ہیں تو اس کو اس طرح پر آسانی سے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے کہ

تجربہ ۔ لوہے کے نہایت باریک تار کو دیکھو اور اس کو وزن کرلو۔ پھر اس کو جلا کر دیکھو۔ جلا ہوا تار لوہے سے بالکل مختلف ہوگا اور اس کا وزن زیادہ ہو گیا ہوگا۔ اسی کو زنگار کہتے ہیں اور یہ لوہے اور آکسیجن کا مرکب ہے۔

اس سے چھوٹی جماعتوں کو صرف قدرت کے واقعات کا مشاہدہ کرایا جائے۔ مثلاً بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے بارش کس طرح ہوتی ہے وغیرہ۔

تجربہ ۔ مخراج الہوا سے ایک شیشہ کے ظرف کی ہوا بہت تیزی سے خارج کر دو۔ شیشہ میں بخارات آبی منجمد ہو کر بادل کی شکل میں نظر آئیں گے اب اگر ان کو سردی پہنچائی جائے تو وہ اور بھی بھاری ہو کر نیچے گر پڑیں گے اور بارش ہونے لگے گی یہی اصول بادلوں اور بارش کا ہے۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ سائنس کی تعلیم کا انتظام بوجہ آلات وغیرہ بہت گراں ہو جاتا

ہی جو بار عام پبلک اسکول برداشت نہیں کرسکتے۔ مگر درحقیقت سائنس کی تعلیم کے گراں ہوجانے کی وجہ اکثر ہمارے سائنس ماسٹروں کی ناواقفیت ہوتی ہے اور ایک بڑی حد تک وہ نصاب جو یورپ سے منگاکر ہم نے اپنے اسکولوں میں جاری کیا ہے۔ اول تو ایسے نصاب میں جو تجربے ہیں وہ جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ہے صرف یورپ کیلئے مناسب ہیں کیونکہ جو چیزیں عام یورپین گھروں میں آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں ان کی مدد سے وہ تجارب دکھلائے گئے ہیں۔ ہمارے سائنس ماسٹر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بغیر ان چیزوں کی مدد کے یہ تجربے ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ کسی تجربے کے دکھلانے کا پورا سامان ولایت سے منگواتے ہیں۔ مثلاً پوکر۔ فرائی پان وغیرہ اور پھر یہ اشیاء ایسی دوکانوں سے خریدی جاتی ہیں جو سائنس کا سامان مہیا کرنے کی دوکانیں کہلاتی ہیں۔ ان دوکانوں کی قیمت عام بازار کی قیمت سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ہمارے سائنس ماسٹر زرا توجہ سے کام لیں تو غور کرسکتے ہیں کہ بجائے پوکر کے وہ اسی تجربہ کو ایک لوہے کی سیخ سے دکھلا سکتے ہیں اور بجائے فرائی پان کے لوہے کا کڑھیا استعمال کرسکتے ہیں جو آسانی سے ان کے اپنے شہر میں نہایت کم قیمت پر دستیاب ہوسکتے ہیں۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ صحیح قسم کے سائنس ماسٹروں اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے آدمی پیدا کرنے کا کیا انتظام کیا جائے۔ اول تو جب موجودہ ترجمہ شدہ نصاب کا سلسلہ ختم ہوجائے گا اور اس کی جگہ قوم کے حسب حال اور مذاق کے مطابق نصاب بنایا جائے گا جس میں بتدریج چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے مسئلوں تک ترقی ہوگی اور جیساکہ اب ہو رہا ہے وہی ایک بات مختلف زبانوں کے ذریعے سے بار بار نہ پڑھائی جائے گی، تو ظاہر ہے کہ علم سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی ہمارے پاس وقت نکل سکے گا۔ اب میری ناچیز رائے میں اس کام کے لئے اور اس قسم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے قوم ایک مرکزی درسگاہ قائم کرے جہاں قوم کے بہترین سائنس دان موجود ہوں اور جہاں ہر قسم کی لبورٹیریاں اور کتب خانے ہوں تاکہ ہر قسم کا علمی اور عملی کام ہوسکے اور اصول تعلیم سائنس بنائے جاسکیں۔ ایسی درسگاہ ایک نمونہ ہوگی جس میں ہر قسم کی چیزیں موجود ہونگی۔ تاکہ ہر ایک شخص خواہ وہ کارخانہ دار ہو یا مزدور، اسکول ماسٹر ہو یا طالب علم وہاں آکر بچشم خود چیزوں کو دیکھ سکے اور اپنی مشکلات کو دُور کرسکے۔ میرے خیال میں تمام قوم کے لئے فی الحال صرف ایک ایسی بڑی درسگاہ کافی ہوگی اور یہ بہترین طریقہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوسکتی ہے۔ سردست اس یونیورسٹی میں صرف لبورٹیریوں کی عمارتیں بنانے کی ضرورت ہوگی ورنہ علم کیمیا کی ابتدائی تعلیم شروع کرنے کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ جب رفتہ رفتہ تعلیم صحیح اصول پر آجائے اور عملی کیمیا کی تعلیم درحقیقت مدنظر ہو تو اس کے بعد شعبہ صنعت و حرفت جو عملی کیمیا پر مبنی ہے کھل سکتا ہے۔

کیمیا درحقیقت ایک فن ہے اور اس کو اسی طرح اور اسی خیال سے حاصل کرنا چاہیئے تب ہی مفید

اور کارآمد نتیجے نکل سکتے ہیں ورنہ موجودہ طریقہ سے سائنس کا سیکھنا یعنی سائنس کی کتابوں کو ڈراما یا شاعری کی طرح محض تفنن طبع کے لئے پڑھنا ہمیشہ وہی نتیجہ پیدا کرے گا جو اب تک ہوا ہے۔

غور فرمایئے زندہ قوموں کے اصحاب کیا کر رہے ہیں۔ ہم تو علم کو تفنن طبع کے لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس کی مدد سے اچھی اچھی تقریریں کر سکیں واہ واہ کرا سکیں اور قومی لیڈری کے دعوے دار بن سکیں یا اچھے اچھے ناول یا شاعری کی کتابوں سے محظوظ ہو سکیں مگر یورپ کے لوگ جس طرح علم کو سیکھتے ہیں اس کی توجیہ اس مثال سے ہو سکتی ہے کہ میں نے دیکھا ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے ماہر (پروفیسر براون) اپنے اس طالب علم سے سخت ناراض ہوتے ہیں جو ان سے عربی شاعری یا اسی قسم کی اور علم ادب کی کتابوں کے پڑھنے کی درخواست کرے۔ ان کو صرف دو مضامین کا شوق ہے۔ تاریخ اور سائنس۔ اب آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ عربوں اور ترکوں کے حالات، روایات اور طریقہ رہائش عربی علم تاریخ کی کتابوں سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں اور اس وجہ سے اس علم کی پولیٹیکل طور پر انگریزوں کو کس قدر ضرورت ہے۔ عربوں کی علم سائنس کی کتابوں سے ان ادویات کا حال ملتا ہے جو یورپ کو اب تک معلوم نہیں لہٰذا بہت سی ادویات ان کتابوں کی مدد سے بن سکتی ہیں۔

یہ ہے ایک مثال زندہ تعلیم کی یعنی ہر ایک مضمون کو اس طرح پڑھایا جائے جو زندگی میں کسی نہ کسی طور پر کارآمد ثابت ہو۔ پروفیسر براون کے ادنیٰ جماعتوں کے طالب علم جو صرف عربی اور فارسی زبان سیکھتے ہیں ان کے لئے بھی پروفیسر موصوف کا طریق یہ ہے کہ وہ ان زبانوں کو اچھی طرح بولنا اور لکھنا سیکھ جائیں تاکہ ان کی مدد سے ایران عرب وغیرہ میں جا کر کام کر سکیں۔ ایسے طالب علم اگرچہ نہایت صفائی سے یہ زبانیں بول سکتے ہیں مگر ان کی علمی استعداد اس قدر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے ہمارے علماء اگرچہ ایک ایک لفظ کی بال کی کھال نکال سکتے ہیں مگر عربی یا فارسی زبان نصف گھنٹہ تک بھی مسلسل نہیں بول سکتے۔

مجھے امید ہے کہ اب یہ صاف ہو گیا ہوگا کہ زندہ تعلیم کے کیا معنی ہیں اور زندہ قومیں ہر ایک مضمون کی تعلیم کس طرح دیتی ہیں ایسا کہ اس سے عملی طور پر زندگی میں کوئی نہ کوئی فائدہ متصور ضرور ہوتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم بھی اپنی تعلیم کو عملی بنائیں۔ تفنن طبع بہت کچھ ہو چکی۔ سقراط اور بقراط کے مسئلوں پر ہم کافی بحث کر چکے۔ ہمارے دماغ کافی روشن ہو گئے ہیں۔ اب تو پیٹ کو روشن کرنے کی کوئی ترکیب نکالنی چاہیئے۔ دوسرے علوم کا اگر اس طرح پر انتظام نہیں ہو سکتا تو کم سے کم علم سائنس کی تو عملی تعلیم شروع کرنی چاہئے۔

اس مختصر مضمون میں صرف اشارتاً یہ تبلایا گیا ہے کہ علم کیمیا کی تعلیم کا کیا مقصود ہے اور اس کو عملی طور پر ہم کس طرح شروع کر سکتے ہیں مگر اصل نصاب کیا ہو اور ہر ایک اونچ نیچ کو کس طرح حل کیا جائے اس کے لئے ایک کمیٹی بنانی چاہیئے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

یاد رکھئے اور خوب یاد رکھئے کہ ہم اپنے کرتوتوں سے اپنی سلطنت کھو بیٹھے ہیں۔ اپنی غفلت سے اپنے تمام خزانے لٹا چکے ہیں۔ اپنی کاہلی اور سستی سے دنیا کی ہر دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اگر اب بھی ہم نہ جاگے تو پھر کب جاگیں گے۔ اب بھی اگر ہم نے ان نعمتوں کے خواص نہ معلوم کئے جو خدائے جلیل نے ہمارے لئے پیدا کی ہیں تو پھر کب معلوم کریں گے۔ زباں سے ہم خدا کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے گوناگوں نعمتیں ہمیں عطا فرمائی ہیں۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ یہ نعمتیں کس قدر گراں بہا ہیں۔ ہمارے دلوں میں ان کی حقیقی وقعت ہو ہی نہیں سکتی۔ برادران قوم آیئے علم کیمیا سیکھئے۔ اشیا کے خواص سے آگاہ ہوجئے اور رب ذوالجلال کی عظمت کا دل سے اقرار کیجئے۔ دنیا کی اشیا کو بنی نوع انسان کے لئے کارآمد بنایئے اپنے افلاس کو بھی دور کیجئے۔ اور نیابت الٰہی کا فرض بھی ادا کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ اور آپ کی اولاد اس ترقی کے آفتاب میں مثل آپ کے آبا و اجداد کے پھر سے چمک اٹھتے ہی یا نہیں!

---

*

لکچر نمبر ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبانِ اُردو

(رشید احمد صدیقی ایم اے (علیگ) لکچرر (اردو) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

جنابِ صدر، بزرگانِ محترم اور عزیزانِ یونیورسٹی،

سُنّتِ دیرینہ

جس مبحث پر مجھے اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا ہے وہ "زبانِ اُردو" ہے۔ یہ موضوع جتنا وسیع اور دقیع ہے اُس کا مجھے کامل احساس ہے، اگر یہ محض رسمیات کی ایک فرسودہ سنت نہ تصور کی جائے تو میں عرض کروں گا، یہ فریضہ میری بساطِ فہم و فراست سے کہیں وسیع اور بسیط ہے لیکن اگر میری پُرخلوص مساعی اور وائس چانسلر صاحب بالقابہ کا بزرگانہ فرمانِ ناطق میرے لیے سندِ جواز کی حیثیت رکھ سکتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں کوشش کروں گا کہ حتی الوسع آپ کی توقعات مایوس نہوں۔ میں جانتا ہوں میرا یہ عرض کرنا میرے "برخود غلط" ہونے کی ایک تاریک مثال ہے لیکن کیا کروں اظہارِ انکسار کی فرسودگی اس سے بھی زیادہ بے کیف ہوتی ہے اور میرا عقیدہ ہے، ہر اجتہاد یا انحراف خواہ وہ کتنا ہی بے محابا کیوں نہ ہو، اُن پامال رسمیات سے زیادہ دلکش ہوتا ہے جس کی سننے کا ایک ذہین مجمع پہلے سے متوقع ہوتا ہے اور مقرر کے متعلق ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو اس کے لیے کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسری دقت میرے لیے یہ ہے کہ موجودہ وقت میں ملک و قوم کی جیسی کچھ حالت ہے اور آراء و افکار

میں جیسا کچھ تصادم ہے، اس اعتبار سے مضمون زیرِ بحث کچھ زیادہ دلچسپ نہیں رہ جاتا۔ سیاسی شورشیں اور جماعتی نوک جھونک جس کا مقصد "خوباں" کے "چھیڑنے" سے ہو گرمیِ محفل کے لیئے ضروری ہے۔ ہم میں بہت سے لوگ "گرمیِ بزم" کے جویا ہوتے ہیں، اس سے بحث نہیں وہ "رقصِ شرر" تک کیوں نہ ہو، لیکن محض اس خیال سے کہ آپ حضرات نے کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے میں یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ "زاہدِ شب بیدار" کی ناقابلِ رشک حیثیت کو کچھ اور نہیں تو محض تبرکاً و تیمناً گوارا فرمانے کے لیئے تیار ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد اور ہر تمہید صرف ایک دلکش اعترافِ شکست ہوتی ہے، میں نفسِ مضمون کی طرف مائل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں دورانِ تقریر میں اکثر ایسا ہی کرتا رہونگا اور یہ محض اس لیئے نہ ہوگا کہ آپ کے خیالات میں جو بہت ممکن ہے مضمون زیرِ بحث سے بالکل غیر متعلق ہوں، میں کسی طور پر مخل ہوں بلکہ یہ خود اپنے ہی خیالات کو مجتمع کرنے کا ایک آسان وسیلہ ہوگا!

حضرات! اُردو کا سوال کسی نہ کسی صورت میں معرضِ بحث میں رہا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے ہر نقطۂ نگاہ سے اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے حالات اور واقعات کچھ اس طور پر رونما ہوئے ہیں کہ ہم کو اب جلد سے جلد فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ اس مسئلہ میں ہماری دیرینہ سعی و کاوش کا عملی پہلو کیا ہونا چاہیئے۔ زبانِ اُردو کی ابتدا اور ارتقا پر تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کرنیکی کچھ زیادہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اوّل تو میں اسے ایک خالص ادبی مبحث قرار دینا نہیں چاہتا کیونکہ یہ مسئلہ عرصہ ہوا ان مراحل سے گزر چکا، دوسرے یہ کہ فی الحال اس کا کوئی موقع نہیں ہے۔ گفت و شنید کا وقت ختم ہو چکا ہے، نقل و حرکت کو ختم کرنا چاہیئے۔ اب حملہ اور مدافعت کا وقت ہے اور ہم کو اس کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان اس وقت جن مراحل سے گزر رہا ہے، اس کا آپ کو احساس ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے، بہت سے اصحاب ان نتائج کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں جو جلد یا بدیر پیش آنیوالے ہیں۔ مسئلہ زیرِ بحث کا سب سے زیادہ دشوار پہلو تو یہ ہے کہ اُردو محکوم قوم کی زبان ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مشکل یہیں ختم نہیں ہو جاتی اُردو کی حریف صرف حکمراں ہی قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ان لوگوں کی معاندانہ تگ و تاز کی بھی آماجگاہ ہے جو ہماری طرح محکوم ہیں۔ سنتے ہیں مشترک مصیبت حریفوں کو بھی دمساز بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ کلیہ ہی کیا جو مستثنیات سے خالی ہو!

حضرات! جیسا آپ پر روشن ہے اُردو شاید تمام دُنیا کی زبانوں سے نوعمر ہے، اس کے آغاز اور ترقی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُردو دُنیائے ادب کا ایک محیرّ العقول کرشمہ ہے۔ زبانیں قرنوں میں بنتی ہیں۔ الفاظ کا سرمایہ صدیوں میں فراہم ہوتا ہے، اور صدیوں تک اُن پر سال و سنین کا انبار فراہم ہوتا ہے اُس وقت کہیں جا کر یہ منتشر ذرات آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہو کر جواہر ریزے بنتے ہیں۔ ادبیات کی مثال حجریات کی ہے۔ خاک اور ریگ کے یہی حقیر اور منتشر ذرات ہزاروں لاکھوں سال تک جذب و تجاذب کے فشار میں مبتلا رہتے ہیں اور آخر میں سنگلاخ بنجاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ نسبتاً نہایت قلیل عرصہ میں اُردو اپنی پوری استعداد اور انتہائی

رعنائی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہی دوسرے بو العجبی بھی ملاحظہ ہو۔ اکثر زبانوں کا عروج اور اُن کی ابتدا حکمرانوں کے قوت بازو یا اُن کی اعانت اور تصرف کی رہینِ منت رہی ہے۔ اُردو نے آنکھ کھولی تو اس کے سرپرستوں کی سطوت جنازہ بر دوش تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اُردو لشکری یا اس کے بعد درباری زبان رہی اور اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو ایسی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اُردو کی ابتدا اور ارتقا سے بحث نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ جن حالات کے ماتحت اُردو نے موجودہ شکل اختیار کی ہے کیا وہ حیرت انگیز نہیں ہیں یوں تو کہنے کے لئے اُردو کی تاریخ ترکوں اور مغلوں ہی کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے کئی صدی پیشتر عربوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ان تاریخی موشگافیوں سے قطع نظر کرلیا جائے تو یہ بیان واقعہ ہے کہ اُردو کو موجودہ صورت اور حالت اختیار کئے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے اُردو کا وہ سرمایہ جسے بجا طور پر ادبی کہا جاسکتا ہے زیادہ سے زیادہ سو سال کا ہے۔ غدر کے کچھ پہلے سے شروع ہو کر اب تک اس نے جتنے مدارج ترقی طے کئے ہیں اس کا مشکل اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ساٹھ ہی ستر سال کے اندر اندر اس کے سرپرستوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا اس حقیقت سے تصور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی صنف کلام ایسی نہیں ہے جس کا بہتر نمونہ اُردو میں نہ موجود ہو۔ کچھ لوگ اُردو پر تہی مایہ ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم، کسی مخصوص زبان کی جامعیت کا یوں اندازہ لگانا کہ اس میں کس کس قسم کی اور کس تعداد میں تصانیف موجود ہیں، صحیح نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں استعداد قبولیت کہاں تک ہے۔ اُردو کی استعداد اور ہمہ گیری پر حرف نہیں لایا جاسکتا۔ کمی انشا پردازوں کی ہے، زمانہ کی نامساعدت ہے، حکومت کی بے اعتنائی ہے، ہندوستانیوں کا تعصب اور جہالت ہے، اور ہماری بے توجہی ہے!

حضرات، اُردو کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے "کے آمدی و کے پیر شدی" خود فارسی کو لے لیجئے۔ کب سے عالم وجود میں ہے کیسی کیسی سرپرستیاں نصیب رہی ہیں، کہاں کہاں سے فیض حاصل کیا ہے۔ لیکن کس سرمایہ کی مالک ہے؟ یہاں بھی صرف شعر و سخن ہی کا عنصر غالب نظر آئیگا۔ اُردو پر بھی تو بعض حضرات یہی الزام دھرتے ہیں کہ یہاں شعر و شاعری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اس اعتراض کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو صورت حال میں کیا فرق آتا ہے۔ اُردو کا اگر فارسی سے مقابلہ کیا جائے تو ادبی حیثیت سے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آئیگا۔ اس میں شک نہیں فارسی شعرا، شعر و سخن میں عربوں کے علاوہ تمام دنیا کو دعوت جنگ دیسکتی ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی فارسی کو فی الحال جیسی کچھ حیثیت حاصل ہے اس میں اسلام اور عربوں کا تصرف غالب اور نمایاں ہے برخلاف اس کے عربی شاعری خوشہ چینیوں سے بالکل پاک نظر آئیگی ایام جاہلیت کی شاعری اس وقت تک کلاسکس میں شمار ہوتی ہے عرب کا لق و دق ریگستان، شعلہ بار ہوائیں

خانماں بردوش بدوی، جن کا ضابطہ انصاف صرف اُن کی تلواروں کی پرستش، جن کا صحیفہ اخلاق مہمان پرستی، جن کے محسوسات شعری اونٹ اور بکری، اور جن کا سارا سرمایہ حیات فطرت کا مظہر خشن وخشونت تھا، شاعری کے میدان میں اس شعلہ نوائی سے کام لیتے تھے کہ قلوب کی انتہائی گہرائیاں بھی ملتہب ہوجاتی تھیں۔ وہ جاہل تھے لیکن دنیا کو گونگا جانتے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہے اُنھوں نے یہ دعویٰ اُس وقت کیا تھا جب دنیا کی دیگر زبانیں معراج کمال پر پہنچ چکی تھیں۔ پھر یہ ادعائے باطل نہ تھا، اُن کی جاہلیت کے کلام سے متمدن قوموں کے بہترین کلام کا مقابلہ کر لیجئے۔ اور مقابلے کیئے گئے ہیں۔ میدان صرف نیم وحشیوں کے ہاتھ رہا ہے۔ یہ موقع عرب شاعری کی منقبت کا نہیں ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ کسی زبان کی جامعیت کا مدار صرف اس حقیقت پر نہیں ہے کہ وہاں کی آب وہوا کیسی ہے، نظام تمدن میں کیا خوبیاں ہیں، ادبیات کا ذخیرہ کیا ہے، اگر یہ امور قابل پذیرائی ہو سکتے تو باوجود ان تمام خوبیوں کے سنسکرت مردہ زبان نہ تصور کی جاتی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کس زبان میں کس حد تک جذب وتجاذب کی استعداد ہے کون زبان زمانہ کی ضروریات کی کفیل ہو سکتی ہے اور کون سی زبان زمانہ کے فشار اور دست بُرد سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

بساطِ نو

حضرات، جہاں تک ادب متین کا تعلق ہے، سوائے چند اخلاقی تصانیف کے جن میں بشتر ام الالسنہ سے خوشہ چینی کی گئی ہے یا چند تاریخی تذکروں کے جو زیادہ تر شعرا کے شاعرانہ حالات زندگی پر مشتمل ہیں اور وہ بھی جامع ومانع نہیں۔ فارسی ادب صرف شعر وشاعری کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فارسی شعرا اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا ان میں اس کی استعداد نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بادشاہ وقت حکمراں مطلق ہوگا، وہاں دربار کی رضاجوئی کے لیئے ہر شخص کی طبیعت شعر وسخن کی طرف ملتفت ہوگی۔ جہاں قصیدہ گوئی ہی آزوقہ حیات اور نام ونمود کے لیئے ضروری ہو، وہاں کوئی شخص کسی دوسرے طرف کیونکر مائل ہو سکتا ہے اس کی بہترین مثال خود ہماری زبان اُردو ہے۔ جب تک دہلی، لکھنؤ یا دیگر درباروں سے شعرا کی پرستش ہوتی رہی قصیدہ گوئی یا ہزل سرائی کا بازار گرم رہا۔ اب بھی جہاں کہیں یا کسی ریاست میں درباری شعرا کا انسٹی ٹیوشن ہے، وہاں سوائے قصائد یا غزلیات کے آپ کچھ اور نہ پائینگے۔ ریاستیں دربار شاہی کے چھوٹے نمونہ ہیں۔ قاآنی ایسا جامع الصفات شاعر بھی محض درباری شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنا پورا زور قلم صرف قصائد پر صرف کرتا ہے حالانکہ یہ وہ شاعر ہے جو غزل شاعری میں یگانہ روزگار ہو سکتا تھا۔ اب بھی جہاں کہیں اس ذہنیت نے رنگ اختیار کیا ہے یکسانیت عصر ہوگیا ہے۔ بہرحال دہلی اور لکھنؤ کی محفلوں کا درہم برہم ہونا تھا کہ شعرا نے اپنی سعی وکاوش کو دوسری طرف مائل کیا۔ اُردو ایک حد تک ۱۸۵۷ء کے فتنہ آشوب تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد زمانہ نے ایک نئی بساط بچھائی

قصائد، مرثیئے میں بدل گئے، غزلیں نوحہ خوانی میں تبدیل ہوگئیں۔ ذوقِ شعری نے ادبی اور سنجیدہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا، غور کرنے کا مقام ہے یہ رنگ کب نمایاں ہوتا ہے؟ جب "بادۂ شبانہ کی سرمستیاں" ختم ہو چکی تھیں اور "لذتِ خوابِ سحر" کافور ہو چکی تھی!

حضرات! زبانیں جس طور پر ترقی کرتی ہیں زمانہ کا اُن پر اور اِن کا زمانہ پر جیسا کچھ اثر پڑتا ہے اس سے آپ کم و بیش واقف ہیں، اردو کا گہوارہ شیراز ہند (برج کا مرغزار) تھا۔ ہر نئی آنے والی نسل کا جولانگاہ شمالی ہند رہا ہے اور جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے برج کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس کا اقتضا تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں وارد ہوتیں فطرت کے اس حسن کدہ پر ضرور حاضر ہوتیں، اور یہی وجہ ہے کہ دیگر علاقوں سے سوا یہاں کی زبان پر ان کا اثر پڑا اور اس کا دامن مختلف زبانوں کا مینا بازار بن گیا۔ فاتحین آتے رہے قومیں بنتی بگڑتی رہیں، زمانہ لیل و نہار کی کروٹیں لیتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں نے دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی اور اُردو بھاشا نے اُردوئے معلیٰ کا خلعت پہن لیا۔ میں نے اُردو کی ابتدائی ارتقائی منازل کو بضرورت نظر انداز کیا ہے اور اس وقت بھی میں الفاظ، اشعار، بیان اور معانی کی مثالیں آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے اور جن اصحاب کو اُردو سے مناسبت اور دلچسپی رہی ہے وہ اس کے ابتدائی منازل سے کم و بیش واقف ہیں۔

غدر اور غالب

میں فی الحال ان واقعات سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو ہم میں سے بہت سے اصحاب کے مشاہدہ میں آئے ہونگے۔ ہم میں ابھی وہ نفوس قدسیہ بھی موجود ہیں جنھوں نے غدر کا ہنگامہ رستخیز اور ساتھ ہی ساتھ غالب، داغ، سرسید، محسن الملک، سجاد حسین، آزاد حالی، شبلی اور اکبر کی اعجاز بیانی اور شگفتہ نگاری کا زمانہ دیکھا ہے یہ شمعیں غدر کے بعد گل ہوئی ہیں۔ زمانہ کا انقلاب نظم و نثر کے آئینہ میں دیکھنا ہو تو ان کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ میں اس مثال کے واضح کرنے کے لئے صرف تین ہستیوں کو پیش کرونگا، سب سے اول غالب کا نام لیتا ہوں، کچھ لوگ غالب کے کلام کو دیدۂ مقدم کا پایہ دیتے ہیں، دوسرے اُن کو مہمل گو تصور کرتے ہیں۔ کسی کلام کے الہامی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسے مہمل کہا جائے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے پھر بھی غالب کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے میں کلام نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کہ غالب درانتیں ان بلندیوں پر پہونچ چکے ہیں جہاں تک مشکل کسی اور اُردو شاعر کی رسائی ہو سکتی ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے ہے جس میں شامل ہونے کی میں کسی کو دعوت نہیں دیتا، کہ غالب کی بلند پائیگی کا تمام تر سرمایہ ان کی غزلیں ہیں اور وہ غزلیں جو غالب کے بقیہ اُردو کلام سے بے نیاز تھیں اور جن کو اب شائع کیا گیا ہے میرا خیال ہے کہ اُردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے۔ بہرحال

یہ محض ایک جملہ معترضہ تھا، غالب ایسے جید شاعر کے کلام میں سب کچھ ہے جس کا تذکرہ مرحوم ڈاکٹر بجنوری نے کیا ہے لیکن کوئی مخصوص پیغام (MESSAGE) نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو ساز اختیار کیا تھا وہ اس صنفِ کلام کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور یہی نہیں بلکہ ایسا کرنے سے سارا ساز بے آہنگ ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں مثنوی کے بعد شاعر کے زورِ قلم کا پتہ صرف غزل میں چلتا ہے۔ غزل ایک ایسا مختلف النوع خوان ہے جس پر ہر قسم کی نعمتیں چنی ہوتی ہیں۔ یہ بجے صرف سوز و ساز کے لئے مخصوص ہوتی ہے لیکن اگر تصوّف کا رنگ حذف کر دیا جائے تو پھر سوز و ساز ہی صرف ایسی چیزیں نہیں ہیں جن پر قوم کی فلاح اور نجات کا مدار ہو۔ غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے و ہو اور نائے و نوش کی ترجمان ہے۔ اس میں شک نہیں غالب کا مشہور قطعہ ہے

"اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے"

اُردو میں عدیم المثال ہونے کے علاوہ خیام کی عبرت نوائیوں کے ہم پلّہ ہے لیکن ایسی خال خال مثالوں سے کوئی کلیہ استنباط نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری حقیقت جس کا اظہار کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ غالب کی شاعری ان کے زمانہ کا آئینہ نہیں ہے۔ زبان کی صفائی اور پاکیزگی سے قطع نظر کرکے، ان کا پورا کلام آج سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک پیش کیا جا سکتا تھا اور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جذباتِ انسانی کی صحیح اور سچی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ لسان القلب تھے لیکن لسان العصر ہونا ایک دوسری ہستی کے لئے قسمت ہو چکا تھا۔

حالی

حضرات! غالب کے متعلق میں نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اُس کی وضاحت حالی، اکبر، اور اقبال کی مثالوں سے کرنا چاہتا ہوں۔ حالی کے پورے کلام کا آپ سطحی نظر سے بھی مطالعہ کر جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا، ایک خاص رنگ (مرثیہ) ان کے کلام تمام میں جاری اور ساری ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد زمانہ کا یہی اقتضا تھا کہ قوم میں حالی پیدا ہوتے۔ ہر سانحہ، یا حادثہ کا پہلا اثر انسانی قلب پر درد انگیز اور افسردہ کن پڑتا ہے۔ دنیا تاریک نظر آتی ہے، زار نالی کے سوا قلب کو تسکین دینے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، زخم تازہ ہوتا ہے، گذری ہوئی حالتوں کی یاد جراحت کو اور زیادہ شگفتہ بناتی ہے، وہ زمانہ یاد آتا ہے جب حرماں نصیبی کو خواب و خیال میں بھی بار حاصل نہ تھا، یہی حالت غدر کے بعد مسلمانوں کی تھی وہ تمام چیزیں جو کبھی صرف ہمارے لئے تھیں اب صرف ہماری آرزوؤں کا مدفن بن جاتی ہیں ہمارا ذہن خود بخود، سمرقند، اصفہان اور دمشق کے فضا، جیحوں اور دجلہ کی روانی، یثرب و بطحا

وصفا و زبیدہ و نہروان کی کشش، بصرہ و طائف کے نارستان و خراسان مرو اور شیراز کے چمن اور گلستان، نہر رکنی اور گلگشت مصلّیٰ کا سماں، سمرقندی اور شیرازی دعوتیں، ترکمانی صولت، مغلی جلادت، کردی عزم اور بدوی حمیت، ہاشمی آداب عباسی فضائل، نطق اعرابی، عدنانی فصاحت، ضرب کراری، حرب خالدی، سطوت حمزی، جلالت فاروقی، اخلاق احمدی، اخوت اسلامی، جولان گاہ تاتار و زنجبار کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اِن کی مایوس یاد سے تلملا اُٹھتا ہے تو کہتا ہے ؎

چھین لی سب ہم سے یہاں شانِ عرب آنِ عجم
تو نے اے غارتگر اقوام وا کاّل الاُمم

لیکن فوراً ردِّ عمل شروع ہوتا ہے، افسردگی اور یاس غالب آتی ہے تو یوں گویا ہوتا ہے ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت
اُٹھ رہا ہے گل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

ایسی حالت میں لوگ پند و نصیحت کرتے ہیں، زار نالی سے باز رہنے اور سانحہ کو بھلا دینے کی صلاح دیتے ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگتا ہے ؎

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی
بھول جائے صبح ہوتے رات کا سارا سماں

اور آخر میں بددعا پر اپنی تان توڑ دیتا ہے ؎

آگ سے رہتا ہے جیسے دُور دُور آتش پرست
حکمراں تیرے یونہیں تجھ سے رہینگے برکراں

کیا ایک مجروح قلب اور اُجڑے ہوئے دل کے واردات کی اس سے زیادہ صحیح تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔

ان چند مثالوں کو پیش کرکے میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حالی نے اپنے زمانہ کی صحیح مصوری کی ہے اور ان معنوں میں ان کا شمار حقیقی شعرا میں ہو سکتا ہے اور چونکہ ان کی ہر تان ماضی پر ٹوٹتی ہے اس لئے حالی کو بجا طور پر ماضی کا شاعر کہنا چاہیئے۔

لسان العصر

حضرات! زمانہ سے بڑھ کر مندمل کرنے والی شئے دوسری نہیں ہے، کوئی زخم ایسا نہیں ہے جو سال و سنین کے بار سے دب نہ جائے کوئی جراحت ایسی نہیں ہے جس کا بہترین اور موثر ترین مرہم مرور ایام نہ ہو۔ مراثی کا دور ختم ہوتا ہے، قلب پر صبر و سکون کا تسلط ہوتا ہے، زخم مندمل ہو چکا ہے لیکن داغ باقی ہیں، بازوؤں میں سکت نہیں لیکن اغیار کی دراز دستی

اقربا کی سادہ لوحی اور غلط روی، برادرانِ یوسف کی بے اعتنائی اور سرد مہری، مذہب و ملت کی کس مپرسی، حکومت کا استیلا ایسی چیزیں ہیں جن کا نہ تو ماتم کیا جا سکتا ہے اور نہ مقابلہ، قلب پر چوٹ لگتی ہے تو سینہ سے آہ اُٹھتی ہے لیکن زبان پر واہ کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، زار نالی بے ہنگام، مدافعت اور مقابلہ بے سود نظر آتا ہے تو اُن کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور ہجو، مذمت، تنقیص، تعریض، شطحیات، استہزائیا مطائبات، ہزلیات اور مضحکات کا دور آتا ہے، شاعر ہنسا ہنسا کر رلاتا ہے اور کھلا کھلا کر مارتا ہے، تلخ حقائق کو شربت کا گھونٹ بنا دیتا ہے، روتا ہے تو ایسی صورت بنا کر کہ لوگ ہنستے ہنستے رہ پڑیں، ہنستا ہے تو اس انداز سے کہ لوگوں کے گریہ گلو گیر ہو جائے عریاں ہوتا ہے تو اس پیرایہ سے کہ سنجیدگی قربان ہونے لگتی ہے۔

لسان العصر کے متعلق اقبال کا فیصلہ سنیئے ؎

سر ذرہ طور معنی کلیمے | بہ بتخانہ دور حاضر خلیلے
گہے گریہ او چو ابر بہارے | گہے خندہ او چو تیغ اصیلے

مجازی تمدن اور مشرقی معاشرت کو مغربی دست برد میں دیکھ کر لسان العصر (اکبر مرحوم) اپنا پیغام رسالت یوں پہونچاتے ہیں ؎

ہمارا مشرقی دل نزع میں ہے وقت آخر ہے | نہیں مغرب کو غم۔ اس کی نظر میں مرگ کافر ہے
غرور اتنا نہ کر قوت پر اپنی اے بت ترسا | ہمارے ہوش غائب ہیں مگر اللہ حاضر ہے

بتوں کی بات سے دل مائل فریاد ہوتا ہے | مگر کہنا ہی پڑتا ہے "بجا ارشاد ہوتا ہے"
مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں | یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں | باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل | گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

موجودہ دور حکومت پر کیسی کیسی تلخ نوائیوں سے کام لیا گیا ہے اور حاکم و محکوم کے جیسے کچھ تعلقات ہیں ان پر کن مختلف نوعیتوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے، روشن ہیں لیکن لسان العصر کے ہیاں یہ نقوش کس طور پر نمایاں کیئے گئے ہیں ؎

اکبر سے میں نے پوچھا ای واعظ طریقت | دنیائے دوں سے رکھوں میں کسقدر تعلق

اُس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو	انگریز کو ہی نیٹو سے جس قدر تعلق

اس شرط پر ہم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی	قبریں مہیا وہ کرے تزئین اُن کی ہم کریں

آخری شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال کی وہ نظم بھی ملحوظ رکھیئے جو نام نہاد "جمعیت الاقوام" پر لکھی گئی ہے ؎

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن	دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند	بہر تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

موجودہ دورِ تہذیب کا اس سے زیادہ بدیع نقشہ کھینچا جا سکتا ہے؟

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے، قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا

کیا گزری جو اک پردے کے عدو، رد رد کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بی بی بھی گئی اور زر بھی گیا

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردی	مُدّ ہوا کر رہے ہیں، صاحب نے یہ کہا ہے

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے	میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ ڈیہری کرے مجھ سے	اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ	ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

موجودہ زمانہ میں تعلیم نسواں اور پردہ کے متعلق جن عریانیات سے کام لیا گیا ہے اور جن تلخ یا شیریں واقعات سے بحث کی گئی ہے ظاہر ہے۔ لسان العصر کا آئینہ خانہ بھی ملاحظہ ہو۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے	خدمت میں ہے وہ لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر	شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

آج کل کی مروجہ تعلیم و تربیت کو یوں پیش کیا ہے۔

توپ کھسکی پروفیسر پہونچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

کالج سے جنھیں امیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا مانیں گے — مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

نزولِ وحیِ مغرب نوجوانوں پر ہے اے اکبر — زبانیں کالجوں کی کھل گئیں اب آپ چپ رہیے

ماسٹر کی بحث اگر مانیں نتیجہ ہے یہی — اب ہیں اچھے جانور، پہلے برے انسان تھے

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی — نہ وہ وضعِ ملت نہ قرآن خوانی
نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی — یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی
ہر اک شاخ میں پاس یہ لے بوا ہے — مرا لال کالج کا کاکاتوا ہے

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

بحث طویل ہوتی جاتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کا عزیز وقت ابھی سے رائیگاں ہونے لگے لیکن مجبوری ہے ۔ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔
چند اور اشعار بھی آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، آپ خود اندازہ فرما سکیں گے کہ موجودہ حالتوں کی ان میں کس صنعت کارانہ طریقے سے مصوری کی گئی ہے۔

افعی سے کہا میں نے مجھے تو نے ڈسا کیوں — بولا کہ بلا لاٹھی کے تو بن میں بسا کیوں

شاگردڈارون تو خدا ہی نے کر دیا | اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں
کالج کے مفتیوں سے کل کہہ رہے تھے اکبر | بسکٹ سے باز آنا رہبانیت نہیں ہے
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں، پر ایک اکھاڑہ قائم ہے | جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں
خوب یہ بات کہی اس نے پکار اس کو | بد دعا سانپ کو کیا دیتے ہو مارو اس کو

حضرات! لسان العصر کے جو ملہمات اس وقت آپ کے سامنے پیش کیئے گئے ہیں اُن سے آپ کو کافی اندازہ ہوسکا ہوگا۔ یہ ہماری موجودہ حالت کی کہاں تک ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے ورنہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ لسان العصر کے کلام کو آپ کے سامنے پیش کرتا۔ بات میں بات نکلتی آتی ہے اور مجھے یہ خیال ہے کہ کہیں آپ اس سارے طوفان تکلم سے گھبرا تے نہ لگیں کیونکہ

رات تھوڑی ہے اور سانگ بہت!

میں نے علیحدہ ایک کتاب میں طنزیات (ہجو) کی تاریخ سے بحث کی ہے اور اس میں لسان العصر کے کلام پر مفصل بحث کی ہے۔ جہاں تک میری تحقیق اور تدقیق نے میری رفاقت کی ہے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ طنزیات یا مضحکات میں لسان العصر کا جو پایہ ہے وہ آج تک دنیا کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا ہے میں نے دعوے اور دلیل سے قبل ہی نتیجہ آپ کے سامنے پیش کر دیا اس لیئے ممکن ہے آپ میرے خیال سے اتفاق کرنے میں تامل فرمائیں اس لیے قبل اس کے کہ میری اس بے محل جرأت پر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور فرمانا شروع فرمائیں اور طنزیات کے سلسلہ میں آپ کا سنجیدہ ہو جانا میں اپنی آیندہ توقعات کے لیئے نیک فال نہیں تصور کرتا، میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ کو کسی دوسری مبارک ساعت کے لیئے ملتوی فرمائیں۔ جو کچھ میں نے لسان العصر کے متعلق اب تک عرض کیا ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ جائز طور پر "حال" کے شاعر کہے جا سکتے ہیں۔

"شاعرِ فرد استم"

حضرات! اسی سلسلہ کی آخری کڑی بھی ملاحظہ ہو، شور و شیون ختم ہو چکا، طعن و تشنیع کا زمانہ بھی اتمام کو پہونچتا ہے، قوم اور ملک میں بیداری کے آثار شروع ہوتے ہیں، زمانہ ایک دوسری بساط بچھاتا ہے، نظروں میں وسعت اور قلوب میں گرمی پیدا ہوتی ہے مذہب اور ملت کے تودۂ خاکستر میں کچھ دبی ہوئی چنگاریوں کا پتہ چلتا ہے "ایام گل" کے آثار بھی ہویدا ہیں، "اشارہ" بھی ہونے والا ہے صرف "جیب چاک" کرنا باقی رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ فضائے اثیر میں تموج پیدا ہوتا ہے اور تمام موجودات

من صدائے شاعرِ فرد استم

پر صدائے لبیک بلند کرنے کے لئے بیدار ہو جاتی ہیں۔

حضرات! ماضی اور حال کی داستانوں کی ترجمانی ہو چکی ہے، ادب اُردو اب مستقبل کے شاعر کی لئے چشم براہ ہے یہ پیغام بھی اُنھیں فضاؤں کو چیرتا ہوا ہماری کانوں تک پہنچتا ہے جہاں سے گزشتہ قومیں اپنے پیغامات لے کر نازل ہوئی تھیں اور جو رفتہ رفتہ جذب عناصر ہو گئے۔ اور جو کسی نہ کسی نوعیت سے ہمارے اخلاقی تمدنی اور سیاسی تار و پود میں نمایاں ہیں۔ اُنیسویں صدی کا آخری دور جس میں بیسویں صدی کا بھی کچھ حصہ شامل کر لینا چاہیئے۔ ہندی مسلمانوں کے انتہائی پستی اور نکبت کا زمانہ رہا ہے، ہر وہ جمود جو کسی قوم پر اس کی تباہی کے بعد مستولی ہوتا ہے کئی حیثیتوں سے المناک ہوتا ہے، ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا اتنا روح فرسا نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جتنا اس سانحہ کا فقدان احساس "متاعِ کارواں" کے جانے کا غم اتنا دل شکن نہیں ہوتا جتنا "احساس زیاں" کے جانے کا واقعہ جانگسل ہوتا ہے۔ ادبار، نکبت، پستی اور انحطاط جب اپنے انتہائی تاریکیوں کو پہنچ جاتے ہیں اس وقت فطرت اپنے ان کرشموں کو دفعتًا بر افگندہ نقاب کرتی ہے جو انسانی توقعات سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کی وضاحت کیلئے تاریخ کا بے پایاں ذخیرہ موجود ہے، ہر برگزیدہ ہستی کی تاریخ پر نظر ڈالیئے آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ اس کا زمانہ رسالت ہمیشہ اُن حدود سے شروع ہوتا ہے جو کسی قوم اور ملک کی پستیوں کا آخری نشان منزل تھا، ابنائے مرسلین ہمیشہ ایسے ہی زمانہ میں مبعوث برسالت ہوئی ہیں، بڑے بڑے شعرا جن کے نغموں سے ذرّہ ذرہ مرتعش ہو گیا ہے انہی حالتوں میں منصّہ وجود پر جلوہ گر ہوئے۔ حافظ اور گوئٹے کے دورِ حیات پر نظر ڈالیئے ایک تاتاری سیلاب کی موجوں سے ہم آویز ہوا دوسرا انقلابِ فرانس کی ہیئت زائیوں سے دوچار۔

اقبال کا پورا سرمایہ شاعری اُس نیابتِ الٰہی کا ترجمان ہے جس کا تذکرہ آج ہی صاحبزادہ صاحب کے عالمانہ خطبۂ صدارت میں آپ سُن چکے ہیں۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش ست	بر عناصر حکمراں بودن خوش ست
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم ست	ہستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم ست
خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند	ایں بساطِ کہنہ را برہم زند
مدعائے علّم الاسما ستے	سرِّ سبحان الذی اسرا ستے
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم ست	از جلالِ او نجاتِ عالم ست

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد	عالمے از ذرّہ تعمیر کرد

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر | تختۂ تعلیم ارباب نظر
نائب حق در جہاں آدم شود | بر عناصر حکم او محکم شود
تابش از خورشید عالمتاب گیر | برق طاق افروز از سیلاب گیر
چشم خود بکشاؤ در اشیا نگر | نشۂ زیر پردۂ صہبا نگر
تو کہ مقصود خطاب انظری | پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری
آں کہ بر اشیا کمند انداخت ست | مرکب از برق و حرارت ساخت ست
علم اسما اعتبار آدم ست | حکمت اشیا حصار آدم ست

اس نائب الٰہی کی پذیرائی کن الفاظ میں کی جاتی ہی۔

ای سوار اشہب دوراں بیا | ای فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو | در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشت گوش کن
نوع انساں مزرع و تو حاصلے | کاروان زندگی را منزلے

اغیار کی غلبہ زائیوں کے متعلق اقبال کا پیغام ہیجان کیا ہی۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو | قوت خوابیدۂ بیدار شو
سنگ چوں بر خود گمان شیشہ کرد | شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد
راست می گویم عدو ہم یار تست | ہستی او رونق بازار تست
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو | گر بقا خواہی بہ خود آباد شو

اسی خیال کا اعادہ اقبال نے پیام مشرق میں یوں کیا ہی:-

رفیقش گفت ای یار خردمند | اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فساں زن | ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی

خطر تاب و تواں را امتحان ست
عیار ممکنات جسم و جان ست

ہندی مسلمانوں کے لئے وطن پرستی اور قومیت کا مسئلہ نہایت معرکۃ الآرا ہی۔ یہی وہ مقام ہی جہاں اُن لوگوں کو سخت لغزش ہوئی ہی جنھوں نے "ہندستانی" ہونے کو "مسلمان ہونے پر" ترجیح دی ہی۔ اقبال کا رنگ بھی ملاحظہ ہو۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملتِ گیتی نورد
بر اساس کلمۂ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں

ہر کہ از قیدِ حیات آزاد شد
چوں ملک در شش جہت آباد شد

مسلمستی دل بہ اقلیمے مبند
گم مشو اندر جہانِ چون و چند

می نہ گنجد علم اندر مرز و بوم
در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

آج اسلام جن ہلاکت زائیوں سے گزر رہا ہے اُس کو کچھ وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جو اب تک اسلام کو اپنی حیات کا تار و پود سمجھتے رہے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اب اسلام اور مسلمان دونوں حیات کی آخری ساعتوں سے ہم آویز ہیں، لیکن ایک ہندی نژاد شاعر جس کی فضائے تخیل اسلام کی تابناکیوں سے لبریز ہے جس کی چشمِ تصور اسلام کی زندہ تاریخ سے بیدار اور جس کا قلب ان صداقتوں سے آشنا ہو چکا ہے جس کا مظہر عین اسلام اور صرف اسلام ہے، اس طور پر رجز خوانی کرتا ہے۔

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خداست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست

از اجل ایں قوم بے پرواستے
استوار از نحن نزلناستے

تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

ما کہ توحیدِ خدا را حجتیم
حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم

آسماں با ما سرِ پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت

سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آں چہ روما ہم نہ دید

تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس
زاں نو آئینِ کہن پندار پرس

آتشِ تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہائے او گلِ دستار کیست؟

از تہِ آتش بر اندازیم گل
نارِ ہر نمرود را سازیم گل

شعلہ ہائے انقلابِ روزگار
چوں بباغِ ما رسد گردد بہار

رومیاں را گرمِ بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست
رونقِ خمخانۂ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوانِ او تہِ اہرام ماند

در جہاں بانگِ اذاں بودست و ہست
ملتِ اسلامیاں بودست و ہست

عشق آئینِ حیاتِ عالم ست — امتزاجِ سالماتِ عالم ست
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است — از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

کشاکشِ حیات کے متعلق اقبال کی تعلیم کتنی حرارت انگیز ہے! تنازع للبقا سے عہدہ برآ ہونے کی تعلیم کس آتش نوائی سے کی گئی ہے!

سنگ شد ای ہمچو گل نازک بدن — تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن
از گلِ خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے — خشت از خاکِ تو بندد دیگرے
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم — زورِ خود را از مہماتِ عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است — چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکناتِ قوتِ مردانِ کار — گردد از مشکل پسندی آشکار
اے ز آدابِ امانت بے خبر — از دو عالم خویش را بہتر شمر!

حضرات! اقبال کے متعلق میں نے ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا ہے، ممکن ہے کہ آپ مجھ پر یہ الزام عائد فرمائیں کہ میں نے مضمون زیرِ بحث سے ناروا طور پر انحراف کیا ہے لیکن "نیتِ شب بخیر" اس طویل انحراف سے کچھ اور مقصود نہ تھا۔ میرا مدعا یہ تھا کہ اقبال نے جو رنگ اختیار کیا ہے وہ مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کیسا ہی کچھ نہ تصور کیا جائے"

ان کا کلام خود زبانِ اُردو کے لیے ایک جدید پیغام ہے یہ زندہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے، یہ وہ شاعری ہے جس کو ملحوظ رکھ کر کارلائل نے شعرا کو پیغمبروں کی صف میں لانے کی کوشش کی ہے اور جائز کوشش کی ہے اقبال کو ایک خالص اسلامی شاعر تصور کرنا چاہیئے۔ ان کا پیغام تعلیم اسلامی کی زندہ تفسیر ہے۔ اقبال نے شاعری کی ایک نئی جولانگاہ پیش کی ہے جس میں قدم رکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اور میں یہ عرض کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ اکبر اور اقبال دونوں اپنے اپنے وادی کے امام ہیں۔ اقبال نے اکبر کے رنگ میں بھی طبع آزمائی کی کوشش کی ہے لیکن دونوں خدوخال میں جو بیّن فرق نظر آتا ہے وہ اصحابِ ذوق و بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ بہرحال یہ بحث یہاں بے موقع ہوگی۔ میں ابھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اقبال نے اُردو شاعری میں ایک جدید بنیاد قایم کی ہے اور اب ادب اُردو کا سنجیدہ طبقہ اسی طرف مائل ہے، اقبال جو منزلیں طے کر چکے ہیں، اب تک وہاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے لیکن اس میں شک نہیں اُردو شاعری کا رُخ اب بالکل بدل چکا ہے۔ ابھی ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو زبان اور فن شاعری کے اعتبار سے اقبال کو وہ درجہ نہیں دیتے ہیں جس کو خود اقبال نہیں تو اُن کے پُرجوش حامی اُن کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اقبال اب اُن حدود سے گزر چکے ہیں جہاں پہونچ کر مخالفین اُن کے دامن کو ہاتھ لگا سکتے تھے۔ اقبال ناظم نہ سہی ان کا شاعر ہونا تو مسلمات میں سے ہے!

حضرات! آج کل کے جدید دورِ شاعری کا آپ نے مطالعہ کیا ہوگا، آپ خود اندازہ لگا سکے ہونگے کہ آج کل کی قومی اور نیچرل شاعری کس کی تقلید کر رہی ہے اور رنگ و بو کے لئے کس گلستان کی متلاشی ہے۔ غزل سرائی اور قصیدہ گوئی کا زمانہ اب گزر چکا ہے۔ اس میں شک نہیں ان کو پھر بیداری نصیب ہوگی لیکن یہ اُسوقت ہوگا جب ایک دوسرے اقبال کی ضرورت زمانہ کو محسوس ہونے لگیگی۔ حقیقت یہ ہے ایک طور پر غزل، قصائد اور مثنوی (بزمیہ) کا وجود بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ ہر صنفِ کلام کی ابتدا اور عروج کا زمانہ ہوتا ہے اور ہر کلام میں زمانہ کے میلانات اور افکار کے نقوش کم و بیش نمایاں ہوتے ہیں، غزل کی زمین اس کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں ہوتی ہے لیکن یہاں بھی اقبال کا رنگ غالب ہے، اقبال کے لب و لہجہ کا اندازہ کرتے ہوئے مشکل کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ غزل کے رنگ میں بھی کامیاب ہو سکتے تھے۔ میں خود اس خیال کا مؤید تھا لیکن پیام مشرق کے شائع ہو جانے کے بعد ان خیالات کی بالکل تردید ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ لالۂ طور کے تحت میں اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض اسرار اور رموز کی تفسیر ہے اور جو لوگ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی سے مسحور ہو چکے ہیں اُن کے نزدیک لالۂ طور کی اہمیت کچھ زیادہ وقیع نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کرونگا

کہ فی الحقیقت اقبالؔ نے اپنا پیغام اسرار اور رموز سے پہلے شمع و شاعر ہی میں پیش کر دیا تھا۔ فرق صرف ناموں کا ہے۔ شاعری اور فلسفہ یا دل اور دماغ میں جو فرق ہے وہی امتیاز شمع اور شاعر اور اسرار اور رموز میں ہے۔ پیام مشرق میں جو حصہ سب سے زیادہ حرارت انگیز ہے وہ افکار اور مے باقی ہیں۔ افکار کے متعلق کچھ عرض کرنا بے سود ہوگا۔ یہاں اقبال اپنی پوری شاعرانہ بیداریوں کے ساتھ نمایاں ہیں بالخصوص میلاد آدم اور انکار ابلیس وہ الماس ریزے ہیں جن کا جواب دنیائے شاعری میں اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف ڈانٹے اور ملٹن کی سحر کاریوں میں میسر آسکتا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیں۔

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

(دیا)

من زتنک مایگاں گدیہ نہ کردم سجود — قاہرِ بے دوزخم داورِ بے محشرم

یا مئی باقی کے اس ہیجان آور پیغام:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

کا کیا جواب ہے!

حضرات! میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ پیام مشرق میں مئی باقی کے تحت میں اقبالؔ کا جو کلام (غزل) شائع ہوا ہے وہ کئی صورتوں سے قابل توجہ ہے اول تو یہ کہ اقبالؔ کے کمال شاعری میں یہ ایک مزید انکشاف ہے، دوسرے یہ کہ اقبال نے غزل میں بھی وہی آب و رنگ پیدا کر دیا ہے جو ان کی دیگر معرکتہ الآرا نظموں میں نمایاں ہے، ملاحظہ ہو،

بہ نوریاں ز منِ پا بگِل پیامے گوئے — حذر ز مشت غبارے کہ خویشتن نگر است

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست — سفر بکعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

ز خاکِ خویش بہ تعمیرِ آدمی برخیز — کہ فرصتِ تو بقدرِ تبسمِ شرر است

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی — در قلزم آرمیدن ننگ ست آب جو را

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی — در ماں نیافریدی آزارِ جستجو را

یا ز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم — با نسیمِ سحر آمیز و وزیدن آموز

اگرت خارِ گلِ تازہ رسی ساختہ اند — پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز

تا کجا در تہ بالِ دگراں می باشی | در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

خود غزل کو اقبال نے "پیغام" رسانی کا ذریعہ بنایا ہے، فرماتے ہیں:-

بہ ایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد میرا ذہن فی الفور نظیری نیشاپوری کی طرف منتقل ہوتا ہے، نظیری کے مانند اقبال نے بھی غزلیات میں تسلسل مضامین کا التزام رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی تمام غزلوں کا تیور یکساں ہے لیکن ممکن ہے اس سے آپ یہ نتیجہ نکالیں کہ اقبال کے ہاں تغزل کا رنگ ہی مفقود ہے، اگر میرا یہ اندیشہ صحیح ہے تو میں آپکے سامنے اقبال کا وہ کلام پیش کرونگا جسے سن کر، مجھے امید ہے کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائینگے:

بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آں جا | حدیثِ دل بزبانِ نگاہ میگویم

بہ رہِ تو ناتمامم، ز تغافلِ تو خامم | من و جانِ نیم سوزی، تو و چشم نیم بازے

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بت خانہ | ایں جلوت جانانہ، آں خلوتِ جانانہ
از بزم جہاں خوشتر، از حور جناں خوشتر | یک ہمدم فرزانہ وز بادہ دو پیمانہ
ہر کس نگہے دارد، ہر کس سخنے دارد | در بزم تو مے خیزد افسانہ ز افسانہ

اے جان گرفتارم دیدی کہ محبت چیست؟ | در سینہ نیاسائی از دیدہ بروں آئی
عشق ست و ہزار افسوں حسن ست و ہزار آئینہ | نے من بہ شمار آیم نے تو بہ شمار آئی
ہم با خود و ہم با او ہجراں کہ وصال ست ایں؟ | اے عقل چہ میگوئی، اے عشق چہ فرمائی

حضرات! آپ خیال فرماتے ہونگے، اقبال کے متعلق یہ طوالت پذیری بے محل اور ناروا ہے لیکن آپ یقین فرمائیں اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ دور حاضر میں یہی نغمہ جرس کارواں ثابت ہوگا، زمانہ کی فطرت اسی کی متقاضی ہے اور اس سے سرتابی کرنی

قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اُردو کا دامن ان گرانباریوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اور اس میں سنجیدہ مضامین نظم و نثر کی گنجایش نہیں ہے۔ میرے بعض کرم فرماؤں کو یہ خیال بھی ہوگا کہ ادب اُردو کے موضوع پر اقبال کے فارسی کلام کو معرضِ بحث میں لانا بے موقع اور غیر متعلق ہے، یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن میں نے اقبال کا فارسی کلام پیش کیا ہے، ان کے فارسی آب و رنگ پر ہمیں زور نہیں دیا ہے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ اقبال اپنے تمام شاعرانہ کمال کے ساتھ فارسی شعرا کے صف میں داخل ہوسکتے ہیں یا نہیں، اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے، یہی کیا کم ہے کہ اقبال کو شاعری کے وہ مدارج حاصل ہوچکے ہیں کہ ان کا ہندی یا فارسی ہونا اب ایک لاطائل بحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ آپ خود غور فرمائینگے تو معلوم ہو جائیگا کہ اب غزل اور قصیدہ گوئی دونوں انحطاط پذیر ہیں، اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب غزل اور قصائد میں وہ خوبیاں باقی نہیں رہیں جو اس سے قبل تھیں، میرے کہنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ اب سنجیدہ طبائع اس ساز سے کچھ بے اعتنا ہو رہی ہیں۔ پنجاب خصوصیت کے ساتھ اقبال کا رنگ اختیار کرتا جاتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ اس کی ابتدا لکھنؤ اور دلی میں بھی ہو جائے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ باوجود اس کے کہ دہلی اور لکھنؤ اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حق بجانب بھی ہیں لیکن زمانہ کی طرف سے بالکل مستغنی ہوگئے ہیں، اگر آپ آزردہ نہ ہوں اور مجھے اجازت دیں تو میں عرض کرونگا کہ اگر زمانہ کی یہی رفتار رہی اور شعرا اور اہل زبان کا یہی عالم رہا تو کچھ دور نہیں ہے کہ دلی کو اس صف سے علیحدہ ہونا پڑے دلی کی اُردو اب بجائے ٹکسالی ہونے کے بازاری اور تجارتی ہوتی جاتی ہے۔ مولنا حسن نظامی، حکیم ناصر نذیر فراق، علامہ راشد الخیری اور ایسے ہی دو چار اور بزرگ باقی ہیں جن کے دم سے اُردو کا چراغ اب تک ٹمٹما رہا ہے، میں نہیں کہہ سکتا یہ حضرات اپنے صحیح اور سچے جانشین بھی چھوڑ سکیں گے یا نہیں، لکھنؤ پھر بھی غنیمت ہے، ابھی وہاں کی آب و ہوا شعر و شاعری اور زبان کے لیے مساعد ہے اور اس حیثیت سے میں اس وقت لکھنؤ کو دلی پر ترجیح بھی دیتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے وہ دن دور نہیں ہے کہ کچھ دنوں میں اُردو کا کوئی اسکول باقی نہ رہ جائیگا، اور یہی اخباری زبان جو اس وقت اس کثرت کے ساتھ ملک کے مختلف حصص سے پیدا ہو رہی ہے لے دے کر ادب اُردو کا سرمایہ رہ جائیگی۔

حضرات! اس سلسلہ میں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری یہ صاف گوئی مجھے اور زیادہ پیچیدہ مراحل سے گزرنے پر مجبور نہ کردے اور اس طور پر کچھ اصحاب اس جلسہ سے اٹھیں تو اُن کے ذہن میں چند باتیں محفوظ بھی رہ جائیں کیونکہ دلی اور لکھنؤ کے مسئلہ کو چھیڑنا اپنی شامت اور دوسروں کی بدمذاقی کو دعوتِ جنگ دینا ہے، میں بدمذاقی سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا آپ حضرات اس کانفرنس کو مدعو کرنے سے گھبراتے

ہیں۔ بہر حال اس مسئلہ کو فی الحال ملتوی رکھئے اور مجھے اب اجازت دیجئے کہ میں موضوع زیرِ بحث کے دیگر پہلوؤں کو بھی آپکے سامنے پیش کروں جن کو میں نے ابتدا میں اس خیال سے نہیں پیش کیا کہ شاید آپ اس مجھے پہلے ہی سے متوقع رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص جس کی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ وہ ایک سمجھ دار اور ذہین مجمع کو اپنا مخاطب بنائے، اِس سے بہت گھبراتا ہے کہ لوگ اس کا مافی الضمیر پہلے ہی سمجھ لیں، گو اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اسی حقیقت کو محسوس کرکے پہلے ہی سے، اور وہ بھی اتفاقاً فنِ تقریر کے اُس اُصول کو ذہن نشین کر لیتا ہے اور بسورانِ تقریر میں اس کی مزاولت بھی رکھتا ہے، جس کی رو سے بتایا گیا ہے کہ مجمع کو اپنے سے زیادہ قابل نہیں سمجھنا چاہیئے، میں نے اس اُصول کو عبارتِ سلبیّہ کی صورت میں نشر کیا ہے لیکن اصل میں وہ ایجاب کے نہایت پرزور اور عریاں الفاظ اور مفہوم میں ادا کیا گیا ہے۔

رینائیسنس

حضرات! یہ حقیقت آپ پر روشن ہوگی کہ غدر کے بعد مسلمانوں کی حمایت میں جو شخص سب سے پہلے سینہ سپر ہوا وہ سر سید تھے۔ میں اُن کی خدمات کے صرف اس پہلو کو آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو اُردو سے متعلق ہے، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کالج تہذیب الاخلاق، اور ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ سر سید، محسن الملک، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی مولٰنا حالی، ایسے ایسے یگانۂ روزگار جو ایک جا اور ایک زمانہ میں مشکل جمع اور پیدا ہوتے ہیں، علی گڑھ کو اپنے پورے جارحانہ اور مدافعانہ طاقتوں کا محاذ بناتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اِن بزرگانِ قوم کی زبان اور قلم ایک عالم سے برسرِ پیکار رہا، سر سید، ڈاکٹر نذیر احمد اور محسن الملک کی تحریر اور تقریر، مولٰنا چراغ علی اور مولٰنا آزاد کی تصانیف علامہ شبلی اور مولٰنا حالی کی نظمیں، غرض ایک سیلاب تھا جو ہر مخالفت و مقاومت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔ اور اُردو کے لیئے ایسی شاہراہیں کھول گیا جس پر ہم آج آنکھ بند کرکے آتے جاتے ہیں۔ یہ زمانہ جائز طور پر اُردو کا نشاۃ الثانیہ کہا جاسکتا ہے اُردو کی ترقی اور توسیع کا یہی عالم تھا کہ اس پر اغیار کی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں اور سر انٹونی میکڈانل کے زمانہ میں ابنائے ملک نے اس پر سب سے پہلا وار کیا۔ لیکن محسن الملک کی آتش نوائیوں نے اسے کچھ عرصہ کے لیے فرو کردیا، یہ پہلا واقعہ تھا جب اُردو حکومت کے نظروں میں کھٹکی اور یہ مسئلہ ہماری توجّہ کو جذب کرنے لگا۔

تلخ حقایق

حضرات! یہ ایک مختصر روئداد تھی غدر کے بعد اُردو کے ابتدائی مدارج کی، وہ زمانہ گزر گیا، وہ سرفروشیاں نذرِ نسیاں ہوئیں، وہ ہم نہ رہے وہ دل نہ رہا اب فی زمانہ موجودہ دَور کے تلخ حقایق سے بھی آشنا ہونے کے لیئے تیار ہو جایئے۔ آپ تعجب فرمائینگے

کہ میں موجودہ حالات اور واقعات کو تلخ حقائق پر کیوں محمول کرتا ہوں۔ اس کے میرے پاس وجوہ ہیں۔ میں نہایت ادب سے التماس کرونگا کہ باوجود اس کے کہ اُردو کی توسیع اور ترویج کے لئے اتنی کوشش کی جا رہی ہے، باوجود اس کے کہ کثیر التعداد اُردو اخبار اور رسائل نکل رہے ہیں، اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن نے عثمانیہ یونیورسٹی قایم کر دی ہے، مسلم یونیورسٹی میں اُردو لازمی مضمون قرار دید یا گیا ہے، مختلف گراں پایہ انجمنیں قایم ہو چکی ہیں بایں ہمہ اُردو داں طبقہ میں مشکل پانچ فی صدی ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو بے تکلف صحیح اور ستھری اُردو بول یا لکھ سکتے ہیں۔ مجھے توقع ہے آپ میرے اس خیال سے آزردہ نہ ہونگے۔ آپ خیال فرماتے ہونگے جب ہم مہد سے لحد تک اُردو ہی سے وابستہ رہتے ہیں اور جب اُردو کے نشر و تعمیم کے ایسے ذرائع اور وسائل موجود ہیں، پھر اُردو سے بے بہرہ رہنے کے کیا معنیٰ؟ حضرات میں پھر عرض کرونگا کہ یہ سب صحیح ہے لیکن میرا خیال بھی غلط نہیں ہے۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے اور میں جس حقیقت پر پہونچا ہوں وہ عرصہ کی غور و فکر، تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں اس وقت مختلف اور متعدد رسائل، اخبارات، کتابیں شائع ہو رہی ہیں، درس گاہوں کی کمی نہیں ہے، انجمنیں کثیر التعداد ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ تو نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ اُردو خاطر خواہ ترقی بھی کر رہی ہے۔ آپ نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ محض معدودے چند اخبارات، رسائل اور کتابوں کے علاوہ جتنی اور مطبوعات ہیں ان سب کی زندگی اور موت ساتھ ہی ساتھ شروع ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری تمام کوششیں غلط راستہ پر ہیں۔ کثرت کے معنی نفع کے تو نہیں ہو سکتے۔ سب سے بڑی فروگزاشت جو ہم سے سرزد ہو چکی ہے اور جس کی اب تک تلافی نہیں ہو سکی ہے یہ ہے کہ اس وقت تک "اُردو" کا کوئی اسکول قایم نہیں ہو سکا ہے۔ اس سے پہلے دہلی اور لکھنؤ دو ایسے مقامات تھے جہاں اُردو کی ٹکسال تھی، زبان کی خوبی یا خرابی کا معیار یہیں تلاش کیا جاتا تھا اور یہاں کے فیصلے ناطق ہوتے تھے اس زمانہ میں نہ کوئی خاص انجمن اس کے لئے قایم تھی، نہ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے تھے، نہ کانفرنس ہوتی تھی اور نہ چندہ جمع ہوتا تھا، صرف چند نفوس قدسیہ ایسے تھے جن کی فضیلت کا سکہ معیار امتحان ہوتا تھا۔ اس وقت جس طور پر اُردو exploit کیا جا رہی ہے (ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے) اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ نہیں عرض کرتا کہ اُردو کی ایسی حلقہ بندی کی جائے کہ اس میں نشر و تعمیم کی گنجایش ہی نہ رہ جائے اور اُردو داں طبقہ میں صرف چند ایسے نفوس ہوں جن کو اُردو سے عہدہ برآ ہونے کا منصب حاصل ہو، یہ اصول ناممکن، غیر مناسب اور بے محل ہوگا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ایک ایسی انجمن یا اکاڈمی قایم کی جائے جس کے فیصلے، جہاں تک زبان کی صحت اور سلاست کا تعلق ہے، ناطق تسلیم کئے جائیں۔ اس کے اراکین مشہور، مقتدر اور مسلّمہ

قابلیت کی اہل زبان ہوں۔ اب تک اُردو کا کوئی جامع لغت مدوّن نہیں ہوسکا ہے، کوئی معقول گرامر بھی مرتب نہیں ہوسکی ہے گو اس سلسلہ میں ہمارے بزرگ محترم مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اردو کی مساعی ہماری انتہائی شکرگزاریوں کی مستحق ہیں۔ ممدوح نے جس پایہ کی قواعد اردو مرتب کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے اور ایک اُردو لغت کی تدوین کرنے میں جس سرگرمی اور خلوص کا اظہار کیا ہے وہ ہر نوع اُمید افزا ہے خدا اُن کے عزائم میں برکت دے۔ اِسی سلسلہ میں دارالمصنفین کی گراں بہا خدمات کا بھی تذکرہ کرنا لازمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دو ہی رسالے ایسے شائع ہورہے ہیں جو ایک بڑی حد تک میرے اس نصب العین کے مطابق ہیں جن کا میں ابھی ابھی تذکرہ کرچکا ہوں۔ یعنی معارف اور اُردو، خدا اُن کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے اور اُن کو آپس کی حریفانہ چشمک کا آماج گاہ نہ بنائے۔

حضرات! اب میں اپنی تقریر کے اس حصّہ کی طرف مائل ہونے کی آپ سے درخواست کروں گا جو میرے نزدیک اس تمام داستان کی بنیاد ہے۔ میں یہ نہیں عرض کرسکتا کہ ہمارے یہاں ماہران اُردو کی کمی ہے، یا خود اُردو میں استعداد ترقی نہیں ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اُردو کی پرسش نہیں ہے، اگر آج فرمان روایانِ دکن اور بھوپال اُردو کی سرپرستی سے کنارہ کش ہوجائیں تو جتنی موقر انجمنیں آج موجود ہیں اور جتنی گراں قدر خدمات وہ بجا لارہی ہیں ان سب کا شیرازہ بکھر جائے۔ بظاہر یہ حقیقت نہایت تلخ معلوم ہوتی ہے کہ کسی زبان کی فلاح و نجات کا مدار ایسی بنیادوں پر ہو لیکن آپ یقین فرمائیں اس کی ضرورت ہر زبان کو ہمیشہ رہی ہے۔ اردو کیوں نظر انداز کی جاتی ہے اور انگریزی کو لوگ کیوں سینوں سے لگائے رہتے ہیں، آپ یقین فرمائیں یہ فیشن یا مغالطہ کی بنا پر نہیں ہے۔ میں اس کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ اس کا اقتصادی پہلو یہ ہے کہ اُردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ اُردو لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں لوگ تامل کرتے ہیں اس لیئے کہ آذوقۂ حیات میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا، آپ خیال فرمائینگے بہت سے فرائض ایسے ہیں جن کی بجا آوری ہر معاوضہ سے بے نیاز ہے لیکن اس کے لیئے لوگ سرفروشیاں کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ مثلاً وطن پرستی، حمایتِ دین وغیرہ وغیرہ۔ یہ بالکل صحیح ہے صرف یہ مسئلہ زیر بحث کے تحت میں نہیں آتا۔ اُردو کا مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ بعض حضرات یہ بھی پیش کرسکتے ہیں کہ یہ قومی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن جیسا میں ابھی ابھی عرض کرچکا ہوں اُردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے اور حصول معاش میں اِس سے کوئی معتدبہ نفع نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ لوگ خلوص، شوق یا ضرورت کی بنا پر اس کی طرف بالکل نہیں متوجہ ہوتے جب تک اُردو کی قدر و قیمت روٹیوں میں تحویل نہ کی جاسکے۔ لوگوں کی توجہ اس طرف مشکل منعطف کرائی جاسکتی ہے۔ ہم تمام عمر انگریزی زبان سیکھنے میں صرف کردیتے ہیں اور ٹکسالی انگریزی لکھنے پر

قادر نہیں ہوتے لیکن یہ وقت ہمت شکن نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ حصول معاش یا ملازمت میں یہ بوجوہ معلومہ معین ہوتی ہے۔ اُردو داں دونوں حالتوں میں محروم رہتا ہے یہاں نہ ڈگری کی پرسش ہے اور نہ ذاتی قابلیت کی کوئی قیمت، پھر آپ ہی تبلائیں اُردو سیکھنے کی درد سری سے فائدہ؟ ہر قابلیت کے لیئے کوئی مخصوص معاوضہ ہے، معاوضہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، ڈاکٹر، انجنیر، وکیل، تاجر، سپاہی، غرض کہ سب کے لیئے ہندوستان اور دیگر ممالک میں کم و بیش ایسی جگہیں مل سکتی ہیں جہاں وہ قابلیت کا معاوضہ حاصل کر سکتا ہے پھر آپ ہی فرمائیں اُردو میں تبحر حاصل کرکے کسی کو نفع کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ کتنے اسکول یا کالج ہیں جہاں اُن کے لیئے جگہ نکل سکتی ہے، کتنے دفاتر یا محکمہ جات ہیں جو اُن کی پذیرائی کے لیئے آمادہ ہیں، کتنے اخبارات یا رسائل ہیں جہاں اِن کی پرسش ہو سکتی ہے۔ آپ گھر بیٹھ کر تصنیف اور تالیف ہی کی ابتدا کیونکر کر سکتے ہیں جب اُن کے پڑھنے والے ہی معدوم ہیں اور آپ کی تصنیف یا تالیف کی طلب ہی نہیں ہے۔ رہا یہ کہ کسی فن پر کامل دسترس ہی رکھنا ایک معاوضہ ہے اس کے متعلق صرف یہ گزارش ہے کہ زندگی کی بعض ضرورتیں اتنی شدید اور ناگزیر ہوتی ہیں کہ انسان کو اس کلیہ سے منحرف ہونا ہی پڑتا ہے۔

چند دقتیں

حضرات، دوسری دقت جس کا ہم کو سامنا ہے وہ ہماری تمدن اور معاشرت سے متعلق ہے اور اس سلسلہ کی آخری کڑیاں (یا دشس بخیر) فضائے مغرب سے منسلک ہیں۔ اُس عالم گیر میلانِ ذہنی کا کیا علاج جس نے مشرقی معاشرت اور تمدن کے مقابلہ میں سراب مغرب کو باصرہ فریب بنا رکھا ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ کو آپ پیش نظر رکھ کر اندازہ فرمائیں، آپ محسوس کرینگے کہ ہمارے خیال و افکار پر مغرب اور مغربیت کا رنگ کس درجہ غالب ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ایک عرصہ سے مسلمان اپنے مذہبی معتقدات اساسی کو فراموش کر چکے تھے اور اُن کے بجائے اُن میں باطل پرستی (وسیع معنوں میں) سرایت کر چکی تھی میں اس وقت ان تمام واقعات اور حقائق کو آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو اسلام اور اسلامیوں پر گزر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ حکمراں قوم کے لیئے ہندوستان کی سرزمین سب سے زیادہ مہلک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا آخری دورِ حکومت اور اگر آپ اجازت دیں تو اس میں مغلوں کا پورا عہد حکومت شامل کر لوں، جہاں تک نفسِ اسلام اور معاشرت اسلامی کا تعلق ہے، کچھ زیادہ خوش آیند نہ تھا ملک میں کچھ اس طور پر امن و تسلط قایم رہا اور بیرونی حملوں کا احتمال اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا وہ مذہب جو ہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا تھا اور جس کے جوہر کشاکش حیات میں نمایاں ہوتے تھے، عافیت اور سکون کا خوگر ہو گیا۔ مسلمانوں کا مذہب اُن مذاہب سے

بالکل مختلف ہی جن کا مدار صرف معتقدات پر ہو وہ کشاکش حیات سے مقابلہ کرنے کے لیئے پیدا ہوا ہے نہ کہ سکونِ حیات سے بہرہ اندوز ہونے کے لیئے۔ وہ مذہب جو دنیا کی علایق اور پیچیدگیوں کو نظرانداز کر کے محض حیات بعد الممات کو پیش نظر رکھتا ہو یا جس کا مدار صرف رسمیات عبادت گزاری پر ہو، دنیا میں کامیاب نہیں رہ سکتا۔ شاہانِ مغلیہ کے دورِ حکومت کو آپ کئی حیثیتوں سے عہد زرّیں کہہ سکتے ہیں جہاں تک ملک کے نظم و نسق یا امن و تسلط کا تعلق ہے آپ جس طرح چاہیں اس دور کی تعریف فرمالیں لیکن اگر آپ اس حقیقت حال کا اسلامی نقطہ نگاہ سے مطالعہ فرمائینگے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ حالات اور واقعات کچھ بہت زیادہ اُمید افزا نہ تھے اور اس کا بہترین ثبوت، محی الملت اورنگ زیب عالم گیر کا دورِ حکومت تھا اورنگ زیب کی حکمرانی فی الحقیقت شریعت اسلامی کی ترجمان تھی، رہا یہ امر کہ یہ دور کامیاب بھی رہا یا نہیں۔ ایک بڑی حد تک متنازعہ فیہ ہے۔ بہر حال اگر ہم مخالفین ہی کے دعوے کو تسلیم کرلیں تو اس سے میرے نظریہ کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کی ناکامیابی ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے پیشروؤں نے شریعت اسلامی کی علم برداری کما حقہ نہیں کی تھی اور درحقیقت عالمگیر کا طرز حکومت اس غیر اسلامی طرز حکومت کا ردِ عمل تھا جس کے ذمہ دار اُن کے پیشرو تھے اس کے بعد جو مراحل پیش آئے اس میں مسلمانوں کو سخت سے سخت ہزیمتیں اُٹھانی پڑیں اب بجائے اس کے کہ کافی غور و فکر کے بعد ایک صحیح راستہ اختیار کیا جاتا، لوگوں نے یہ تصور کرلیا کہ واقعات جو رنگ اختیار کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ ایشیا کا صحیفۂ اخلاق پُرزہ پُرزہ ہوچکا تھا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ اپنی استعدادِ حیات ہی زائل کرچکا تھا یا اس میں فی نفسہٖ کچھ ایسی کمزوریاں تھیں جو سیلاب مغرب کی تاب نہیں لاسکتی تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود ایشیا اپنا دیرینہ سبق بھلا چکا تھا اور اسی وجہ سے اپنی استعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ لوگ غلط راستہ پر چلے اور خسارہ میں رہے لیکن سمجھتے یہ رہے کہ اس خسارہ کا باعث اصلی ان کی اسلاف کی وہ تعلیم تھی جس کے سمجھنے میں ان سے ابتدا ہی میں غلطی سرزد ہوچکی تھی۔

حضرات! طبائع کا یہ حال تھا کہ علم و فن کے ظاہری کمالات اُفق مغرب پر چمک اُٹھے، ایشیا ٹھوکر کھا چکا تھا اور بجائے اس کے کہ وہ خود اپنی قوتوں سے سنبھلتا یا گر کر اُبھرتا، مغرب نے اسے سہارا دے دیا اور وہ بھی اس طور پر کہ ایشیا اپنے اعضا و جوارح کی استعداد ہی کو فراموش کر بیٹھا، اس کے لیئے مغرب نے خیالات وضع کیئے، مطمح نظر قایم کیا، قلب و دماغ ایجاد کیئے اور کیا کیا نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنی صلاح و فلاح کا خالق اکبر مغرب کو قرار دے دیا۔ اس کے جو نتائج ظاہر ہوئے یا ہونے والے ہیں ان کا تذکرہ بے سود ہے۔ میں نے یہ تذکرہ محض اس خیال سے چھیڑا تھا کہ اس سے آپ

اندازہ کر سکیں گے کہ ہمارے قلب و دماغ اس وقت کن تاثرات کے حامل ہیں۔

حضرات! میں نے جو روئداد اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کی ہے وہ ایک حد تک مہمل اور غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے لیکن میں نے اس کا تذکرہ یوں ضروری سمجھا کہ اس سے آپ ہماری اس روحانی انجماد، اور مہلک غفلتوں کا اندازہ کر سکیں گے جو ہمارے موجودہ دورِ حیات پر محیط ہیں، میں عرض کر چکا ہوں کہ اردو کی طرف سے لوگ بے اعتنا ہونے لگے ہیں، اس کے متعلق چند وجوہ بھی پیش کئے گئے تھے۔ لیکن اس سلسلہ کی آخری بحث جو ابھی ختم ہوئی ہے آپ کی توجہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے وہ تمام اسباب پیش کر دیئے جو ہماری بے توجہی کے موجب ہیں۔ یہ واقعات اور حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ مسئلہ زیر بحث کو اس صورت میں پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ کیا ان حالات کے ماتحت اردو کی خدمت ہم پر لازم آتی ہے؟ لیکن اس سوال پر اظہارِ خیال سے قبل میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کو سب سے پہلے ان نوعیتوں کو متعین کر لینا چاہیئے جن کے ماتحت یہ مسئلہ بحث میں لایا جا سکتا ہے۔

تاریخی پہلو

حضرات! سب سے پہلے تو ہم کو اس کا تاریخی پہلو لینا چاہیئے۔ اردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس زبان کی بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے پڑی ہے۔ اس میں شک نہیں اس زبان کو مسلمان فاتحین اپنے ساتھ نہیں لائے، اس میں بھی شک نہیں اس کی اصل وہ پراکرتیں تھیں جو مختلف زمانوں میں مختلف طور پر نو واردوں کی گفت و شنید سے ممزوج ہوتی رہیں اور بالآخر شاہ جہاں کے دور میں بحیثیت مجموعی اردو کے نام سے موسوم ہوئیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف اس زبان کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں انھیں کا ذہن و دماغ کارفرما رہا اس لیے اس کے تحفظ اور تعمیم کی ذمہ داری بھی انھیں کے شانوں پر رکھی جائے گی۔ اردو کا موجودہ ادبی درجہ کیسا ہی کچھ ہو (جس کے متعلق میں اس سے قبل اظہار خیال کر چکا ہوں) اس میں شک نہیں وہ مسلمانوں کی تمدن و معاشرت ان کے ذہنی اور دماغی ترقی کی تنہا حامل ہے۔ لوگ اس حقیقت کو بہت کم سمجھ سکے ہیں کہ کسی قوم کی زبان اس کی قومی حیثیت کی علم بردار ہوتی ہے، کسی قوم کے ادلس آثار انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کے لٹریچر پر نظر ڈالیئے آپ پر یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو جائیگی کہ قومی زوال کی ابتدا ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے تشخصات ملی تک فنا ہو گئے ہیں۔ میں بخوف طوالت اس وقت تاریخی مثالیں آپ کے سامنے نہیں پیش کرنا چاہتا۔ آپ کسی قوم اور ملک کو نظر میں رکھ کر اس کلیہ کا جائزہ لیجئے۔ آپ ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچیں گے جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

ادبی پہلو

حضرات! اس کا دوسرا پہلو ادبی ہے۔ اس کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا اس کا میں نے ابتداہی میں اشارہ کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کو عربی اور فارسی پر کامل عبور ہو! میں تو یہاں تک عرض کرونگا کہ آج کل ان لوگوں کی بھی تعداد خال خال نظر آئے گی جن کو ان زبانوں میں مذاق سلیم حاصل ہو۔ اس کی ایک وجہ تو وہی جس کا میں اعادہ کر چکا ہوں یعنی مغربیت کا غلبہ، دوسرے یہ کہ عربی اور فارسی کے بہت سے جواہر ریزے خود اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور اب ضرورت کے وقت لوگ فوراً اُردو ہی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عربی اور فارسی سے بے خبر رہنے کے باعث مسلمانوں پر جو زوال نازل ہونے والا تھا، اور جو ایک حد تک نازل بھی ہو چکا ہے اُس کا تدارک اور سدِّ باب اُردو نے کر دیا اس طور پر اُردو ایک حیثیت سے مسلمانوں کی قومی زبان ہو چکی ہے اور اسے وہ ادبی منزلت حاصل ہو چکی ہے جس کی ہم کو ضرورت تھی۔ اس کی تیسری حیثیت معاشری ہے۔ آج کل ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کے کم و بیش سات کروڑ نفوس قدسی داد زیست دے رہے ہیں۔ اور جو بیس کروڑ دیگر مذاہب کے نام لیوا ہیں، اُردو کم و بیش ہر جگہ بولی نہیں تو سمجھی ضرور جاتی ہے۔ اُردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان ایسی نہیں جو ہندوستان میں اس کثرت اور سہولت کے ساتھ بولی یا سمجھی جاتی ہو۔ یورپ میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں جن کے بولنے اور سمجھنے والے نسبتاً بہت کم تعداد میں پائے جائیں گے تاہم ان زبانوں کی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں تو یہاں تک عرض کرونگا کہ جو حیثیت فرنچ کو یورپ میں حاصل ہے وہ اُردو کو ہندوستان میں نصیب ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ یورپ فرنچ کا گہوارہ ہے، ہندوستان صرف اُردو کی لحد تاریک!

حضرات! اُردو کی مختلف نوعیتیں آپکے سامنے پیش کی جا چکیں آپ اس کی اہمیت سے بھی آشنا ہو چکے اب میں آپکے سامنے چند ایسے واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی بناء پر آپ کو اُردو کی حمایت میں حصّہ لینا چاہیئے۔ دشواریاں ضرور زیادہ ہیں لیکن دشواریاں اُسی وقت تک دشوار رہتی ہیں جب تک اُن سے عہدہ برآ ہونے کا عزم نہ کر لیا جائے، طلب صادق اور عزم محکم سے بسا اوقات تقدیریں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ اسی قسم کی دقتیں عرفی کے سامنے تھیں جن کا اس نے ہمیشہ کے لیئے یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا تھا ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خوان چو محمل را گراں بینی

حضرات! اُردو ہماری گزشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگوار ہے۔ یہ حقیقت کہ اس کا دامن

ہماری ذات کے ساتھ وابستہ ہیں یا اُس کے تکوینِ وجود کے دوسرے ذمہ دار ہیں۔ اس واقعہ سے آشکار
ہو جاتی ہے کہ ہم اس کے عالمِ وجود میں لانے کے ذمہ دار نہ بھی ہوں، اغیار اسی بنا پر اس کی بیخ کنی پر آمادہ
ہیں۔ پھر یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ہماری یا ہم اس کے نہیں ہیں۔ اگر اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت
آشکار ہو جائے گی کہ اُردو کے ساتھ اغیار کو جو مخالفت ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُردو کو عربی اور فارسی
سے وابستگی ہے، اس نے مسلمانوں کے آغوش میں آنکھ کھولی اور مسلمانوں نے اس کے تحفظ، نشر و تعمیم میں
اپنے بہترین سرمایہ ذہنی اور دماغی سے دریغ نہیں کیا۔ اس حقیقت سے مجھے خود انکار نہیں ہے بلکہ میں اس پر
فخر کرتا ہوں کہ وہ عربی اور فارسی الماس ریزوں کی آئینہ دار ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کا دامن
دوسری زبانوں کے جواہر ریزوں کے لئے کبھی تنگ رہا ہے۔ جہاں تک اس کی وسیع دامانی اور سیر چشمی کا تعلق
ہے، دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نے بخوفِ طوالت اس کی ابتدائے تاریخ کہیں نہیں پیش
کی ہے اور نہ اب اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ترکی، اسپینی، پرتگالی، انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت
اور بھاشا وغیرہ سے کس طور پر ممزوج کی گئی ہے اور ان زبانوں کے الفاظ کس طور پر اور کس حد تک اس میں
موجود ہیں۔

حضرات، اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی قومی زبان ام الالسنہ عربی ہے جس کا حاصل کرنا
ان کا قومی شعار ہونا چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ نسل میں کم لوگ ایسے ملیں گے جو اسلامی تہذیب اور
معاشرت کے اُن ادبی لطائف اور حکیمانہ معارف سے براہ راست آشنا ہو سکتے ہیں جن کی عربی اور فارسی
ادبیات حامل ہیں۔ ہم میں کم لوگ ایسے مل سکتے ہیں جو فارسی یا عربی زبان پر کامل عبور رکھتے ہیں اور ان سے
براہ راست صحیح طور پر کچھ بھی اخذ یا اقتباس کر سکتے ہیں اور بعض اوقات اسی بنا پر نہایت فاحش غلطیاں
سرزد ہو چکی ہیں۔ ان علوم سے جس سے کچھ ہم ناآشنا ہیں اس کی کمی صرف اُردو سے پوری ہو سکتی ہے اور ہوتی
ہے۔ تقریباً تمام مشہور اور ضروری عربی فارسی کتابیں اُردو کا جامہ اختیار کر چکی ہیں۔ اس میں شک نہیں اس
سلسلہ میں ترقی کی بے حد گنجائش اور ضرورت ہے لیکن اگر ہم اس ضرورت کو ایمانداری کے ساتھ محسوس
کرتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی قوتِ عمل کو بر سرِ کار نہ لائیں۔

جگت بھاشا

حضرات، دوسرا امر جو میں اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ
اُردو کے لنگوا فرینکا (جگت بھاشا) ہونے کا ہے یہ ایک نہایت معرکۃ الآرا مسئلہ ہے
جس پر مخالفین اور موافقین دونوں اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں اور چونکہ یوماً فیوماً یہ نہایت
اندیشہ ناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے، میں محض اس خیال سے کہ آپ شاید ایک صحیح نقطۂ خیال پر آسانی

کے ساتھ پہنچ سکیں، اسے کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حضرات، جو مسئلہ اس وقت اس درجہ اہم اور وقیع نظر آرہا ہے، اس کی ابتدا آج سے تقریباً ساٹھ سال بیشتر ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعے سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ اسی سوسائٹی سے ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن عالم وجود میں آئی جس نے دوسرے ہی سال وائسرائے کی خدمت میں چند معروضات پیش کیں جن کا ایک مختصر خاکہ میں آپ کے سامنے پیش کرونگا۔

۱۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

۲۔ دیسی زبانوں میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبۂ کلکتہ یونیورسٹی انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳۔ یا تو ایک اُردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔

یہ تجویز گورنمنٹ نے ایک حد تک پسند کرلی تھی لیکن ۱۸۸۲ء میں جب دیسی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو واقعات نے دوسرا پہلو اختیار کیا اور یہ تجویز بار آور ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ۱۹۱۷ء میں یہ مسئلہ پھر حکومت کے سامنے آیا، اس موقعے پر ہزا کسلنسی وائسرائے نے اپنے خیالات کا جس طور پر اظہار فرمایا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "اگرچہ مجھے ان اصحاب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے جو دیسی زبانوں سے بے پروائی کئے جانے کے شاکی ہیں لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا عملی پالیٹکس سے باہر ہے۔ اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت مختلف دیسی زبانوں کا وجود ہے جس کا کوئی قابل اطمینان علاج اب تک نہیں پیش کیا گیا۔"

ہزا کسلنسی کے ان خیالات پر اگر آپ غور فرمائیں تو جہاں اور بہت سی باتیں معلوم ہونگی یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان میں ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور یہ ضرورت صرف آج نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ یہ مسئلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے زیر بحث رہا ہے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کے سامنے کمپنی مذکور کے ایک فاضل رکن مسٹر کریو کے خیالات پیش کرتا ہوں۔ وھو ہذا:

"اُردو کی اس وقت یہاں حالت بجنسہ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس ایک اُردو کے جان لینے سے ایک حصۂ ملک سے دوسرے حصہ ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ، کسی معاون اور ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اُردو، عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور

فارسی خط میں (بہ نسبت دیوناگری کے) اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے۔"

حضرات، اُردو کی یہ حالت اس وقت تھی جب وہ آج سے بقدر سوا سو سال نوعمر تھی!
یہ اُردو کے اسی استعداد اور ہمہ گیری کا تصرف تھا کہ آخر ۱۸۳۵ء میں یہ سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی، اس مدت دراز میں یہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل کی مجھے ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو نے قلعہ معلّٰی سے ہجرت کرکے فورٹ ولیم میں پناہ لی تھی اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم میں اُردو کالج قائم ہوا تھا، سرکاری سرپرستی اور کلکتہ کی آب و ہوا دونوں راس آئیں اور تقریباً نصف صدی تک اُردو وہیں پھلتی پھولتی رہی۔ لیکن آخرکار یادِ وطن غالب آئی اور ۱۸۴۰ء میں، ڈاکٹر اسپرنگر کی نگرانی میں دلی میں ایک اردو سوسائٹی قائم ہوئی جو غدر تک نہایت کامیابی کے ساتھ ترقی کے ابتدائی مراحل طے کرتی رہی اس کے بعد علی گڑھ اور سائنٹفک سوسائٹی کا دور آتا ہے جس کا ایک مجمل تذکرہ آپ اس سے قبل سن چکے ہیں۔

حضرات، اس مختصر سرگزشت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ابتدائے عہد انگریزی سے ہی ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ابتدا ہی میں یہ حقیقت تسلیم کرلی گئی تھی کہ ہندوستان میں اگر کسی زبان میں حکمت بہاشا ہونے کی صلاحیت تھی تو وہ اردو تھی۔ جس حد تک اس بحث پر گفت گو ہو چکی ہے اور جن واقعات کا میں تذکرہ کر چکا ہوں کیا اس کے بنا پر یہ عرض نہیں کرسکتا کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے۔ اُردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اُٹھاتے ہیں وہ حقیقتاً زبان کے فلسفہ سے ناآشنا ہیں۔ اردو کی ساری داستان آپ کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے اس کے اجزاء ترکیبی پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوگا کہ اس میں ہندو مسلم اتحاد کے عناصر پورے طور پر ممزوج ہو چکے ہیں اور اب صرف جہالت اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا بہترین مظہر خود اُردو ہے!

نفسِ زبان

حضرات! زبان تین چیزوں سے مرکب ہے، اسماء، افعال اور حروف۔ زبان کی اصل افعال اور حروف پر ہے۔ اسماء دوسری زبانوں سے منتقل ہوتے رہتے ہیں، مٹتے رہتے ہیں اور بدلتے جاتے ہیں، جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور وسائل آمد و رفت میں ترقی ہوتی جائیگی، اسماء کا ہر زبان میں اضافہ ہوتا رہے گا، خود عربی اس سے بری نہیں ہے۔ سیکڑوں اسماء اور الفاظ دوسری زبانوں کے آکر مخلوط اور ممزوج ہو گئے ہیں، فارسی میں بے شمار الفاظ عربی کے آکر مل گئے ہیں۔ انگریزی میں بے شمار یونانی اور لاطینی الفاظ ہیں، بایں ہمہ آپ ان کو عربی، انگریزی یا

فارسی ہی کہتے رہتے ہیں۔ اسی طور پر اگر غریب اُردو میں عربی فارسی اسما، مل گئے ہیں تو اس سے اس کے ہندوستانی ہونے میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کے تمام تر افعال تمام تر حروف اور نصف اسماء بھاشا یا ہندی ہیں۔ اس میں شک نہیں ہندو اور مسلمانوں کے قومی اور مذہبی ضرورتوں کے لحاظ سے جو کبھی نہیں مٹ سکتیں اس کا خزانہ عاریت با ختلاف قومیت عربی فارسی اور سنسکرت ہی رہیگا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ مصر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہیں"۔ (مقتبس)

رسم الخط

حضرات! دوسرا اعتراض اُردو پر رسم الخط اور اس کی پیچیدگیوں کا ہوتا ہے۔ یہ اعتراض نہایت معرکۃ الآرا ہے اور میں اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، اُردو اور اُردو کا رسم الخط دونوں ہندو مسلمانوں کا ایک پُرخلوص تاریخی معاہدہ ہے جس پر دونوں ایک عرصہ تک کاربند رہے، مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر عربی، فارسی اور ترکی کو پس پشت ڈالا اور اپنے ملکی بھائیوں کی زبان کو سر آنکھوں پر لے لیا اور اس طور پر انتہائے ایثار کا ثبوت دیا، ہندوؤں نے اس کا یہ معاوضہ دیا کہ انھوں نے اپنے نوواردِ مہمانوں کے وہ حروف اختیار کرلئے جو سامی عہد کے یادگار تھے۔ اس طرح پر گویا رشتۂ زنّار میں تسبیح کے دانے پروئے گئے! بہر حال اگر اب یہ معاہدہ نظر انداز کرنے کے قابل ہوگیا ہے اور یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اُردو رسم الخط فی نفسہ ناقص ہے تو آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ فی الحقیقت یہ "حروف نہ صرف مختصر نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ اور فنِ تحریر کے ارتقاء کی جامع اور مختصر تاریخ اور پٹ مین کے معلم اور ہادی ہی تھے بلکہ تاریخ زبان اُردو کے وہ بے مثل مفسر اور شارح بھی تھے کہ بہ یک نظر اُن کل الفاظ کو مع ان کی پوری شکل و شمائل اور صحیح آواز و معنی اور حسبت و درست لب و لہجہ کے عیاں و ظاہر کرسکیں جن کے آمیزش سے یہ زبان صدیوں کی کد و کاوش کے بعد آج شرفا و نجبا کے منہ تک آنے کے قابل اور لائق بنی اور اپنے گزشتہ کارناموں کو آپ بتا رہی ہے"۔ رسم الخط کے متعلق آج کل ایک نہایت مفید بحث چھڑی ہوئی ہے اور رسالہ "اُردو" میں چند نہایت سنجیدہ اور جامع مضامین اس مبحث پر شائع ہوچکے ہیں لیکن جہاں تک میری رائے ہے یہ نقص اتنا سنگین نہیں ہے کہ اُردو من حیث الکل موردِ لعن و طعن قرار دے دی جائے یا جس کی بنا پر بہی خواہانِ اُردو کو مایوس اور بددل ہونا چاہیئے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط ایسا نہیں ہے جس میں دوسری زبانوں کے وہ الفاظ جو صحیح مخارج سے ادا کئے جائیں ظاہر ہوسکیں تلفظ کا اظہار کسی رسم الخط سے نہیں ہوسکتا اس کے لئے صرف سامعہ اور ناطقہ کی ضرورت ہے۔ انگریزی کے بعض الفاظ

کو لے لیجئے جہاں تک الفاظ میں حروف کی نشست و دروبست کا تعلق ہے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا (بشرطیکہ اس نے ان کا صحیح تلفظ کہیں سنا نہ ہو) کہ ان کا صحیح تلفظ کیا ہوگا، پھر اس کا کیا علاج کہ کسی زبان کے مخصوص لب و لہجہ کو دوسری زبان والا ٹھیک طور پر ادا بھی نہیں کر سکتا، اس بنا پر اس زبان کے رسم الخط پر حرف نہیں آتا۔ تلفظ کا مدار اس میں شک نہیں ایک بڑی حد تک رسم الخط اعراب اور حرکات پر ہوتا ہے لیکن یہ فرض کر لینا کہ اس کا مدار صرف اسی پر بالکل ناروا ہوگا، دنیا میں ایسی زبانیں بھی کبھی رائج رہی ہیں جن کے الفاظ اور حروف کچھ اور ہوتے تھے اور ان کا تلفظ کچھ اور ہوتا تھا، اس کی بہترین مثال "پہلوی" ہے پھر دور کیوں جائیے انگریزی میں بھی ایسے الفاظ ملیں گے جن کے حروف اور اور ان کی دروبست سے ان کے تلفظ کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اس رسم الخط کے سیکھنے میں نہایت دقت اور طوالت ہوتی ہے اس کے متعلق میں اکبر کے وقت کا طریقہ تعلیم آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تذکرہ بابو نرندر ونا تھ نے "ترقی علوم" میں کیا ہے وہو ہذا:

"بچوں کو پہلے فارسی حروف تہجی سکھائے جاتے اس میں آٹھ دن سے زیادہ نہ لگتے، املا سکھانے اور پڑھانے میں دو تین روز صرف ہوتے۔ پھر جملے اور اخلاقی فقرات بتلائے جاتے اور ایک ماہ کے اندر اندر (اس غیر زبان کو) لڑکا خود سب پڑھ لیتا۔"

حضرات! اس بیان میں بالکل مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہندی املا اس سے سہل ہے اور اس میں املا کی غلطیوں کا کم احتمال ہے، لیکن زود نگاری اور مختصر نویسی کی مثال صرف اُردو رسم الخط میں مل سکے گی۔ اب رہا یہ امر کہ عربی اور فارسی الفاظ کا املا نسبتاً مشکل ہے اور اس میں غلطیوں کی گنجائش ہے۔ اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ جن کا املا مشکل ہوتا ہے بالعموم ایسے وقت استعمال میں لائے جاتے ہیں جب طالب علم، تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر لیتا ہے اور اسے فارسی عربی میں کسی قدر دستگاہ حاصل ہو جاتی پھر ایسی حالت میں اُسے املا کی کوئی دقت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ معمولی نوشت خواند کا طالب علم ہر زبان کے املا میں غلطی کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ بہر حال اگر اُردو کا مقابلہ ہندی سے ہے تو اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہندی خط سے زیادہ آسانی کے ساتھ اُردو خط پڑھا جا سکتا ہے اور اسی حقیقت کو مد نظر رکھ کر، اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ہے:

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو	بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں	کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

حضرات! اصل یہ ہے کہ جو لوگ یا جو قومیں ہندو مسلم اتحاد کو کسی خاص غرض کی بنا پر غیر مفید سمجھتی ہیں وہی اُردو ہندی کے مناقشہ کو مہمیز کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کے خلوص نیت پر حرف نہیں لایا جا سکتا تو میں عرض کرونگا کہ فی الحال آپ رسم الخط کے مسئلہ کو مختلف حصص ہندوستان کے رواج پر کیوں نہ چھوڑ دیں، رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود مٹ جائیں گے ہم کو اس وقت اکبر مرحوم کے اس خیال کو ذہن میں رکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیئے ؎

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں، اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں پر ایک اکھاڑا قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

فارسی عربی

حضرات! اُردو پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ اس کثرت سے آتے ہیں کہ ان کا سمجھنا یا یاد رکھنا سیکھنا دشوار ہوتا ہے۔ اس اعتراض پر کچھ اور عرض کرنے سے قبل میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کونسی زبان ہے جس کا سمجھنا، لکھنا پڑھنا یا سیکھنا دشوار نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہے۔ انگریزی سے زیادہ غیر مانوس زبان تو ایک ہندوستانی کے لئے بمشکل کوئی اور ہو سکتی ہے لیکن ابتدائے آپ کو مدراس یا کلکتہ نواح فورٹ ولیم میں بہت سے ایسے جاہل محض مل سکتے تھے اور اب بھی مل سکتے ہیں جو دیگر زبانوں سے نا آشنائے محض تھے لیکن اپنا مافی الضمیر آسانی کے ساتھ انگریزی میں ادا کر سکتے تھے۔ بہت سے ہندوستانی سپاہی جو جنگ یورپ میں شریک تھے، ایسے ملیں گے جو باوجود اس کے کہ نہایت قلیل عرصہ تک یورپ کی سرزمین پر رہے، ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ہندوستانی جس کی خمیر میں ہندوستان کی آب و گل موجود ہے اور جس کے ہوش و حواس اور ذہن و دماغ یہاں کی لب و لہجہ سے آشنا ہیں اُردو نہ سیکھ سکے یا اس میں نہایت آسانی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ جہالت، تعصب اور تنگ نظری کو خیرباد کہدیا جائے تو ہمارے ابنائے وطن اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ اُردو ہی ایسی زبان ہے جو نہایت آسانی کے ساتھ معقول انام بنائی جا سکتی ہے۔ اگر کسی خاص امر کی بنا پر وہ کوئی دوسری زبان اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کم از کم یہی محسوس کر لینا چاہیئے کہ اُردو اس سلسلہ میں دوسری زبانوں سے زیادہ قطع مسافت کر چکی ہے۔ وہ ہندوستانی زبان جس کا خاکہ ہندوستان کے سب سے بڑے مقتدر فرد نے پیش کیا ہے وہ

کسی حیثیت سے علمی یا ادبی زبان نہیں بن سکتی۔ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ اسے علمی یا ادبی ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے تو میں عرض کروں گا کہ آخر اس میں کیا قباحت ہے اگر ہم ایک ایسی زبان کو ترقی دیں جس میں دونوں صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، آخر ہندوستانی کا مفہوم کیا ہے۔ شاید اس کے یہی معنی ہوں کہ اس زبان کے تمام الفاظ ایسے ہوں جو کسی بیرونی زبان سے مستعار نہ لئے گئے ہوں یا ان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نہ ہو، میں نہیں سمجھ سکتا، دنیا میں کوئی زندہ زبان بیسویں صدی میں ایسی بھی دریافت کی جاسکی ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کم و بیش نہ پائے جاتے ہوں۔ ہندوستانی زبان کا علمی مفہوم میرے نزدیک یہ ہے جسے عام لوگ آسانی کے ساتھ سمجھ لیں یا جس میں سہولت کے ساتھ اظہار خیال کرسکیں۔ اگر یہ مفہوم صحیح ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کیا اُردو بہمہ وجوہ ان صفات سے متصف نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان خواہ وہ کیسی ہی صاف سلیس اور شستہ کیوں نہ ہو، ادنیٰ طبقہ کے لب و لہجہ میں جب ادا کی جائیگی اس کی مخصوص لطافتیں بالکل مفقود ہو جائیں گی۔ وہ 'ہندوستانی' جس کا خاکہ مہاتما گاندھی نے پیش کیا ہے ہمارے سامنے ہے۔ میرا خیال ہے پنڈت مالوی بھی اسی کی علم برداری کا دم بھرتے ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کیا وہ زبان جسے پنڈت موصوف بولتے ہیں ایک دہقانی یا ادنیٰ طبقہ کے زبان پر آنے کے بعد اپنی مخصوص لطافتیں (اگر کوئی ہوں) قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر جب اصل ہی بے حقیقت اور رکیک ہو تو اس کا ان لوگوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوگا، کم سے کم میرے حیطۂ تخیل میں تو بالکل نہیں آسکتا۔ اس سلسلہ میں میں انگریزی کی مثال بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک مکمل اور مبسوط زبان تسلیم کی گئی ہے لیکن آپ نے کبھی اسے کسی گورے سپاہی کی زبان سے بھی سنا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آپ شیکسپیر، ملٹن، گولڈ اسمتھ یا ٹینیسن یا خود انگریزی زبان کو مورد لعن و طعن بنائیں تو کہاں تک حق بجانب ہونگی۔ اسی طور پر اگر کوئی نرا دیہاتی شستہ اُردو بول یا سمجھ نہیں سکتا تو عربی اور فارسی کیوں مورد عتاب ہو۔ اس سے بھی قطع نظر کیجئے، پوربی زبان کا شمالی ہند کی دیگر زبانوں سے مقابلہ کیجئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خود بھاشا جو اُردو کا ماخذ بتائی جاتی ہے اور جو پورب کی زبان ہے، ہر اعتبار سے قریب تر ہے، عوام کی سمجھ سے بلند ہے۔ میرا تعلق خود پورب سے ہے اس لئے ممکن ہے آپ میرے اس نظریہ سے اتفاق نہ کریں، میں خود جب تک پورب میں رہا اکثر یہ خیال کرتا رہا کہ پورب کی زبان کچھ زیادہ قابل رشک نہیں ہے لیکن اب جب کہ مجھے پچھم کے اضلاع میں رہنے کا اتفاق ہوا اور یہاں کے عوام کے لب و لہجہ سے آشنا ہوا مجھے یقین ہو گیا کہ پورب کی زبان کئی اعتبار سے قابل ترجیح ہے۔ الفاظ کے ذخیرہ سے مجھے بحث نہیں ہے، اس میں پورب کو ہر نوع تفوق حاصل ہے، جہاں تک کسی زبان کے سہل و رواں ہونے کا تعلق ہے، مشرق کو مغرب پر ترجیح حاصل ہے۔ آپ معاف فرمائیں اس

رخیال سے میری نیت کسی پر حملہ کرنے کی نہیں ہے مقصد صرف یہ تھا کہ جس زبان کو ہندوستانی کہا جاتا ہے
رئی ایسی چیز نہیں ہے جو زبان کے مسئلہ پر آخری لفظ ہو!

حضرات! اُردو کے متعلق جو اعتراضات ہیں وہ کم و بیش آپ کے سامنے پیش کر دیئے
گئے۔ میری فہم و استعداد اور آپ کے صبر و تحمل نے جہاں تک مساعدت کی، ان کے جوابات
عرض کر دیئے گئے۔ مجھے ایک امر کے متعلق اور عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اُردو پر یہ الزام
ہیں کہ وہ مشکل اور دقیق ہے وہ اُردو کی مختلف اقسام کی تحریر پر کیوں نہیں نظر ڈالتے۔ وہ لوگ جو عربی
جز ثقیل اور خطابت کے دل دادہ ہیں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی تحریریں پڑھیں اور لطف اندوز
۔ جو لوگ سنجیدہ، متین اور علمی طرز تحریر کے دل دادہ ہیں وہ مولانا عبدالماجد صاحب بی اے اور ارباب
صنفین (اعظم گڈھ) کے طرز انشا سے سبق حاصل کریں۔ جو لوگ شستہ، سلیس اور آسان اُردو پڑ
ھتے ہیں ان کو مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیئے
رنگینی، لطافت، لوچ اور انشاء جمیل کے طلب گار ہیں ان کو مولانا نیاز فتحپوری کا اتباع کرنا چاہیئے
حزن اور حسرت و غم کی مصوری پسند کرتے ہیں ان کو مولانا راشد الخیری (مصور غم) کی پیروی کرنی
مضحکات اور طنزیات کا رنگ مطلوب ہو تو ڈاکٹر نذیر احمد، سجاد حسین اور سید محفوظ علی صاحب
ن کی عمر میں برکت عطا فرمائے) رنگ اختیار کیجئے، ٹگوریت پسند خاطر ہو تو شباب اُردو کی صفحہ گردانی
چٹکیاں اور گدگدیاں منظور ہوں تو خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کیجئے۔ بہرحال کوئی
ور کوئی درجہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شخص کے لئے موزوں نہ ہو۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا، ارباب
ردو کو کیوں اس درجہ قابل عتاب تصور فرماتے ہیں۔ یہاں غالباً میرا یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ
اُردو کو مشکل بتاتے ہیں اس واقعہ سے بے خبر نہ ہونگے کہ کعبہ ہندوستان بنارس سے خود ایک
کا روزانہ اخبار شائع ہوتا ہے جس کی عبارت خاص طور پر مشکل رکھی جاتی ہے اور اسی باعث سے
اشاعت بھی کچھ بہت زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ مالک اخبار سے اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا گیا
نے متعدد بار یہی جواب دیا کہ مالی مشکلات کی طرف سے کارکنان مطبع کو بے فکر رہنا چاہیئے، وہ
س کا کفیل رہے گا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام مشکل ہندی سمجھنے اور لکھنے کے عادی
جائیں!

حضرات! بایں ہمہ ابھی اُردو میں اصلاحات کی گنجائش ہی نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ میں اس
یں فی الحال دو امور خاص طور پر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اول تو یہ کہ اُردو کی تعلیم

کیونکر دینی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اُردو لکھنے میں کن کن پابندیوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ مجھے افسوس ہے اور اپنے اس ہزیمت کی ندامت ہے کہ جس چیز کو میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور قابل پرہیز سمجھتا تھا وہ آج

تعلیم اُردو

مجھکو لامحالہ کرنی پڑتی ہے۔ یعنی کسی موضوع بحث کا تجزیہ اور اس کی تقسیم اور ترتیب (بالفاظ دیگر (Classification) تقسیم اور ترتیب فی نفسہ معقول چیز ہے اور ناظرین یا سامعین کو مرعوب کرنے کا اس سے بہتر اور موثر کوئی طریقہ نہیں ہے لیکن ذوقِ شعری اور لطف ادب کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنا جو ایک ماہر علم فعال الحیات یا علم نباتات، کسی نقیب برشگال یا حسین شگوفہ کے ساتھ جائز رکھتا ہے، کہاں تک ہماری سخن فہمی اور ادب نوازی کی دلیل ہے ایک سوال ہے جس کا جواب بطیب خاطر نہیں تو کم سے کم بنظر تالیفِ قلوب آپ میرے موافق ہی دیں گے۔

حضرات! اس تقسیم اور ترتیب سے پہلے میں یہ عرض کرونگا کہ تعلیم اُردو کے لئے ہر معلم کو سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ زبان کی تعلیم دیگر علوم اور فنون کی تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ زبان کے علاوہ بیشتر علوم ایسے ہیں جن کو آپ ایک حد تک متشکل کرکے ہر طالب علم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم آپ مختلف اقسام کی تصاویر، نقشوں اور خود مخصوص مناظر فطرت یا مقامات متعلقہ کو پیش نظر کرکے دے سکتے ہیں اور وہ بھی اس طور پر کہ وہ تمام عمر فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ سائنس کی تعلیم آپ اس طور پر دے سکتے ہیں گویا ہر طالب علم کے سامنے نوامیس فطرت خود بے نقاب ہو رہے ہیں۔ صنعت اور دستکاریوں کے نمونے آپ خود پیش کر سکتے ہیں اور ہر طالب علم ان کو دیکھکر اور چھوکر بسا اوقات جلد سے جلد ایک دستکار اور صنعت گر بن سکتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد اسلحات کے استعمال سے واقف اور قواعد پریڈ سے آشنا ہوکر سپاہی بن سکتا ہے۔ لیکن علم اور ادب کے میدان میں اعضا و جوارح کام نہیں دیتے۔ یہاں ذہن و دماغ کی کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ذہن و دماغ ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو مارشل لا یا ماسٹر صاحب کا خوف ہو۔ ان پر دسترس حاصل کرنے کے لئے ذہن و دماغ ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد شاعر بنایا جا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ شاعر پیدا ہی ہوتا ہے۔ لیکن کوئی شخص جلد سے جلد ادیب نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر وہ چیز جو فطری ہے سہل ہے لیکن جہاں تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یا تحصیل و اکتساب کا سوال آتا ہے وہاں ایسی دقتیں پیش آتی ہیں جن پر آپ سہولت کے ساتھ عبور نہیں حاصل کر سکتے اس لئے میں آپ سے درخواست کرونگا کہ آپ تعلیم زبان کے مسئلہ کو بالکل ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے جس امر کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ متعلم نہیں بلکہ معلم سے متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک خود معلم صاحب ذوق، ہمدرد اور ذہین نہ ہوگا وہ طلبا کو اپنے موضوع

تعلیم کا شائق نہیں بنا سکتا۔ آپ اس کلیہ کو ایک ادنیٰ حقیقت پر محمول کرینگے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ادبیات کی تعلیم کے لئے ان صفات کی موجودگی لازمی ہے۔ بہر حال اب میں ان صفات کے متعلق کچھ عرض کرونگا جو ایک اُردو معلم کے لئے میرے نزدیک ضروری ہیں۔

معلم کی صفات

(۱) معلم کو زبان فارسی پر کامل دستگاہ اور عربی پر وقوف حاصل ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں بھاشا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اُردو کے مشہور مصنفین کی تصانیف اور ان کا طرز انشا اس کی نظر میں ہو۔

(۳) مروجہ اُردو کے ہر پہلو سے اسے آشنا ہونا چاہیئے۔

(۴) وہ خود صاحب ذوق ہو اور طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہو۔

حضرات! میں نے تعلیم اُردو کے لئے فارسی کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس کے خاص وجوہ ہیں۔ اُردو کے عناصر ترکیبی کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس حقیقت سے بمشکل انکار کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اُردو زبان سے فارسی آب و رنگ حذف کر دیا جائے تو پھر گلستان کے بجائے صرف ایک فریب رنگ و بو رہ جاتا ہے۔ میرے بہت سے کرم فرما اُردو اور فارسی کو میرے ایک ہی سانس میں ادا کرنے سے شاید پہلو بدلنے لگیں۔

لیکن میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فارسی آب و رنگ اور فارسیت میں فرق ہے۔ بے شک ایسی اُردو جس پر ریختہ فارسی کا اطلاق ہو یا جو غیر مانوس عربی الفاظ سے مرکب ہو، قابل پزیرائی نہیں ہے۔ اُردو کی تعمیر میں عربی اور فارسی کو جیسا کچھ دخل رہا ہے اسے آپ کم و بیش واقف ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُردو کو موجودہ حالت میں لانے کی جس حد تک یہ دونوں زبانیں ذمہ دار ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی آمیزش اب بھی اسی نسبت سے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اردو اپنے ابتدائی مراحل طے کر چکی ہے اب ان اسباب اور ذرائع پر ضرورت سے زیادہ زور دینا روا نہیں ہے جن پر کاربند ہونا ابتدا میں ضروری اور لازمی تھا۔ میرا مقصد صرف ایک کلیہ پیش کرنے کا ہے، یعنی اُردو کے مصحف حسن میں فارسی خد و خال لازمی ہے یہاں خد و خال، محض حسن کی اضافی حیثیات نہیں ہیں اور اس کلیہ کو محض شاعرانہ حسن بیان پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ پاکیزہ اُردو جسے میں بلاخوف تردید ہندوستان میں وہی حیثیت دینا چاہتا ہوں جو فرنچ کو مغرب اور فارسی کو مشرق میں حاصل ہے، فارسی کے بغیر ایک جسد بے روح ہے۔ نظر برآں اگر معلم فارسی سے بالکل بے بہرہ ہے یا زبان سے آشنا ہے لیکن اس کی لطافتوں سے بیگانہ ہے یا اسے یہ ملکہ حاصل نہیں ہے کہ وہ کس طور پر فارسی کو اُردو کے مطابق بنا سکتا ہے، وہ طلبا کو یا تو صحیح راستہ پر نہیں ڈال سکتا یا ان کے ادبی ذوق کا معین نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص اس وقت تک اُردو کا اچھا معلم نہیں بن سکتا جب تک نہ صرف اسے فارسی پر عبور ہو

بلکہ اُردو پر بھی کامل دسترس رکھتا ہو۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ ملیں گے جن کی فارسی قابلیت مسلم ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی اُردو بھی لکھ سکتے ہوں۔ بلکہ بعض مثالیں تو ایسی ملیں گی جہاں فارسی کا عالمِ متبحر اُردو کے میدان میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک فارسی عالم اچھا اُردو نویس نہیں ہو سکتا۔ میرا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ جب تک کوئی اردو نویس اس حقیقت کو فراموش نہ کر دے کہ اسے فارسی یا اُردو کے جرِ ثقیل پر پورا عبور ہے اس وقت تک وہ سلیس اور پاکیزہ اُردو لکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا ایک مُمتحن وقت سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے قوت اور صلابت کو برسرِکار لاکر راستہ میں بڑی بڑی سنگلاخ چٹانیں یا تناور درختوں کو لاکر ڈال دے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اس کے دشواریوں کو ایسا دُور کرتا جائے کہ دوسروں کو چلنے میں آسانی ہو یا اس راستہ کو اختیار کرنے کی لوگوں میں جرأت پیدا ہو۔ اس لئے ہر معلم کا فرض ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اسے اتنا سہل گزار بنا دے کہ اس کے پیروں کو چلنے میں سہولت اور آسانی ہو۔ اچھے اُردو نویس کم ایسے دیکھے گئے ہیں جن کو فارسی پر کم و بیش عبور نہ ہو۔ اردو داں حضرات کو ابھی نہیں معلوم ہے کہ ادبیات کی کتنی شاہراہیں ہیں اور ان سے کس طور پر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ علمائے فارسی ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں ان کو معلوم ہے کہ کس سفر اور کس راستہ میں کس قسم کی زادِ راہ یا اسباب کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس میں شک نہیں بہت سے علوم ایسے ہیں جہاں اُردو کی رسائی فی الحال ناممکن ہے لیکن اگر آپ اُردو کے استعداد جذب اور قوت اکتساب پر غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ دشواری ایسی نہیں ہے جہاں صبر و شکر کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں عربی کے متعلق بھی اظہارِ خیال ضروری ہے۔ عربی مشتقات اور مصادر اگر کام میں نہ لائے جائیں تو پھر اُردو ایک بے مایہ زبان رہ جاتی ہے۔ عربی ترکیبیں بعض اوقات اُردو کی بہت سی مشکلات دُور کر دیتی ہیں۔ بالخصوص تراجم میں عربی کی کارفرمائی ناگزیر ہو جاتی ہے اُردو میں جدید اصطلاحیں وضع کرنے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جن کو اس فریضہ سے آج کل عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں بعض اوقات ہندی الفاظ بھی نہایت سہولت کے ساتھ کھپ جاتے ہیں لیکن ان میں خرابی یہ آن پڑتی ہے کہ تصریفی سہولتیں تقریباً ناممکن ہو جاتی ہیں۔ عربی میں اس کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے اسماء اور کبھی کبھی افعال جب اُردو میں منتقل ہوتے ہیں اس وقت ہم کو اکثر عربی سے مدد لینی پڑتی ہے اس طور پر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کا دامن اُن تمام چیزوں کے لئے وسیع اور موزوں ہے جن پر عربی اور فارسی کا عمل ہو چکا ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معمولی معمولی الفاظ بھی عربی اور فارسی کی زد میں ثقیل اور گراں بنا دیئے جائیں۔ اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ مختلف آوازوں کو ایک ہی ساز سے ہو کر

گزرنا چاہیے تاکہ موسیقی مکمل اور مرتب ہو اور سامع کو لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکے۔ رہی بھاشا اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس میں علمی زبان ہونے کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے البتہ انشائے لطیف میں اس کا تصرف بعض اوقات نہایت سحر کارانہ ہو جاتا ہے لیکن ایسی حالت میں جس صنعت کارانہ انداز بیان کی ضرورت ہوگی وہ آپ پر ظاہر ہے۔

حضرات! دوسری صفت جو میں نے معلم کے لئے لازمی قرار دی ہے اس کا اُردو مطالعہ ہے، یعنی اُردو کے مشہور مصنفین اور انشاپردازوں کی تصانیف اس کے مطالعہ سے گزری ہوں۔ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اگر معلم پر صرف 'فارسیت' غالب ہے تو وہ طلبائے اُردو کے لئے ایک بہتر معلم نہیں بن سکتا ایک اُردو معلم کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ اُردو کے مدوجزر، اس کے سموم و صبا، اس کی زیروبم سے بھی واقف ہو۔ اُسے یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ اُردو، فارسی کا محض ایک ضمنی حصہ نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل علیحدہ اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے، اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ فارسی نغمے اُردو ساز سے کس طور پر نکالے جا سکتے ہیں اُردو اور فارسی میں جو تناسب اور تعلق ہونا چاہیئے اسے میں شاعر کی زبان میں یوں ادا کروں گا ؎

با من آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

حضرات! تیسری صفت میں نے یہ پیش کی تھی کہ مروجہ اُردو کے ہر پہلو پر اس کی نظر ہونی چاہیئے اس شرط پر میں اس لئے زور دیتا ہوں کہ اس وقت وسائل آمد و رفت میں ترقی ہو رہی ہے، مختلف خیالات متصادم ہو رہے ہیں، مختلف زبانیں مخلوط ہو رہی ہیں۔ اس کسر و انکسار سے اُردو بے نیاز نہیں رہ سکتی اُسے اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ موسم کس قسم کے برگ و ثمر کا ہے۔ آج کل جس اُردو کی ضرورت ہے وہ ہم پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس وقت اگر کسی نے طلسم ہوش ربا یا فسانۂ عجائب کی داستان چھیڑی تو وہ یقیناً بے محل ثابت ہوگی۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ معلم کو مرغ باد نما بن جانا چاہیئے کہ جدھر ہوا کا رخ ہو وہ پھر جایا کرے بلکہ اسے اس امر کا اندازہ لگاتے رہنا چاہیئے کہ کون سے اصول اس وقت برسرِ کار، وہ کہاں تک مفید یا غیر مفید ہیں اور ان سے کس طور پر عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔

حضرات! چوتھی صفت یہ تھی کہ معلم کی طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہونا چاہیئے۔ تیسری اور چوتھی صفتیں ایک حد تک لازم و ملزوم ہیں۔ اُردو کی سب سے بڑی محرومی جو آج کل ہمارے نوخیزوں میں نمایاں ہے وہ فقدانِ اجتہاد ہے۔ میرے تعجب اور صدمہ کی انتہا نہیں رہتی جب میں ہمیشہ اپنے طلبا کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہی فرسودہ لکیریں پیٹتے چلے جاتے ہیں جواب اس قابل بھی نہیں رہیں کہ کوئی صاحب ذوق

وبصیرت اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ میں اپنے لکچر کے اس حصّے کو خاص طور پر اپنے عزیزانِ گرامی طلبائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے غور و توجہ کے لئے مخصوص کرتا ہوں، مجھے اُمید ہے، میرے دوسرے بزرگ اور کرم فرما بھی اس پر توجہ فرمائیں گے۔ مضمون طویل ہوتا جاتا ہے داستان ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی ؎

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

’جھانپلزم‘

حضرات! آپ کسی اُردو مضمون کا مطالعہ فرمائیں جو آج کل کثرت کے ساتھ معمولی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو بہت جلد محسوس ہونے لگے گا کہ ہر مضمون نگار کا طرزِ انشا تقریباً یکساں ہے، الفاظ اور جملوں کی دروبست ایک ہے۔ ابتدا اور انتہا میں بھی وہی دیرینہ فرسودگی چلی آتی ہے۔ حسنِ مذاق اور جودت کے معنی صرف ضلع جگت یا پامال تشبیہات اور استعارے رہ گئے ہیں۔ میں بذاتہٖ جس چیز کو انتہائی بد مذاقی تصور کرتا ہوں وہ ضلع جگت اور رعایتِ لفظی ہے اس افتادِ طبع نے ہمارے مذاق کو پھیکا اور ہمارے تحریر و تقریر کو بالکل سطحی اور عامیانہ بنا رکھا ہے۔ عرصہ ہوا ہمارے چند صاحبِ ذوق احباب نے علی گڑھ میگزین میں ایک ایکٹ شائع کیا تھا جو سنجیدہ ظرافت کا بہترین نمونہ تھا۔ ضلع جگت سوقیانہ پھکڑ بازی، مصنوعی ناز و انداز، فرسودہ اشعار یا ضرب الامثال کو موقع بے موقع استعمال کرنا، ان تمام لغویتوں کے خلاف ایک ایکٹ تعزیرات پاس کیا گیا تھا، مجھے افسوس ہے کہ نسبتاً بہت کم لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا لیکن جن لوگوں کی نظروں سے یہ ایکٹ گزر چکا ہے وہ اس کے زد سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور بعض حلقوں میں تو اس ایکٹ کو کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے۔ انتہائی جزئی فروگزاشت بھی اس کی گرفت میں آجاتی تھی۔ ضلع جگت اور رعایتِ لفظی کو خاص طور پر قابلِ گرفت بتایا گیا تھا، اس ایکٹ کا نام جھانپلزم تھا اور اُن جرائم کے مرتکب کو جو اس ایکٹ کی تحت میں آتے تھے، جھانپل کہا جاتا تھا۔ اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنا ضروری ہیں مثلاً

ایک صاحب فرماتے ہیں ”خدا سے آس ہے کہ آپ پاس ہو جائیں، ہال میں پاس پاس بیٹھیے اور آس پاس کی خبر لیتے رہیئے یاس کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے اور ہر حال میں خدا کا سپاس ادا کیجئے۔“

دوسرے صاحب فرمانے لگے ”یہ شیر برنج نہیں شیر بے رنج ہے آپس میں شیر و شکر ہو جائیے تو شیر کا شیر پاس نہ آئے گا۔“

تیسرے صاحب یوں گلفشانی کرتے ہیں۔ زنجبار میں بار بار دربار کو بار نہ دیجئے!

ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا ہے۔ تخندی نے کنڈی نہیں کولی اس کی کُندی کیجئے۔

ایک صاحب حاذق صاحب سے ملتے ہیں، فرماتے ہیں "آپ نے خوب ترکیب سوچی آخر حاذق ہی ٹھہرے" ایک صاحب نے فرمایا "بھئی لوٹا نہیں ملتا"، دوسرے نے جواب دیا "کہیں لوٹا ہوگا"، پہلے صاحب نے پھریری لے کر فرمایا "بھئی لوٹا گیا ہوگا۔" تو دوسرے صاحب نے ارشاد کیا "کیا لوٹا نہیں دیا گیا" اور اس کامیابی پر قہقہہ لگاکر لوٹ گئے (معاف کیجئے!)

اس قسم کی مثالیں نہایت کثرت کے ساتھ آپ نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پائیں گے اگر سچ پوچھئے تو یہ بد مذاقی اور سطحیت کی نہایت رکیک مثال ہے۔ آج کل لوگوں نے اس کو برجستہ گوئی حاضر جوابی اور ظرافت میں شمار کرنا شروع کر دیا ہے۔ بعض لوگ جو رنگین یا ظریفانہ طرز انشا کے پیچھے بُرے طور پر پڑے رہتے ہیں اس قسم کی تحریروں کو اپنی جودت اور فطانت پر آخری لفظ تصور کرتے ہیں ان کو کیا معلوم اس قسم کی باتیں مہذب اور باسلیقہ لوگوں کے نزدیک کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ جھانپلزم ایکٹ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ کسی "پُرمذاق" جملہ کو جسے سُن کر ایک دفعہ لوگ محظوظ ہو چکے ہیں بار بار دہرانا اور پھر لوگوں سے پذیرائی کی توقع رکھنا بھی جھانپلزم ہے۔ اس ایکٹ کی زد میں وہ مصنف بھی آجاتا ہے جو یہ دیکھ کر کہ اس کا کوئی مضمون یا کوئی تصنیف بے حد مقبول ہو چکی ہے اسی قسم کی دوسری تصنیف پبلک میں پیش کرتا ہے اور شرف قبولیت کی توقع رکھتا ہے۔ مثلاً ملٹن کا پیرڈائز لاسٹ لکھنے کے بعد پیرڈائز ریگینڈ کا لکھنا صریحی جھانپلزم تھا۔ کسی ایک ہی موضوع کو بار بار معرض بحث میں لانا یا اپنے ہی قول کو بار بار پیش کرنا اور وہ بھی انتہائی شد و مد کے ساتھ، کسی طرز انشا کی اس طور پر نقل کرنا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ خواہ مخواہ کے سلسلہ میں ہے، فرسودہ اور پامال شعر یا ضرب المثل کو کسی نہ کسی طور پر دوران تحریر یا تقریر میں پیش کرنا، یہ سب جھانپلزم میں داخل ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے بار بار ایک بزرگ یاد آتے ہیں جنھوں نے ایک ضرب المثل کچھ اس بے ساختگی کے ساتھ استعمال کی کہ میں ان کے حسن مذاق کا اب تک معترف ہوں۔ یہ صاحب کچھ ایسے تیز گفتار تھے کہ کوئی شخص ان کی گفتگو بمشکل سمجھ سکتا تھا۔ اپنا ایک واقعہ یوں بیان فرمانے لگے:

"صاحب، مجھے آگرہ سے علی گڑھ آنا تھا، نہایت ضروری کام درپیش تھا، بارش ہو رہی تھی اور میرے پاس اسباب ضرورت سے زیادہ تھا۔ کیا بتاؤں کس وقت سے آگرہ سے سوار ہوا، ٹونڈلہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ علی گڑھ جانے والی گاڑی چھوٹ گئی ہے، الانسان مرکب من الخطاء والنسیان ناچار رات وہیں رہ گیا۔"

تیز گفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ ٹونڈلہ پہنچ گئے تھے اور میں ان کے "اسباب" کے ساتھ آگرہ ہی

میں تھا۔ اس ضرب المثل کا پیش کرنا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی مرض متعدی تھا میں نے بھی کہدیا
"از خوردان خطا و از بزرگان عطا"

حضرات! آپ یقین فرمائیں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ بے کم و کاست صحیح ہے۔ آج کل جتنے مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو معقول کہے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر میں چند عنوانات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور آپ ہی کو منصف قرار دیتا ہوں کیا یہاں ان چند فرسودہ، دور از کار، مہمل اور مبتذل خیالات کے علاوہ کچھ اور مل سکتا ہے؟ باغ و بہار پر مضمون لکھنا ہوا تو غنچے کا مسکرانا، پتیوں کا تالیاں بجانا، نرگس کی نظر بازی، سوسن کی زبان درازی، سنبل کی زلف چوٹی، بلبل کی غزل خوانی، گویا باغ نہ ہوا کسی بازاری عورت کا بالاخانہ ہوا، اس کے بعد باغبان کی بیرحمی، سرو کا چلنا، سبزہ کا مخمل ہونا، ہوا کا سائیں سائیں کرنا، فوارے کا آٹھ آٹھ آنسو رونا وغیرہ آتا ہے اس سلسلہ میں دو تین اشعار پڑھے جاتے ہیں مثلاً

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ـــــ پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے

مجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں ـــــ نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی

الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد ـــــ اجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں اپنا

اس کے بعد صیاد کا دام نظر آجاتا ہے کبھی بلبل کے ساتھ رونا پیٹنا شروع کیا جاتا ہے اور یہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے ؎

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل ـــــ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

پھر کسی کنج میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں محبوب کا کوئی پرزہ نکال کر پڑھا جاتا ہے، انگلیاں کانپنے لگتی ہیں، خط کو بوسہ دے کر سینہ میں رکھ لیا جاتا ہے اور اس کے بعد خودکشی کر لی جاتی ہے۔

موسم اور مناظر فطرت کو کبھی اس طور پر بھی "باندھیں گے"

"آسماں ماتمی لباس پہنے ہوئے ہے۔ شفق خوں رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے، پانی برسا ہے تو فرماتے ہیں

کہ جیسے مینھ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے ـــــ یہ کہدو ابر باراں سے اگر برسے تو یوں برسے

روم جھوم، چھم چھم، دھڑ دھڑ۔ کہیں طاؤس ناچتا ہے، کوئل کوکتی ہے، پپیہا پی کہاں کہتا ہے، جوانانِ چمن کا غسل ہوتا ہے، کالی رات کالی بلا ہے۔ ستارے ٹمٹماتے ہیں (اگر تگوریت طاری ہوئی تو دو ایک آسمانی نغمے بھی ان سے سُن لئے) چاند محبوب کا چہرہ ہے، کبھی بادلوں کی چادر ڈال لیتا ہے، کبھی ہوا گستاخ بادلوں کو تھپیڑے دے دے کر ہٹا دیتی ہے اور کبھی حضرت عاشق یا شاعر خود اس کی زد میں آجاتے ہیں!

محبوب کا سراپا کھینچیں گے تو آنکھیں تیر و سنان و خنجر برسانے لگیں گی، کبھی ساغر لنڈھائیں گی۔

رخسارے ہیں کہ سیب کشمیری، موُنھ غنچہ، گردن صراحی دار، دیکھتے ہی، ہائے، وائے، آہ، اُوہ، اُف، ظالم، کافر کہکر بے ہوش ہوجائیں گے، بہت خوش قسمت ہوئے تو آنکھ کھولنے پر اپنا سر زانوے یار پر پائیں گے اور آخر میں لکھ دیں گے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا!

بعض حضرات جن کی طبیعت کسی قدر اعتدال پسند ہوتی ہی جب کبھی قلم اُٹھائیں گے تو کوئی نہ کوئی پامال شعر ضرور لکھیں گے۔ فرض کیجئے "اتفاق" پر مضمون لکھنا ہوا تو سب سے پہلے لکھیں گے۔

(۱) دو دل یک شود بشکند کوہ را ___ پراگندگی آرد انبوہ را

(۲) ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد ___ اگر خارے بود گلدستہ گردد

(۳) ہمتِ مرداں مددِ خدا۔

اس کے بعد کہیں نہ کہیں اُس قصہ کو لکھیں گے جو ایک قریب المرگ باپ اور اس کے نصف درجن یا اس سے زیادہ لڑکوں سے متعلق ہی، باپ کا رسّی کے مختلف ٹکروں کا دینا اور ان کو ملاکر توڑنے کی فرمائش کرنا اس کا نہ ٹوٹنا اور علٰحدہ علٰحدہ ان کا ٹوٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔

ہماری بدمذاقیاں یہیں نہیں ختم ہوجاتیں، شادی اور غمی میں بھی ہم انھیں فرسودگیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں کوئی رقعۂ دعوت آپ اِن اشعار یا جملوں سے خالی نہ پائیں گے۔

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست ___ آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست ___ کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

گر قبول افتد زہے عز و شرف

تعزیت اور ماتم پرسی کے لئے بھی چند ہی اشعار اور جملے مخصوص ہیں مثلاً

موت سے کس کو رستگاری ہی ___ آج وہ کل ہماری باری ہی

صبح کو طائرانِ خوش الحان ___ پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

"دنیا فانی ہی" "صبر و شکر کے سوا کیا چارہ ہی" "مرحوم کو جوارِ رحمت اور پسماندگان کو صبر جمیل" وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک وہ طبقہ ہی جس نے ٹگور کا رنگ اختیار کیا ہی۔ ان کو کس طرح بتایا جائے کہ یہ چیزیں کبھی کبھی بطور تفریح اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ مستقل مضامین کا اسی پیرایہ میں پیش کرنا

اُردو پر صریحی ظلم ہے اور ذوقِ ادب کو مجروح کرنا ہے۔ مثلاً

وہ ...... باغ ...... پھول ...... آہ تم مسکرلے ...... ندی کے کنارے
پانی کا گھڑا ...... آسمانی نغمہ ...... تاروں کا راگ !

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو گھوم پھر کر کسی ایسے مضمون کو اختیار کریں گے جس میں غلام امام شہید کا رنگ کھپ جائے۔ اور وہ بھی ایسا جو "روضہ تاج گنج" کے نمونہ کا ہو۔ بعض حضرات، جو ہندوستان کی موجودہ پالیٹکس پر اظہار خیالات فرمانے کے شائق ہوتے ہیں، نفسِ مضمون کے اعتبار سے محض چند مخصوص الفاظ اور ترکیبوں کے پابند ہوتے ہیں، مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو، عبارت میں زور ہو یا نہ ہو، خیالات کیسے ہی ہوں موقع یا ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی ربط یا تسلسل پیدا ہوتا ہو یا نہیں چند الفاظ اور ترکیبیں کہیں نہ کہیں کھپا دینا ضروری ہیں مثلاً مادرِ ہند، طوقِ غلامی یا لعنت، شیطنت، ہندوستان کے سپوت فرزند، وغیرہ وغیرہ

آخری طرز انشا کے متعلق میں نے جو اظہار خیال کیا ہے اس سے ممکن ہے بعض حضرات میری خلوص نیت کو مشکوک سمجھنے لگیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے جس سے نفرت ہے وہ کورانہ تقلید ہے۔ مضمون میں محض آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے چند ایسی ترکیبوں، جملوں کو معرض تحریر میں لانا جو بجائے خود نہایت سنگین اور گراں ہوں اور جن کے لئے انتہائے حزم و احتیاط لازمی ہے، بالکل بے محل ہوتا ہے۔ میں بذاتہ ہر ایسے مضمون کو مہمل اور بے سود سمجھتا ہوں جس کے پڑھنے سے لوگوں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہو یا نفس مضمون سے لوگوں کے قلب و دماغ مسرور یا متاثر نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں میں اپنے عزیزانِ مسلم یونیورسٹی کو خاص طور پر مخاطب کرنا چاہتا ہوں کیونکہ کل انھیں کے جنبشِ قلم پر قوم اور ملک کی نظریں لگی ہونگی، علم و فضل کا سرمایہ انھیں کے کاوشِ دماغ اور مذاقِ سلیم کا محتاج ہوگا اور رزم و بزم انھیں کے آداب و اطوار کا آئینہ ہوگی۔

عزیزانِ گرامی، کیا تم کو کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ تمھاری اس قسم کی تحریروں سے جن کا خاکہ میں ابھی ابھی کھینچ چکا ہوں تمھارے اجتہادِ فکر اور مذاقِ سلیم کی رسوائی ہوتی ہے۔ تم نے اپنی استعداد اور قابلیت کا معیار اتنا پست کیوں کر دیا ہے جو لوگ تم سے قبل گزر چکے ہیں ان سے تم اپنے آپ کو اگر قابل تر نہیں ثابت کر سکتے تو کیا تم میں ان کی سچے جانشین بننے کی بھی اہلیت نہیں ہے۔ کیا فطرت کا بیکراں سرمایہ تمھارے لئے نہیں ہے۔ کیا تمھاری فکر نے فضائے تخیل میں پرواز کرنے سے عاری ہے۔ کیا کائنات کا ذرہ ذرہ تم کو دعوتِ دید نہیں دیتا اور کیا تمھاری جودت ان سے آمیز ہو کر تمھارے لئے نئی نئی دنیا میں نہیں پیدا کر سکتی۔ کیا تم خود کیف و حس سے محروم ہو، اور کیا تم ان کو اس طریقہ سے نہیں بیان کر سکتے جیسا تم خود ان کو محسوس کرتے ہو کیا تم یہی پسند کرتے ہو کہ تمھارے جذبات، تمھارے خیالات، تمھاری فکر سب مستعار ہو، تم مجھے بتاؤ تمھارا

کسی باغ میں گزر ہوتا ہے تو تم وہی محسوس کرتے ہو جس کا نمونہ میں ابھی ابھی پیش کر چکا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم ان فرسودہ طریقوں کو اختیار کر کے اپنے جذبہ کی حقیقی ترجمانی کرتے ہو۔ عزیزو، یاد رکھو ہر انسان ہر چیز سے مختلف طور پر لذت اندوز ہو سکتا ہے اور اپنے جذبات کی ترجمانی بالکل اچھوتے انداز سے کر سکتا ہے۔ پھر ان باتوں کو کیوں نہیں لکھتے جو خود تمھارے دل پر گزرتی ہیں، وہ باتیں کیوں لکھتے ہو جو شاید ان لوگوں کے دلوں پر بھی نہیں گزریں جن کی تم نقل کرتے ہو۔ کیا تم اپنے دوستوں، بزرگوں یا عزیزوں کو اپنے خیالات سے یونہی آشنا کراتے ہو پھر مجھے بتاؤ ایسا کیوں لکھتے ہو یا تو لکھنے سے قطعاً گریز کرو یا وہی لکھو جسے تم خود محسوس کرتے ہو۔ تم کو کوئی بات کبھی نہیں لکھنی چاہیئے اگر تم ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہو کہ دوسرے تم سے اچھا لکھ چکے ہیں، تم کو اپنا ایک مخصوص انداز قائم کرنا چاہیئے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہر انسان ایک مخصوص رنگ کا مالک بن سکتا ہے۔ تم اپنے عزیزوں دوستوں یا بزرگوں کو خط لکھتے ہو تمھارے مخاطب اس خط کو پاکر یا سن کر باغ باغ ہو جاتے ہیں یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک جملہ طرز بیان، ترتیب و تہذیب غرضکہ ہر وہ چیز جس پر تمھاری وہ تحریر مشتمل ہوتی ہے تمھاری ذات، تمھارے جذبات، تمھارے انداز اور تمھارے احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہی کیفیت تمھاری ہر تحریر کی ہونی چاہیئے، یہ بالکل مشکل نہیں ہے، صرف مشق درکار ہے، مطالعہ اور مشاہدہ کرو، اپنے معلم خود بنو، کوئی دوسرا شخص تمھارے گفتگو اور تمھاری تحریر کا تم سے بہتر ترجمان نہیں ہو سکتا۔ انشا پردازی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تمھاری تحریر تمھارے خیالات کی بے کم و کاست ترجمانی کرتی ہو، پہلے سوچو اس کے بعد لکھو، ایک انشا پرداز کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ غور و فکر کرنے سے قبل الفاظ اور جملے اپنے ذہن میں ترتیب دے لے، الفاظ، جملوں یا مخصوص ترکیب اور بندشوں کے ترجمان نہ بنو بلکہ اپنے حسیات اور جذبات کی صحیح اور سچی ترجمانی کرو۔ کبھی ایسی کتابوں کا مطالعہ نہ کرو جن سے ادب اردو کا خون ہوتا ہو۔ سستے اور اخلاق کو پامال کرنے والے ناول کبھی نہ پڑھو اس سے تمھارا ادبی ذوق مجروح ہوگا۔ تم سمجھتے ہوگے کہ میں محض فرسودہ پند اور موعظت پر آگیا ہوں اور ایک ایسے واعظ کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں جو خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے، میں خود ان منازل سے گزر چکا ہوں اور اس کی تلخیوں سے آشنا ہوں۔ ایک بڑے زبردست حکیم کا قول ہے کہ اگر تم بڑا بننا چاہتے ہو تو چھوٹی باتوں سے گریز کرو، میں چاہتا ہوں کہ یہ مقولہ کم سے کم تمھارے ادبی زندگی کا خضر راہ ہو۔ آج جس لکیر کو تم پیٹ رہے ہو اس کی تنہا وجہ یہ ہے کہ تمھاری تعلیم کے ابتدائی دور میں صرف ناکارہ تصانیف مطالعہ میں رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے قلب و دماغ تاریک ہو رہے ہیں۔ اردو رسائل میں اس وقت معارف، اردو، نگار اور اسی پایہ کے دوسرے رسائل کا مطالعہ کرنا چاہیئے، ان مطبوعات کو اس نیت سے کبھی نہ پڑھو کہ تم کو ان کی طرز انشا

کی نقل کرنی ہے۔ ان کا مطالعہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ تمہارا ذہن و دماغ ان سے ترتیب اور تہذیب حاصل کرے، جو کچھ پڑھو اسے اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کرو، ان کے طرز تحریر سے تمہارا ذہن و دماغ سلجھے گا اس کے بعد جو کچھ تم لکھوگے وہ روشن، مربوط اور دل نشیں ہوگا۔ بعض انشا پردازوں کے متعلق میں اس سے قبل اظہار خیال کر چکا ہوں ان میں دو بزرگ ایسے ہیں جن کی تقلید نہایت مشکل اور خطرناک ہے ان امور میں تقلید یوں بھی مستحسن نہیں ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا طرز انشا لائڈ جارج کی کولیشن وزارت ہے۔ جس طرح صرف لائڈ جارج ہی کی ذات ایسی تھی جو کولیشن کی کشتی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکی اسی طرح مولانا آزاد اور خواجہ صاحب کا طرز کچھ انھیں حضرات سے نبھ سکتا ہے۔

"صلاح و مشورہ"

حضرات، اردو زبان اور موجودہ دور کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ کم و بیش عرض کر چکا۔ اب میں اپنے فرض کے اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے بڑھکر آسان دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے، یعنی صلاح اور مشورہ! قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت دہلی اور لکھنؤ دونوں اردو کی طرف سے انتہائی استغنا برت رہے ہیں حالانکہ ان دونوں مقامات پر یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن مجھے افسوس ہے یہ خانقاہیں صرف اپنے گزشتہ سجادہ نشینوں کی سوگوار ہیں، کنعان اور مصر دونوں ویران ہیں اور متاع یوسفی کے لئے آنکھیں بے قرار ہونے لگی ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں ہے جب ہماری مایوس نگاہیں صرف حیدرآباد کی فضا کو اپنا نشیمن بنائیں۔ جنوبی ہند کے اردو پر جو کچھ احسانات رہے ہیں ان سے آپ واقف ہیں۔ کیا تعجب زمانہ کا انقلاب انھیں لیل و نہار کو پھر ہمارے سامنے کردے جن کی کروٹیں کبھی اردو کی گہوارہ جنبانی کر چکی تھیں۔

حضرات! اس سلسلہ میں میں خود علی گڑھ کی ذمہ داریوں کا بھی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اردو کا بنیادی تاسیس علی گڑھ ہی میں طلوع ہوا اور دشمنان اردو کا مقابلہ بھی ہمیشہ اسی محاذ سے کیا گیا۔ دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو کا پرستش کدہ علی گڑھ ہی رہا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ہم اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بھول چکے ہیں جو سرسید، محسن الملک، نذیر احمد، شبلی، حالی اور آزاد سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہونچی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ موجودہ حالات کچھ اس درجہ متناقض اور ہماری قوت عمل اس درجہ ناکمل ہے کہ ہم کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ آپ حضرات نے مہمات جیسن میں وہ قصہ تو ملاحظہ فرمایا ہی ہوگا جہاں جیسن کے جہاز کو دو ایسی چٹانوں سے گزرنا پڑا تھا جن کے درمیان سے کوئی چیز گزرتی تو وہ یک لخت ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور اُسے ریزہ ریزہ کر کے پھر علیحدہ ہو جاتیں۔ اس طور پر کوئی چیز ان دونوں کی زد سے محفوظ رہ کر نہیں نکل سکتی تھی ایک حد تک یہی حالت ہمارے انسٹی ٹیوشن کی ہے۔ ہماری کشتی اس وقت آکسفورڈ اور غرناطہ کے درمیان

میں ہے۔ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے۔

حضرات! اس وقت اس مسئلہ کا چھیڑنا مصلحت نہیں ہے کہ علی گڑھ کو کیمبرج اور آکسفورڈ بنایا جائے یا قرطبہ اور غرناطہ، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث مباحثہ کے ساتھ آکسفورڈ یا غرناطہ کا سا کچھ کام بھی ہوتا رہے، اُردو کی حیثیت کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، وہ ہماری توجہ کی محتاج ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اسی پر صرف کر دینی چاہئے۔ استدعا صرف اتنی ہے کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اس کے خلاف نہیں بر سر کار لانا چاہیئے۔ خدا مسلمانوں کو قائم رکھے ابھی بہت سے مواقع ایسے آئیں گے جہاں وہ 'تماشا' کو 'کامیاب' اور 'تمنا' کو 'بے قرار' رکھ سکیں گے۔

لائبریری

حضرات! سب سے بڑی ضرورت جس سے ہم کو عہدہ برآ ہونا ہے اُردو کی ایک جامع لائبریری کا قیام ہے۔ یوں تو یہ ضرورت بظاہر نہایت خفیف اور معمولی نظر آتی ہے لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کام میں ہم کو انتہا سے زیادہ سعی و کوشش سے کام لینا پڑے گا۔ اس وقت کم و بیش اُردو کی آٹھ ہزار مطبوعات ہیں اور ہر نسخہ کی قیمت کا اوسط عہ/ رکھ لیا جائے تو آٹھ ہزار روپئے تو صرف کتابوں کی قیمت ہونگے۔ اس وقت ہندوستان میں اُردو کتابوں کا کوئی مکمل کتب خانہ نہیں ہے اور یہ ایک ایسا افسوسناک واقعہ ہے جس کا ہم کو احساس ہونا چاہیئے، کتب خانہ کی اہمیت پر اظہار خیال کرنا میرے نزدیک تحصیل حاصل ہے۔ رہا یہ امر کہ کتب خانہ اسی پیمانہ کا ہونا چاہیئے یا نہیں جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اس کی ضرورت اگر علی گڑھ کو نہ ہوگی یا اس ضرورت کو علی گڑھ نے پورا نہ کیا تو پھر کس سے توقع رکھی جائے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک اُردو کی ایک مکمل اور جامع لائبریری نہ ہوگی ہماری مساعی کا شیرازہ کبھی استوار نہ ہو سکے گا۔

انجمن اُردوئے معلی

دوسری ضرورت یہ ہے کہ علی گڑھ میں ایک اُردو انجمن قائم کی جائے، جس کے اراکین وہ لوگ ہوں جن کو اُردو سے شغف ہے یا جو اُردو کی ترویج اور ترقی کو اپنا مشن خیال فرماتے ہیں۔ اس انجمن میں ہفتہ وار یا ماہوار اُردو کے معرکۃ الآرا مسائل پر عالمانہ مضامین پڑھے جایا کریں، اور ان پر سنجیدگی اور فرزانگی کے ساتھ تبادلہ آرا کیا جائے۔ اس انجمن کی کامیابی [illegible] یونیورسٹی اور اراکین انجمن کی پرخلوص مساعی پر ہے۔ انجمن کا ایک ادبی رسالہ ہونا چاہیئے جس میں ان مضامین کو شائع کیا جائے اور وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوتے رہیں جن کا مبحث اُردو سے متعلق ہو۔ مثلاً اُردو کیوں کر مقبول انام بنائی جا سکتی ہے، رسم الخط، اُردو صحیح لکھنے اور بولنے کے فوائد اور قواعد، تعلیم اُردو، اُردو انشا پردازی، اُردو ترجمے اور تالیفات، مشہور شعرائے اُردو

اور فارسی کے منتخب کلام مع مقدمہ، فرہنگ اور حاشیہ، مشاہیر ملک وقوم کے سوانح زندگی جو بچوں اور کم لکھے پڑھے لوگوں کے لئے مفید ہو، خوشنویسی اور اس کا فن، خطاطی، قومی اور نیچرل نظمیں وغیرہ وغیرہ اس رسالہ میں مشہور مطبوعات پر فاضلانہ نقد اور تبصرے ہوں تاکہ لوگوں میں تنقید صحیح کا ملکہ پیدا ہو اور وہ مشہور مطبوعات سے آشنا ہوسکیں، فی الحال میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ انجمن اردوئے معلی کا احیا کیا جائے اور رسالہ کا نام اردوئے معلی رکھا جائے، اس کی ترتیب اور تہذیب معارف اور اردو کے نمونے پر ہو اور سال میں چار بار شائع ہوا کرے۔

کانفرنس معلمین اردو

تیسری ضرورت جس کی نوعیت ایک حد تک 'نیم سرکاری' ہوگی، یہ ہے کہ ہر سال ان معلمین اردو کی ایک کانفرنس منعقد ہوا کرے جن کا تعلق مختلف یونیورسٹیوں سے ہو مثلاً علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی، بنارس، حیدرآباد، پنجاب، بمبئی۔ وہ لوگ جو ان یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ہیں، ہر سال مجتمع ہوکر ان تدابیر اور اسباب پر غور کیا کریں اور حتی الوسع ان کو عمل میں لانے کی کوشش کریں جو کانفرنس کے نزدیک ضروری اور قابل عمل ہوں۔ اس کانفرنس کی نوعیت دیگر اس قسم کی جماعتوں کی نوعیت سے بالکل مختلف ہوگی، اس کے اراکین وہ ہونگے جن کا براہ راست اردو کی تعلیم اور نشر و تعمیم سے تعلق ہوگا اور یہ لوگ اپنے اپنے مخصوص مقامی ضروریات کو مدنظر رکھکر مناسب تدابیر عمل میں لائیں گے۔ جہاں تک براہ راست اردو کی درس و تدریس کا تعلق ہے معلمین کی یہ کانفرنس بے حد ضروری ہے اور اگر یہ کامیابی کے ساتھ چلائی جاسکے تو میرا خیال ہے اس سے نہایت عمیق اور دور رس نتائج مترتب ہونگے۔

اکاڈمی

یہ چوتھی ضرورت جس کا میں اس سے قبل اعادہ بھی کرچکا ہوں ایک اکاڈمی کی ہے، اس وقت اردو کا کوئی 'اسکول' نہیں ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اس وقت صرف ایک ایسی وراثت کے دعویدار ہیں جو مدت ہوئی ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مقامات کی وہ فضا ہی نہیں رہی جہاں ذوق شعری تربیت پاتا، جہاں طبیعتیں سلجھتی تھیں، زبان کو صیقل ہوتا تھا، نظر میں وسعت اور قلب میں سوز و ساز پیدا ہوتا تھا، لکھنؤ اب بھی غنیمت ہے لیکن یہ چھاؤں بھی ثاقب اور صفی کے دم سے قائم ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اس وقت ایک حد تک دلی نثر کی اور لکھنؤ نظم کی علمبرداری کر رہا ہے۔ دارالمصنفین پر زبان کا نہیں بلکہ علمیت کا رنگ غالب ہے، حیدرآباد سے سرمایہ فراہم کرنے کی توقع ہے۔ اعظم گڑھ اور حیدرآباد کا مقابلہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ اول الذکر کی مثال متلاشیان آثار قدیمہ کی ہے جو خزان اور دفینوں کی تلاش میں ہے۔ اسلاف کے کارناموں کو روشن اور ان سے موجودہ نسل کو آشنا کرنا دارالمصنفین کا کام ہے ان کی جولانگاہ مصر ہر کولینیم اور بابل ہے۔ حیدرآباد خام پیداوار کا مالک ہے اور یہ بمنزلہ ہندوستان کے

ہے آپ اگر معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کرونگا کہ دنیا میں بد مذاقوں کی کمی نہیں ہے ممکن ہے لفظ "خام" سے کچھ لوگ دورانِ تنفس میں مبتلا ہو جائیں اس لئے میں جلد سے جلد یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ لفظ "خام" سے یہاں "ناقص" مراد نہیں ہے بلکہ یہ (Raw product را پروڈکٹ) کا مرادف ہے۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ کو کیا حیثیت دی جائے، میں اب تک طے نہیں کر سکا ہوں اور اسے آپ ہی کے حسنِ تخیل پر چھوڑتا ہوں بشرطیکہ آپ ستم ظریفی کو دخل دینے سے اجتناب فرمائیں۔ یہاں یہ بحث اٹھائی جا سکتی ہے کہ اس اکاڈمی کا مقصد کیا ہوگا اور اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کرونگا کہ اس وقت اردو کو صحیح راستہ پر ڈالنے والی کوئی ایجنسی نہیں ہے۔ رفتارِ زمانہ کے مطابق نئی نئی قومیں برسرِ کار ہیں اور ہر روز نئی نئی ضرورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی خاص مجلس یا ایجنسی ایسی نہ ہوئی جو ان ضروریات کا تجزیہ کرتی رہے یا مناسب تدابیر پیش کرے تو جیسا کہ آج عام طور پر نظر آرہا ہے اردو کی حیثیت صرف نیوز پیپر لٹریچر (اخباری زبان) کی ہو جائے گی اور اس قسم کا لٹریچر جیسا کہ ظاہر ہے، کبھی کلاسکس کے زمرہ میں نہیں آسکتا۔ اردو کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، دوسری زبانوں میں نئے الفاظ کے آمیزش کی بہت کم گنجائش ہے لیکن اردو کا دامن اس کے لئے نہایت وسیع ہے۔ اسماء اور افعال کی آمیزش کچھ بہت زیادہ اہم نہیں ہے یعنی زبان اور محاورہ کے مسئلہ میں ہم کو انتہائی احتیاط برتنی پڑے گی۔ ہندوستان کی حیثیت ایک براعظم کی ہے۔ اس میں سیکڑوں قومیں بستی ہیں اور سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر اردو کی کوئی ٹکسال مقرر نہ کی گئی تو کچھ دنوں میں اس کی صورت کچھ اس طور پر مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ آپ کھرے کھوٹے کا بھی پتا نہ لگا سکینگے الفاظ، جملوں، طرزِ انشاء، زبان، لب و لہجہ محاورہ و روزمرہ میں ایسی تفریق نظر آنے لگے گی کہ شاید پھر آپ اردو کا کوئی محاذ ہی نہ متعین کر سکیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کے مسلم الثبوت شعرا اور انشا پردازوں کی ایک اکاڈمی قائم کی جائے جو ادب اردو کا معیار قائم کرے اور دوسرے لوگ اس سے مستفید ہوں۔ میری اگر رائے نہیں تو تمنا ضرور ہے کہ یہ اکاڈمی علی گڑھ میں قائم کی جائے لیکن براہِ راست اسے مسلم یونیورسٹی سے تعلق نہ ہو ، ورنہ انتظامی دقتوں کے علاوہ ممکن ہے ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اس کی کامیابی کے لئے مستعد نہ ہوں

انسائیکلوپیڈیا

اس سلسلہ میں میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک زمانہ میں معارف نے اس کی تحریک کی تھی اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس تحریک کی ناکامیابی کا ماتم کیا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تحریک اس زمانے میں ایک حد تک قبل از وقت تھی۔ کسی زبان کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا ایک خاص وقت اور موقع ہوتا ہے ابھی

بہت سے ابتدائی مراحل طے کرنے ہیں اور چونکہ یہ مدارج ابھی ناتمام ہیں اس لئے انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل کی دشواریاں اور
زیادہ سنگین ہوتی جا رہی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جامع اور مکمل ہو۔ اس کے بعد کام کرنے والوں کا
سوال آتا ہے۔ کام کرنے والوں کا مسئلہ کچھ بہت زیادہ دشوار نہیں ہے لیکن تحقیق اور تفحص کے اسباب اور وسائل ابھی ناپید ہیں۔
سب سے بڑی ضرورت، اس وقت ایک مکمل اور جامع اردو لغت کی ہے۔ اب تک جتنی لغات مدون ہوئی ہیں وہ بہمہ وجوہ مکمل
اور مستند نہیں ہیں۔ یہ اسکیم انسائیکلوپیڈیا کی اسکیم سے مختصر اور آسان تر ہے اور اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد انسائیکلوپیڈیا
کی تدوین میں کافی سہولت پیدا ہونے کی توقع ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ مختلف شعبہ جات علوم اور فنون
پر مستند اور مکمل تصنیفات کی ضرورت ہے، میں اسے تسلیم کرنے کے لئے طیار ہوں کہ دوسری زبانوں کی کتب کا حوالہ دیا جا سکتا
ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بعض اوقات وضع اصطلاحات کا مسئلہ اپنی انتہائی پیچیدگیوں کے ساتھ رونما ہوگا اور اس وقت
ہم کو ایسے مترادفات کی ضرورت پیش آئے گی جو جامع اور مانع ہونے کے علاوہ ایک حد تک عام فہم اور سہل و رواں بھی ہوں
اس معاملہ میں حیدرآباد یونیورسٹی کی کوششیں ہر طور پر قابل ستائش ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ایسا کام اٹھایا ہے جس کی
کامیابی یا ناکامیابی پر اردو کا مستقبل منحصر ہے۔

اردو مکاتب

پانچویں ضرورت جس کی طرف خود ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کو متوجہ ہونا چاہیئے اردو مکاتب کا
کا قیام ہے۔ اس سلسلہ میں آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کانفرنس کے نظام عمل کی طرف (جہاں تک
اردو کا تعلق ہے) آپ کی توجہ مبذول کراؤں۔ کانفرنس کو اپنے مساعی میں جب کبھی ناکامیابی ہوئی ہے اس کا اصلی راز
یہ ہے کہ اس نے اپنا نظام عمل ہمیشہ نہایت وسیع پیمانے پر مرتب کیا، ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کی مختلف تعلیمی
ضروریات ایک مرکز سے اتمام کو نہیں پہنچ سکتیں۔ کانفرنس کو جزئیات پر نہیں جانا چاہیئے، اس سے سوائے طوالت اور
پریشانی کے کچھ اور حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں اب پراونشل کانفرنسیں بھی قائم کی گئی ہیں لیکن میرے نزدیک
اس میں بھی اختصار کی ضرورت ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر ضلع میں مسلمانوں کی ایک مجلس تعلیمی ہونا چاہیئے جس کے ارکین
اور عہدہ دار اسی ضلع کے باشندہ ہوں اور تمام تعلیمی مصارف کا بار خود اسی ضلع پر ہو۔ اس معاملہ میں گورنمنٹ بھی کافی
اعانت کرنے پر آمادہ ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو مکتب کمیٹیاں قائم ہیں ان کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ جن لوگوں کے لئے
یہ سب کچھ کیا گیا ہے وہ خود اس کی طرف سے بے اعتنا ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ کانفرنس کے مقتدر حضرات خود تکلیف فرما کر
یا قوم کے دیگر با اثر بزرگوں کے توسل سے، ہر ضلع کا دورہ فرمائیں اور وہاں کے مقامی حالات کو مدنظر رکھکر اس
ضلع کے با اثر اور ہمدرد افراد کی حمایت حاصل کریں اور اندرونی انتظامات کی عنان بالکل ان لوگوں کے ہاتھ میں
دیدیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر لوگ دلسوزی اور محنت سے کام کریں تو ہر ضلع کے مکاتب اپنی ضروریات کے خود کفیل ہو سکتے
ہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ لوگ دلسوزی یا محنت سے کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں مشکل یہ ہے کہ

اس کے لئے بالعموم غلط اشخاص کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں کے مسلمان فرقہ بندی کی سعادت سے محروم ہوں اور اپنی ذاتی خصومتوں پر قوم و ملک کے بہترین اغراض و مقاصد کو قربان کردینے کے لئے طیار نہ ہوجاتے ہوں لیکن اگر کوشش کی جائے تو کوئی دقت ایسی نہیں ہے جس پر عبور حاصل نہ ہوسکے اور میرا خیال ہے کہ اگر کانفرنس پوری تندہی کے ساتھ کام کرے تو ممکن نہیں ہے کہ یہ معاملات بر وقت سلجھ جایا کریں۔

حضرات! اس وقت اُردو کو اعلیٰ تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ابتدائی تعلیم کی۔ جب تک عوام تعلیم یافتہ نہ ہونگے ہماری آئندہ نسل میں تعلیم کا ذوق فطری اور قومی نہ ہوگا۔ اب ہم کو علمی نہیں بلکہ تعلیمی فضا کی ضرورت ہے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص کم سے کم ابتدائی تعلیم کو، اتنا ہی ضروری سمجھے، جتنا ہمارے گریجوٹ ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کانفرنس کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان مکاتیب کا نصاب مقرر کرے، ان کا امتحان لے، اور بہترین طریقہ تعلیم کو عمل پزیر بنائے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ان مکاتب کی تعلیم بالکل مفت ہو، اور محض اتنی ہو کہ ہر طالب علم معمولی اُردو لکھ پڑھ لے۔ ان مکاتب میں یہ انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ کہ ہفتہ میں دو ایک بار رات کے وقت بھی کلاس ہوا کرے تاکہ وہ لوگ (اس میں لڑکوں کی تخصیص نہیں ہے) جو کاروبار کی وجہ سے دن میں تعلیم کا شغل نہ رکھ سکیں، شب میں نوشت و خواند کرلیا کریں۔ استادوں کے انتخاب میں یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی شعائر کا پابند ہو اور ضروری مسائل دینی سے واقف ہوں، ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار اپنے اپنے قصبہ یا قریہ میں لوگوں کو جمع کرکے تعلیم، اسلام اور حفظانِ صحت پر لکچر دیا کرے۔

اُردو گفتگو

ایک اور مسئلہ جس کی طرف میں آپ کی توجہ مائل کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُردو داں حضرات جب کبھی کسی اُردو داں شخص یا پبلک سے مخاطب ہوں اُردو ہی میں گفتگو فرمائیں۔ آپ خود ان حضرات سے واقف ہونگے جن کی پوری اُردو تقریر میں اُردو الفاظ کا تناسب صرف ۱۵ یا ۲۰ فی صدی کا ہوتا ہے۔ یہی حالت خط وکتابت میں بھی نظر آتی ہے۔ بہت کم ایسے انگریزی داں حضرات دیکھے گئے ہیں جو اُردو میں خط وکتابت رکھتے ہیں۔ اس کے جواز میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طور پر اظہار خیال میں سہولت ہوتی ہے۔ لیکن میں ان سے سوال کرونگا کہ وہ جب کبھی کسی ایسے شخص اپنا مخاطب بناتے ہیں جو انگریزی سے قطعاً نابلد ہے کیا وہ انگریزی کے الفاظ استعمال میں لاتے ہیں اور اگر نہیں لاتے تو کیا اظہار مطالب میں کوئی نقص یا سقم رہ جاتا ہے۔ یہ صفت اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو یا تو انگریزی کے تمام مدارج طے کئے ہوتے ہیں یا محض ابجد خواں ہوتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ لوگ جب کبھی اپنے دوستوں یا ڈاکٹر وغیرہ سے اپنے اعزا کا عموماً اور بیوی کا خصوصاً تذکرہ کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ بیوی یا کچھ اور کہیں ہمیشہ وائف یا سسٹر یا مدر کہیں گے۔ مجھے خود نہیں معلوم اگر بیوی یا ہمشیرہ یا والدہ کہنے سے شرم آتی ہے تو ان الفاظ کے انگریزی جامہ

پہن لینے سے شرم و حیا کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ امراض کا نام لینے میں بھی اردو کے بجائے انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اخفائے حال یا عریانی خیال مدنظر ہوتی ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اس سے کہاں تک مقصد برآری ہوتی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں بے اختیار ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں ہسپتال میں بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کی ساری تقریر اردو میں تھی صرف جہاں کہیں بیوی کا نام آجاتا تھا برابر "وائف" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا، کیوں جناب، گستاخی معاف، آپ کی ساری تقریر تو نہایت برہنہ قسم کی اردو میں تھی، بیوی کو بجائے بیوی کہنے کے آپ "وائف" کیوں فرماتے رہے؟ میرے اس سوال پر انھوں نے کسی قدر تامل کے بعد فرمایا، بات یہ ہے کہ ان کو کچھ فیمیل کمپلینٹس (نسوانی شکایات) ہیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر دریافت کیا اور کیوں حضرت فیمیل کمپلینٹس کیا؟ اس کا جواب انھوں نے صرف اس طور پر دیا کہ ڈاکٹر صاحب سے نہایت درجہ مخاطب ہو کر جلد جلد کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگے اور ہمارا سوال اور ان کے فیمیل کمپلینٹس دونوں بیچ میں ختم ہوگئے!

ترجمہ تالیف اور تصنیف چھٹی ضرورت جو آج ہمارے سامنے ہے وہ ترجمہ اور تالیف کی ہے۔ اس وقت اردو کو ایسی زبانوں سے مقابلہ کرنا ہے جو شاہراہ ترقی پر اردو سے بہت آگے پہنچ چکی ہیں۔ اسی سلسلہ میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس کام کو نہایت تندہی اور سرعت کے ساتھ پورا کر رہی ہے گو وہاں جن کتابوں کے تراجم اب تک ہو چکے ہیں ان میں بیشتر کتب درسی ہیں اس میں شک نہیں یہ بھی ہمارے انتہائی تشکر و امتنان کا موجب ہے اور اس میں شک نہیں ایک طور پر یہ کوشش بھی مستحسن ہے کیونکہ سائنس، ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ مشہور اور مقتدر انشاپردازوں کی سرپرستی اور نگرانی میں ایک دارالترجمہ قائم ہو جس میں نہ صرف انگریزی بلکہ دیگر زبانوں کے بھی اردو تراجم مرتب کئے جائیں۔ اس سے زبان کا ذخیرہ نہایت وسیع ہو جائیگا اور وہ لوگ جو صرف اردو سے آشنا ہیں اور اس میں کمال حاصل کر چکے ہیں۔ دیگر زبانوں کے محاسن اور معائب پر وقوف حاصل کر سکیں گے اور اس طور پر علاوہ اس کے کہ خود اردو زبان وسیع ہوگی اس کے ہمہ گیر ہونے کا امکان اور زیادہ ترقی کر جائے گا۔ اس مسئلہ خاص میں انجمن ترقی اردو کی مساعی ہر نوع قابل ستائش ہیں، لیکن جس پر یہ فرض اپنی انتہائی سختیوں کے ساتھ لازم آتا ہے وہ مسلم یونیورسٹی ہے میرا خیال ہے کہ اگر یہاں کے اردو داں اسٹاف پر فرداً فرداً یہ ذمہ داری عائد کر دی جائے کہ وہ یونیورسٹی کی نگرانی میں اپنے مضمون خاص کی کسی مقتدر تصنیف کو اردو کے قالب میں لائیں تو شاید بے موقع نہ ہوگا۔

افسانہ نویسی ساتویں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے وہ دوست اور کرم فرما جن کو اردو ادب کا ذوق صحیح ہے اور ان کی انشاپردازی ہر حیثیت سے مسلّم ہے، اپنی توجہ کو مختصر افسانہ نویسی اور

اور ناول نگاری کی طرف مائل فرمائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت جب کہ ملک میں ادب متین کی طرف سے انتہائی استغنا برتا جا رہا ہے اور معقول یا غیر معقول اسباب کی بنا پر اُردو ہماری توجہ کو جذب نہیں کر رہی ہے، ہمارے انشا پردازوں کو ایسی چیز پیش کرنی چاہیئے جو عوام کے لمحات فرصت کو دلچسپ اور ایک حد تک کارآمد بھی بنا سکے۔ اس وقت ہمارا ادبی ذوق جس حد تک پست ہو چکا ہے اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ اُردو میں سستے اور مبتذل ناول کثرت سے پھیل چکے ہیں اور معمولی لکھا پڑھا آدمی ہمیشہ ان کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی ابتدائی نقوش اس کے علمی اور عملی زندگی دونوں کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دیتے ہیں۔ جس قسم کی افسانہ نگاری کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ مشرقی معتقدات، مشرقی شعائر، مشرقی تہذیب و تمدن اس صنف انشا کے لئے ہر طور پر راس آسکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ مشرقی آب و رنگ اس کے لئے نہایت موزوں ہیں لیکن افسانہ نگاری کا فن بجائے خود نہایت مشکل ہے اور اس کے اصول و قواعد کو عمل میں لانا آسان نہیں ہے۔ ان افسانوں اور ناولوں میں مقامی رنگ کا ہونا لازمی ہے ورنہ یہ ہمارے جذبات سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں گے۔ غرضکہ اس سلسلہ میں ہم کو نئی بنیاد تعمیر کرنی پڑیگی جس کے لئے ہمارے ماہرانِ ادب کو طیار ہو جانا چاہیئے۔

”اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا“

حضرات! مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کر چکا، آپ نے جس صبر و شکر کے ساتھ میرے خیالات کی پزیرائی فرمائی ہے اس کا شکر گزار ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب کوئی ایسا موقعہ نہ آئے جہاں میری جسارت اور آپ کے ضبط و تحمل کو یوں معرض امتحان میں لایا جائے۔ صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کا میں نے عمداً کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے اور وہ یہ کہ کہنا سننا تو ہمیشہ رہا ہے، اس سے حاصل ہی کیا،

”کچھ کیجئے بھی“

جس اندیشہ سے میں نے اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیا وہ آپ پر روشن ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

*

لکچر نمبر ۵

جغرافیہ کا تصوّر اور اُس کی تعلیم میں مشاہدات کی ضرورت

مسٹر سوہن لال صاحب بی اے ۔ بی ٹی لکچرار جغرافیہ و تاریخ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

علم جغرافیہ میں اُن تمام کوششوں پر بحث کی جاتی ہے جو انسان کو اپنے گرد و پیش کے حالات کو اپنے مفید مطلب بنانے میں عمل میں لانی پڑتی ہیں ۔ جغرافیہ پڑھاتے وقت ہمیں دنیا کے مختلف حصّوں کے صرف طبعی حالات مثلاً پہاڑ ، دریا ، آب و ہوا ، پیداوار اور وسائل آمد و رفت ہی نہیں سکھانے چاہئیں ۔ بلکہ ان طبعی حالات اور ظہورات کا آپس میں تعلق اور اُن سب کا انسان کی زندگی پر اثر ظاہر کرنا چاہئیے ۔ ہمیں یہ دکھانا چاہئیے کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں انسان کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں ۔ کہاں تک انھوں نے اپنی زندگی کو اس طبقے کے حالات کے مطابق ڈھالا ہے جس میں وہ رہتے ہیں ۔ مختلف خطّوں کے قدرتی خط و خال و حالات کا وہاں کے باشندوں کے کاروبار ۔ رہنے سہنے کے طریق ، گھروں کی بناوٹ ، خوراک ، پوشاک ، مذہب اور تہذیب پر گہرا اثر پڑتا ہے ۔ اگر آپ گرین لینڈ کے اسکیمو ، صحرائے اعظم میں رہنے والے بدّو اور برہما میں رہنے والے برہمی کی زندگی کا آپس میں مقابلہ کریں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہر ایک کی زندگی اپنے ارد گرد کے طبعی حالات کے مطابق ہے طبعی حالات کا اختلاف ہی ہے کہ دنیا کے بعض حصّوں میں لوگ بھیڑ بکری چرا کر یا گلّہ بانی کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ بعض حصّوں میں کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں ۔ بعض جگہ بڑے بڑے کارخانوں میں صنعت و حرفت کی اشیا تیار کرتے ہیں ۔ بعض حصّوں میں آبادی گنجان ہے اور بڑے بڑے شہر بس گئے ہیں ۔ بعض حصّے غیر آباد ہیں اور وہاں کوئی بڑا شہر آباد نہیں ۔

جغرافیہ کی تعلیم میں ساتھ ہی یہ بھی دکھانا چاہئیے کہ کہاں تک انسان نے اپنے ارد گرد کے طبعی حالات سے فائدہ اُٹھایا ہے ۔ ناروے اور سویڈن کے جنگلات میں جہاں کسی قسم کی کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی ، سخت چٹانیں پائی جاتی ہیں ، اور سردی بہت پڑتی ہے اور انسان کا رہنا نہایت مشکل ہے ، کئی قسم کے کارخانے پائے جاتے ہیں ۔ کیونکہ دریاؤں کے آبشاروں سے بجلی پیدا کی جاتی ہے اور ۔ ارہ کشی کا کام ہوتا ہے ۔ کاغذ ، دیاسلائی

رال، بیروزہ بنانے کے کارخانے جاری کردیئے گئے ہیں اور لوگ باوجود آب و ہوا کے ناموافق ہونے کے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قدرتی ذرائع دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح پنجاب میں چالیس سال پہلے جہاں آج کل لائل پور ہے، لق و دق ریگستان تھا۔ سوائے چند ایک بھیڑ بکری چرانے والوں کے کوئی نہیں رہتا تھا۔ کسی قسم کی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ انسان نے دریائے چناب سے نہریں کھودیں اور اب نہایت قیمتی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ سڑکیں اور ریلیں جاری ہیں منڈیاں اور شہر آباد ہیں۔ سکول اور کالج کھلے ہوئے ہیں، تجارت ہوتی ہے۔ اور لوگ خوش حال ہیں۔ جب ان باتوں پر زور دیا جاتا ہے جغرافیہ ایک دلچسپ کہانی بن جاتا ہے۔

جغرافیہ کی تعلیم میں یہ بھی ظاہر کرنا چاہیئے کہ کس طرح سے ایک انسان دوسرے انسان کا دست نگر ہے کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ خوراک جو ہم روزمرّہ کھاتے ہیں. کتنے آدمیوں نے محنت کرکے اسے تیار کیا ہے یا کپڑے جو ہم پہنتے ہیں یا مکان جس میں ہم رہتے ہیں، اِن کے تیار کرنے میں کس کس ملک کے آدمیوں نے حصّہ لیا ہے۔ ایک خطّے کے انسان دوسرے خطّوں کے انسانوں کے نہ صرف مادّی اشیاء بلکہ خیالات، مذہب، سائنس، علم ادب کے محتاج ہیں۔ جب طلبہ کے یہ باتیں ذہن نشین ہونگی اُن میں انسان کے ساتھ ہمدردی کا مادہ ترقی پائے گا۔ پس جغرافیہ کی تعلیم میں چار باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

اوّل - طبعی حالات کا بیان کرنا کافی نہیں۔ اُن کا آپس میں تعلق ظاہر کرنا چاہیئے اور ان کے واقع ہونے کی وجوہات طلبہ کے ذہن نشین کرنی چاہئیں۔

دوم - طبعی حالات کا انسان کی زندگی پر اثر ظاہر کرنا چاہیئے۔

سوم - یہ دکھانا چاہیئے کہ مختلف خطّوں کے رہنے والے لوگوں نے کہاں تک قدرتی دولت سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس کو اپنے مفید مطلب بنایا ہے یا نہیں۔

چہارم - ایک خطّے کے رہنے والے دوسرے خطّوں کے رہنے والوں کے کن کن باتوں میں محتاج ہیں اور اُن کا آپس میں تجارتی تعلق کہاں تک ہے۔

اس قسم کی تعلیم سے طلبہ میں اپنے اردگرد کے حالات پر غور و خوض کرنے کی عادت اور انسان کے ساتھ ہمدردی کرنے کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر ہم جغرافیہ کی تعلیم میں ان باتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ یہ تعلیم طلبہ کے مشاہدات پر مبنی ہو۔ طلبہ اپنے اردگرد کے حالات کے مشاہدے اور نقشہ جات کے مطالعہ سے بطور خود واقعات کا علم حاصل کرنا سیکھیں اور اُن واقعات سے صحیح نتائج نکال سکیں ہمارے سکولوں میں جغرافیہ پڑھاتے وقت عام طور پر

مشاہدات کافی مقدار میں نہیں کرائے جاتے۔ اس لئے اس مضمون میں طلباء کی دلچسپی جتنی ہونی چاہئیے نہیں ہوتی اور نہ طلبہ میں اپنے ارد گرد کے حالات پر غور وخوض کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے جو جغرافیہ کی تعلیم کا بڑا مدعا ہے اسکول کے باہر مشاہدے کا کام اصول جغرافیہ کے سمجھنے میں مدد دینے کے علاوہ مدرسے کی تعلیم اور مناظر قدرت میں ایک تعلق پیدا کرتا ہے۔ ہر پیشے کے آدمیوں کے لئے ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ قدرت کی رنگ آمیزی حسن اور مفید چیزوں کی قدردانی کا مادّہ پیدا کرتا ہے اور طلبہ کو فرصت کا وقت مفید طرح سے صرف کرنا سکھاتا ہے۔ اب میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اسکول کے باہر مشاہدات کرانے میں کس کس قسم کی مشقیں پرائمری اور مڈل اسکول کے طلبہ سے کروانی چاہئیں۔

جغرافیہ میں مشاہدات کا کام کچھ تو کم از کم اسکول کے وقت میں کیا جا سکتا ہے۔ یا آدھے دن کی تعطیل میں۔ اکثر حالتوں میں انفرادی کام دوران تعطیل میں کیا جاتا ہے۔ یہ کام حسب ذیل مقامات پر کیا جاتا ہے:۔

اسکول کے گرد کھیل کے میدان میں۔ سکول سے فاصلے پر گاؤں میں جہاں ایک دن میں آ جا سکیں۔

عجائب گھر یا کسی اور دلچسپ مقام میں۔

کھیل کے میدان میں مشاہدے کا کام

میدان کے ایک کونے میں ریت کا ڈھیر جمع کر دو۔ بارش برسنے کے بعد طلباء کی توجہ مندرجۂ ذیل باتوں کی طرف دلاؤ:۔

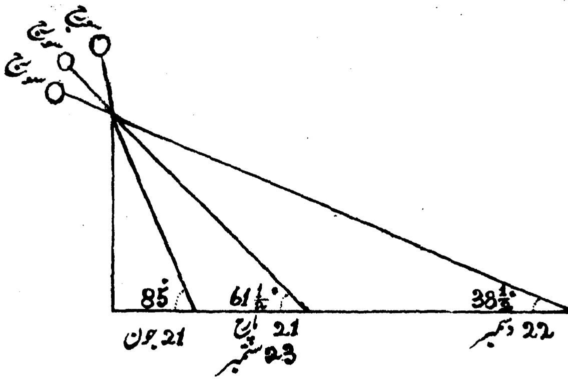
(۱) پانی اونچی سطح سے نیچی سطح کی طرف بہتا ہے۔ پانی گدلا ہے۔ دایاں کنارہ کون سا ہے؟ بایاں کنارہ کون سا ہے؟ معاون دریا کیا ہے؟ سنگم کیا ہے؟ کاس کیا ہے؟

(۲) اُن گڑھوں میں جہاں بارش کے بعد پانی جمع ہو جاتا ہے مٹی کے تین اجزا، کنکر، ریت اور چکنی مٹی نہایت خوبی سے دکھائے جا سکتے ہیں۔ کنکریلی مٹی سب سے پہلے نیچے بیٹھتی ہے۔ کیونکہ یہ سب سے بھاری ہوتی ہے اس کے بعد ریت اور اس کے بعد چکنی مٹی جو نہایت باریک ہوتی ہے مٹی کے دو اور اجزا (۱) پانی (۲) اور حیوانی اور نباتاتی مادّے ہوتے ہیں جو زمین کے کھودنے سے آسانی سے دکھائے جا سکتے ہیں۔

(۳) کھیل کے میدان کے ایسے حصے میں جہاں تمام دن دھوپ رہے۔ ایک ہموار چبوترہ پر عمودی سلاخ گڑی ہونی چاہئیے۔ اس کے سایہ کی مختلف سمتوں اور گھٹنے بڑھنے کا مشاہدہ کرنا چاہئیے۔ اس کی مدد سے مفصل ذیل باتیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ (۱) اطراف کا ٹھیک تصور (۲) نصف النہار معلوم کرنے کا طریقہ (۳) آفتاب کا روزانہ ظاہری سفر (۴) مقامی وقت اور سٹینڈرڈ ٹائم میں فرق (۵) مختلف تاریخوں میں دوپہر کے وقت آفتاب کی بلندی (۶) مختلف تاریخوں میں آفتاب کے طلوع اور غروب ہونے کا مقام۔

اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ سورج ہمیشہ مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں چھپتا ہے یہ کچھ حد تک ہی ٹھیک ہے۔

سال میں صرف دو دن ۲۱ مارچ اور ۲۳ ستمبر کو سورج ٹھیک مشرق سے نکلتا ہے۔ اور ٹھیک مغرب میں چھپتا ہے۔ انہی دو دنوں میں عمودی سلاخ کا سایہ سورج نکلتے وقت اور چھپتے وقت ایک ہی لائن میں ہوتا ہے۔ مندرجۂ ذیل ڈائگرام میں علی گڑھ کے مقام پر چار مختلف تاریخوں کو دوپہر کے وقت سورج کی بلندی ظاہر کی گئی ہے



۲۱ جون کو عمودی سلاخ کا سایہ دوپہر کے وقت سب سے چھوٹا ہے اور سورج آسمان میں سب سے زیادہ بلندی پر ہے ۲۱ مارچ اور ۲۳ ستمبر کو سایہ ماہ جون کی نسبت لمبا ہے اور سورج آسمان میں کم بلند ہے۔ ۲۲ دسمبر کو سایہ سب سے لمبا ہے اور سورج آسمان میں بہت ہی نیچا ہے۔ جون کے مہینے میں سورج کی شعاعیں عموداً پڑتی ہیں۔ دسمبر میں بہت ترچھی پڑتی ہیں۔ اس مشاہدے سے طلبا پر روشن ہو جائے گا کہ موسموں کا تغیر اور تبدل دوپہر کے وقت کے سورج کی بلندی پر منحصر ہے۔ اور ان کے دل میں دوپہر کے وقت سورج کی بلندی میں اختلاف کی وجہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔

مڈل کی جماعتوں میں کم از کم دو ماہ یعنی جولائی اور جنوری کے مہینوں میں میکسیمم تھرمامیٹر کے ذریعے درجہ حرارت بیرومیٹر کے ذریعے سے ہوا کا دباؤ۔ مرغ بادنما سے ہوا کا رخ۔ اور بارش کی تفصیل روزانہ باقاعدہ رکھنی چاہیے۔ اس کی مدد سے طلبا کو درجہ حرارت اور ہوا کے دباؤ میں تعلق۔ اور ہوا کے دباؤ اور ہوا کی صحت میں تعلق اور ہوا کی سمت اور بارش کا تعلق اور بارش کا درجہ حرارت پر اثر دکھایا جاسکتا ہے۔ نیز مقامی آب وہوا سے وطن کی آب وہوا سے مقابلہ کرنے سے دوسرے مقامات کی آب وہوا کا ٹھیک تصور دیا جاسکتا ہے۔ اوسط ماہواری درجہ حرارت اور بارش کے گراف کھینچنے چاہئیں اور ان کا اور مقامات کے گراف سے مقابلہ کرنا چاہیے اور فرق کی وجہ معلوم کرنی چاہیے۔ اس قسم کے عملی کام کے بغیر آب وہوا کا ٹھیک تصور طلبہ کو نہیں دیا جاسکتا۔

نزدیک کے گاؤں میں مشاہدات کا کام

پرائمری جماعتوں میں زمین کے نشیب و فراز، چشمے، تالاب،

نہریں، سڑکیں اور ریل کی لائن دکھانی چاہئیں۔ سکول کے لحاظ سے ان کا محل وقوع نوٹ کروانا چاہیئے۔ پھر ان کو نقشے پر معلوم کریں کہ کس طرح سے ظاہر کی گئی ہیں۔ اس سے نقشے کا تصور مکمل ہوتا ہے۔

دریا اور اس کا کام جہاں تک ہو سکے دریا کا مشاہدہ کسی اونچے مقام سے کرنا چاہیئے اور اس بات پر توجہ دینی چاہیئے کہ گھاٹیاں کس طرح سے فراخ، گہری اور لمبی ہوتی جاتی ہیں۔ دریا کی تیز رفتاری سے کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ گزرگاہ میں ٹیڑھا پن اور آبشاریں کس وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اگر کسی دریا کا مشاہدہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں خاص طور پر سکھانی چاہئیں۔

(۱) آیا دریا بارہ مہینے بہتا ہے یا سال کے کسی خاص حصے میں؟ سبب بتلاؤ۔

(۲) دریا کے مختلف حصوں میں پانی کی رفتار میں کیا فرق ہے؟

(۳) کون سا کنارہ دریا کا کھایا جا رہا ہے؟ کون سے کنارے پر مٹی جمع ہو رہی ہے؟ دریا کے پانی اور کنوئیں کے پانی میں کیا فرق ہے؟ اور کیوں؟

(۴) دریا میں کب سیلاب آتا ہے؟ جب سیلاب اتر جاتا ہے۔ تو کناروں پر کیسی مٹی جمع ہو جاتی ہے کیوں؟

(۵) کس موسم میں پانی کی مقدار سب سے کم ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ دریا پر کس قسم کے مال کی آمد و رفت ہوتی ہے دریا سے کیا کیا فائدے حاصل ہیں؟ اور کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں؟

ب ۔ برسات کے بعد دکھاؤ کہ ہموار میدان کی نسبت، ڈھلوان میدان پر بارش کا پانی زیادہ فرسودگی عمل میں لاتا ہے۔ اسی طرح سے جن چٹانوں پر گھاس یا اور قسم کی نباتات اُگی ہوتی ہے۔ بارش کے اثر سے کم فرسودہ ہوتی ہیں۔ بہ نسبت برہنہ چٹانوں کے۔ ڈیرہ دون اور ہوشیارپور کے اضلاع میں بہت سی زمین اس وجہ سے ناکارہ ہو گئی ہے کہ پہاڑی نالے تمام مٹی کو جس میں فصل بوئی جا سکتی ہے بہا کرلے گئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان چٹانوں پر جہاں سے یہ نالے آتے ہیں، گھاس اور نباتات قائم نہیں رہتی، بلکہ بھیڑ بکریوں کے چرانے سے صاف کروا دی جاتی ہیں۔ اور یہ پہاڑی نالے اس قدر زور سے بہتے ہیں کہ تمام مٹی کو اپنے ساتھ بہا کرلے جاتے ہیں اور زمینداروں کا ہزاروں روپیہ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اگر نباتات کو قائم رکھا جائے تو یہ نقصان نہ ہو۔

ج ۔ آس پاس کے کھیتوں کی فصلیں سال میں کم از کم دو مرتبہ ان کا مشاہدہ چاہیئے۔ ذیل کی باتوں پر دھیان دینا چاہیئے۔ ہر فصل کے بیج بونے اور کاٹنے کا وقت کیا ہے۔ کون کون سی فصلوں کو مصنوعی آبپاشی کی ضرورت ہے۔ آبپاشی کا طریقہ کیا ہے۔ کون کون سی فصلوں کے لئے کھاد کی ضرورت ہے۔ کون کون سی کھاد استعمال کی جاتی ہے ہر فصل کے لئے کس قسم کی مٹی کی

ضرورت ہے۔ کاشتکاری کے لئے کس قسم کے آلات اور طریق استعمال کئے جاتے ہیں۔ فصلیں کھیتوں سے منڈی تک کس طرح لے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں دوسرے خطوں کی پیداوار کے سمجھنے میں بہت مفید ہوں گی۔

نزدیک کے درختوں کے متعلق ان باتوں پر دھیان دینا چاہیئے

آیا پانی کے نزدیک واقع ہیں یا دور۔ پتے موٹے ہیں یا پتلے۔ چھوٹے ہیں یا لمبے۔ سوئی کی طرح خاردار ہیں یا چوڑے ہیں۔ کیوں؟ چھال موٹی ہے یا پتلی گوند یا اور کوئی چیز اس سے نکلتی ہے یا نہیں۔ جڑیں کیسی ہیں کون سے درخت ہمیشہ سرسبز رہتے ہیں۔ کن کے جاڑے کے موسم میں پتے جھڑ جاتے ہیں۔ تنوں، پتوں، چھال، جڑ اور پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ ان درختوں پر کون کون سی مقامی حرفت کا انحصار ہے۔ ہندوستان یا دنیا کے جنگلات کے سبق میں یہ باتیں بہت مفید ہوں گی۔

حرفت اگر کوئی مل یا کارخانہ ہو تو اس کے متعلق ان باتوں پر توجہ دلاؤ،

(۱) کس طاقت سے کارخانہ چلتا ہے؟ (بھاپ یا تیل یا بجلی یا پانی کی طاقت سے)

(۲) کون سی خام اشیاء استعمال کی جاتی ہیں؟ اور کہاں سے لائی جاتی ہیں؟

(۳) مصنوعات کیا ہیں؟ کہاں بھیجی جاتی ہیں؟

(۴) اس مقام پر کارخانہ کیوں کھولا گیا ہے؟

مال گودام طلبہ کو کہنا چاہیئے کہ وہ مال گودام میں جا کر معلوم کریں کہ کون کون سی اشیا ریل کے ذریعے سے آتی ہیں۔ کہاں سے یہ مال آتا ہے اور کون کون سی اشیا باہر بھیجی جاتی ہیں۔ انفرادی طور پر لڑکوں سے کہا جائے کہ وہ شہر کے مختلف دروازوں سے گزرنے والے اسباب کا حال، آس پاس رہنے والے لوگوں کے پیشے، سڑکوں اور نہروں کے راستہ کا حال لکھ کر لائیں۔ اور ان پر جماعت میں بحث کی جائے۔ اگر کوئی میلہ لگے تو طلبہ سے کہنا چاہیئے کہ وہ معلوم کریں کہ میلے میں کیا کیا چیزیں بکنے آتی ہیں اور وہ کہاں سے لائی جاتی ہیں کس طرح سے انھیں لاتے ہیں اور ان مشاہدات سے طلبہ ملکوں کی تجارت اور ان کے آپس کے تعلق بخوبی سمجھ سکیں گے۔

اگر طلبہ خرچ برداشت کر سکیں تو ان کا استاد کے ساتھ ریل کے ذریعے یا موٹر لاری کے ذریعے کسی مشہور مقام مثلاً کوئلہ کی کان، صحت افزا مقام، نہر کا ہیڈ، صوبہ کے صدر مقام پر جانا نہایت مفید ثابت ہوگا۔ ان سیروں میں مختلف مقامات کے نظاروں اور لوگوں کی زندگی کے باہمی اختلاف پر خاص زور دینا چاہیئے۔ اور ان کی وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

چاہے کوئی مشاہدے کا کام کیا جائے۔ ایک یا دو باتوں پر خاص دھیان دینا چاہیئے۔ ہر ایک سفر کی اچھی طرح سے تیاری کر لی جائے۔ جس جگہ جانا ہو مدرس کو پہلے ہی اس کے متعلق پوری طرح سے دیکھ بھال

کرلینی چاہیئے۔ اور ان باتوں کو جن کی طرف طلبہ کی توجہ مبذول کروانی ہے۔ پہلے ہی سے نوٹ کر لینا چاہئیں نیز وہ سوالات اور مشقیں بھی سوچ لیں جو لڑکوں سے حل کرانی ہیں۔ اس بارے میں مدرس کو ضلع کے گزیٹیر کا مطالعہ کرنا ازبس مفید ہوگا۔

(۲) سبق کے مضمون کے کچھ اشارے دیدیئے چاہئیں۔ اور طلبہ کو اس قابل بنا دینا چاہیئے کہ جو کچھ کرنا ہو وہ انھیں پہلے سے ہی معلوم ہونا چاہیئے۔

(۳) سیر کے بعد ان تمام معلومات اور مصالح پر جو فراہم کیا ہے سکول میں سبق دینا چاہیئے۔

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے طلبہ سے گرمیوں کی چھٹیوں کے شروع میں کہا جاتا ہے کہ اپنے اپنے گاؤں کا جغرافیہ بطور خود مشاہدہ کرکے اور جو باتیں وہ خود نہیں دیکھ سکتے، گاؤں کے رہنے والوں سے دریافت کرکے مفصل لکھ کر لائیں۔ انھیں اس کے متعلق پندرہ بیس سوالات دیدیئے جاتے ہیں جن کا جواب وہ خود مشاہدہ کرکے لکھتے ہیں۔ اسی طرح سے اُن کو عملی طور پر سکھایا جاتا ہے کہ جغرافیہ کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیئے۔ اُن کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر طلبہ میں مشاہدات کا شوق پیدا کردیا جائے تو وہ بہت سی نئی باتیں اور تعلقات دریافت کرسکتے ہیں۔ جستجو کا مادہ ہے جس کی ہمیں تربیت کرنی چاہیئے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۲۳ء کو، لاہور سنٹرل ٹریننگ کالج کے تقریباً ۳۰ طلبا بیروزہ صاف کرنے کے کارخانہ کو دیکھنے کے لئے جلّو گئے۔ جلّو لاہور سے ۹ میل کے فاصلہ پر امرتسر جاتے ہوئے ریلوے لائن پر واقع ہے اس لئے طلبہ پیدل ہی گئے۔ راستہ میں درختوں اور فصلوں کا جو کھیتوں میں اُگی ہوئی تھیں مشاہدہ کیا۔ اور نقشے کی مدد سے مختلف رستوں اور مقامات کی بلندیوں کو معلوم کیا۔ کارخانے کے متعلق مندرجہ ذیل مشاہدات کئے گئے اور سوال دیئے گئے۔

(۱) کارخانے کا محل وقوع	(الف) کارخانہ اُس ریلوے لائن پر واقع ہے جو مغرب سے مشرق کو پنجاب کے پہاڑوں کے جنوب میں جاتی ہے۔ ان پہاڑوں سے کچا سامان یعنی گندہ بیروزہ آتا ہے۔

(ب) یہ لاہور اور امرتسر کے قریب واقع ہے جہاں تیار شدہ سامان فروخت ہوتا ہے۔

(ج) یہ سرکاری رکھ پر واقع ہے جہاں سے لکڑی کارخانے میں جلانے کے لئے سستی مل جاتی ہے۔

(۲) طاقت جس سے کارخانہ چلتا ہے	یہ کارخانہ دُخانی طاقت سے چلتا ہے اور پتھر کے کوئلہ کی بجائے لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ کوئلہ کی نسبت یہ سستی پڑتی ہے پتھر کا کوئلہ جھریا واقع بہار سے لانا پڑتا ہے اس واسطے کوئلے پر لاگت

بہت صرف ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے لکڑی نزدیک ہی سستی دستیاب ہوجاتی ہے۔ لیکن اب لکڑی کی بہم رسانی کم ہوتی جاتی ہے۔ پتھر کا کوئلہ استعمال کرنا پڑے گا۔ روشنی کے لئے بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک آئل انجن سے کام لیا جاتا ہے۔

(۳) کچا سامان کہاں سے آتا ہے اور کس طرح حاصل کیا جاتا ہے؟

پنجاب کے پہاڑوں میں تین ہزار سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر چیڑ کے درختوں کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کے تنے میں چاقو سے ایک شگاف کیا جاتا ہے۔ اور اس کے نیچے ایک پیالی لٹکا دی جاتی ہے جس میں رس نکل کر جمع ہو جاتا ہے۔ پھر اس پیالی کو کنستر میں الٹ دیا جاتا ہے۔ یہ رس گندہ بیروزہ ہوتا ہے۔ ایک درخت میں کتنے ہی شگاف کئے جاتے ہیں۔ ان سے درختوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ گندہ بروزہ زیادہ تر ہزارہ، کوہ مری، ڈلہوزی، چمبہ، کلو، شملہ اور ریاست پٹیالہ کے پہاڑی مقامات سے آتا ہے۔ ان پہاڑوں کے نزدیک ریلوے اسٹیشن راولپنڈی، پٹھان کوٹ اور کالکا ہیں۔

(۴) تیار شدہ اشیاء اور یہ کس طریقے سے تیار کی جاتی ہیں

کارخانہ کے منیجر صاحب نے ہمیں بتایا کہ کس کس طریقے سے گندہ بروزہ کو کشید کیا جاتا ہے اور اُس سے تارپین کا تیل۔ رال۔ بروزہ تیار کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان تمام اشیاء کو آگ لگنے کا بہت زیادہ ڈر ہوتا ہے۔ اس واسطے کارخانہ کے اس کمرہ کے نزدیک جہاں پر گندہ بروزہ کشید کیا جاتا ہے آگ بالکل نہیں لائی جاتی۔ سگرٹ تک پینے کی کسی کو اجازت نہیں۔ کشید کرنے کے لئے گندہ بروزہ سے بھرے ہوئے بند برتنوں کے اردگرد بھاپ گھمائی جاتی ہے۔ اس کی گرمی سے تارپین کے تیل کے بخارات بن بن کر نلیوں میں جاتے ہیں اور وہ کثیف کئے جاتے ہیں۔ یہ عمل کئی دفعہ کیا جاتا ہے۔

تارپین کا تیل دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر تارپین بروزہ اور رال سے مختلف قسم کی وارنش اور روغن تیار کئے جاتے ہیں۔ جو کواڑ، چوکھٹ اور چھتوں کو رنگنے کے کام آتے ہیں۔

(۵) کارخانہ کی سالانہ پیداوار

یہ معلوم کیا گیا تھا کہ کارخانہ میں اسی ہزار من بیروزہ سالانہ کشید کیا جاتا ہے منافع چھ لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ یہ دنیا میں بہت بڑے کارخانوں میں سے ایک ہے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ایک کارخانہ ضلع مرادآباد میں بھووالی کے مقام پر ہے۔ وہاں پر سالانہ تیس ہزار من بیروزہ کشیدہ کیا جاتا ہے۔ تارپین کا تیل اور بیروزہ جو ان کارخانوں میں تیار ہوتا ہے پنجاب اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں خرچ ہوتا ہے۔ باہر نہیں بھیجا جاتا ہے طلبہ پر یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ کارخانہ پچھلے دس سال سے قائم ہے۔ اگر پنجاب اور صوبجات متحدہ کے جنگلات سے پورا پورا فائدہ

اُٹھایا جائے تو وہ صرف تمام ہندوستان کی ضروریات ہی کو ہم نہیں پہنچائیں گے بلکہ نزدیک کے ملکوں خاصکر عراق عرب اور مصر میں بھی عمارتی لکڑی اور تارپین اور بیروزہ بھیجے جاسکتے ہیں اور ان ملکوں میں جنگلات بالکل نہیں پائے جاتے۔ اس واسطے تمام قسم کی جنگلات کی پیداوار ناروے۔ سویڈن، برٹش کولمبیا اور جرمنی اور اضلاع متحدہ سے منگوانی پڑتی ہیں۔ لاہور اور لکھنؤ کے ریلوے ورکشاپ میں اگر کبھی جانے کا اتفاق ہو تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر بھی ریل گاڑی بنانے کی لکڑی ناروے، سویڈن، برٹش کولمبیا اور اضلاع متحدہ سے لائی گئی ہے۔ حالانکہ یہی لکڑی پنجاب اور صوبجات کے جنگلوں میں پڑی سڑا کرتی ہے وجہ یہ ہے کہ ذرائع آمد و رفت مشکل ہونے کی وجہ سے ان جنگلات سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا۔

(۶) دیگر پیداوار یہ مشاہدہ کیا گیا تھا کہ کارخانے میں اعلیٰ درجہ کی صفائی ہے۔ اور کوئی چیز بھی ضائع نہیں کی جاتی۔ بیروزہ کشید کرنے کے بعد جو کچھ بھی بچ رہتا ہے اُس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

چونکہ بیروزہ جنگلات سے لانے کے لئے کنستروں کی ضرورت ہے۔ اس واسطے ایک چھوٹا سا کارخانہ کنستر بنانے کا قائم کر رکھا ہے۔ اسی طرح سے بیروزہ باہر بھیجنے کے لئے پیپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی کارخانے میں پڑتل کی لکڑی سے تیار کئے جاتے ہیں۔

(۷) جنگلات کے متعلق طلبہ کو پڑھنے کے لئے کتابیں اور سوالات کارخانہ کا مشاہدہ کرنے کے دوسرے دن بعد کالج میں ہندوستان میں جنگلات کی تقسیم اور ان کی وجہ سے مختلف قسم کے کارخانوں کے قائم ہونے پر سبق دیا گیا۔

اور اُن سے کہا گیا کہ پنجاب کے انتظام کی سالانہ رپورٹ اور Indian yeer Book کا مطالعہ کریں مندرجہ ذیل سوالات اور دیئے گئے۔

(ا) پنجاب میں محکمہ جنگلات کا کیا کام ہے؟

(ب) ہندوستان میں کتنی لاگت کا تارپین، بیروزہ، وارنش اور مختلف قسم کے روغن اور رنگ، کاغذ، دیاسلائی باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ کن کن ملکوں سے یہ اشیاء لائی جاتی ہیں۔ ان ملکوں میں ان اشیاء کے پیدا ہونے کی خاص وجوہات کیا ہیں؟

ان سیروں سے یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ ان سے ذاتی معلومات حاصل ہوتے ہیں اور کھلی ہوا میں رہنے سے صحت میں ترقی ہوتی ہے۔ بلکہ دماغی اور جسمانی فوائد کے علاوہ اخلاقی فائدہ بھی متصور ہوتا ہے

اُستاد اور شاگرد کے ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننے اور واقف ہو جانے سے، شاگرد کے مخفی قوے اور
قابلیتوں کے ترقی پا جانے اور عیاں ہونے سے مختلف اقوام اور مذاہب کے بچّوں کے باہمی میل جول اور
اختلاط کے سبب لین دین اور داد و ستد کی ضرورت کے احساس اور وسعت نگاہ سے چال چلن پر بہت گہرا
اثر پڑتا رہتا ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اس قسم کی ایک دن کی سیر سے بشرطیکہ یہ مناسب طریق پر کرائی جائے وہ فائدہ
پہنچتا ہے جو ہفتہ بھر مدرسے میں باقاعدہ حاضر رہنے سے ہی پہنچنا مشکل ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

Sohan Lal

Lecturer Central Training
College
Lahore

لکچر نمبر ۶

تاریخ کا معیار صحت

مرتبہ

مولوی ابن حسن صاحب ایم اے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی

(**نوٹ** - معزز لکچرر کانفرنس میں تشریف نہ لا سکے - صرف لکچر موصول ہوا)

تاریخ قصہ گوئی | تاریخ ایسا مضمون ہے کہ سب مضامین سے زیادہ اسی پر درشت زبانی اور عیب چینی کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کی مستحق نہیں ہے۔ اکثر بے سوچے سمجھے کہہ دیا جاتا ہے کہ تاریخ کیا ہے صرف قصہ گوئی ہے۔ لیکن ایسا بے سوچے سمجھے کہدینے والوں کو ذرا سنجیدگی سے خیال کرنا چاہیئے۔ اگر تاریخ قصہ گوئی ہے تو یہ قصے قوموں کے ہیں جن کے سورما نہ تو عشق باز تھے نہ فرضی قسمت آزما تھے۔ بلکہ وہ ایسے سورما تھے جنھوں نے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں سے یکساں اقوام کی تقدیروں کو سانچہ میں ڈھالا ہے۔

تاریخ انسان کی حماقتوں اور جرائم کی لکھی ہوئی کتاب ایک اور گروہ ہے جو کہتا ہے کہ تاریخ انسان کی حماقتوں اور جرائم کا نوشتہ ہے۔ اس گروہ کو یہ حقیقت جاننی چاہیئے کہ تاریخ ایسے نمایاں حرفوں میں لکھی ہوئی کتاب ہے کہ عقلا اور نیکوں کے لئے وہ تنبیہہ اور آگاہی ہے تاکہ وہ سب سے زبوں اور بڑی باتوں سے بچیں اور بہترین کی جستجو کریں۔

تاریخ ظن پیدا کرتی ہے | اُن لوگوں کو بھی یہ حقیقت جاننی چاہیئے (جن کا مقولہ ہے کہ تاریخ اقتدار حاصل کرنے

کی خواہش بد کی مثال پیش کرتی ہے۔ شان و شکوہ اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی نظیر دکھاتی ہے اور اس لئے وہ گھن پیدا کرتی ہے) کہ اس منزل پر بھی تاریخ "روسو" کی آواز بند نہیں کرتی جس نے دیکھا تھا کہ انسان آزاد پیدا کیا گیا تھا تاہم ہر جگہ وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا چنانچہ "روسو" ہم سے سفارش کرتا ہے کہ ہم فطرت کا مطالعہ کریں"۔ مورخ مستقبل میں اگر کوئی مقصود ہے تو وہ اس مقصود انسانی کو دیکھتا ہے۔ وہ ماضی کا خیال نہیں کرتا۔ مورخ کا یہ ترانہ نہیں ہے۔ "اے تھکے ملاح تو واپس چلا جا"۔ مورخ کا ترانہ تو ہمیشہ یہ رہا ہے "بھائیو اور ساتھیو وہ ہے جھلک پیچھا کرو"۔ چنانچہ ایسے معاملات کا جو بدترین ہوتے ہیں مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بہترین وقت کی امید کی جاتی ہے۔ نقاب سحاب کی اوٹ میں آفتاب دیکھا جاتا ہے مقصد پورا کیا جاتا اور مدعا حاصل ہو جاتا ہے۔

تاریخ کا تخیل اور مطمح نظر بعض ممالک مثلاً مصر میں اور کیلٹ قوم کے درمیان تاریخ نہایت ہی ابتدائی شکلوں میں بادشاہوں اور سرداروں کے نسب ناموں اور مشہور لوگوں کی مہمات کی کہانیوں سے شروع ہوئی اور یورپ میں تاریخ کا اس طرح آغاز ہوا کہ خانقاہوں کے طوماروں میں اندراج کئے گئے۔ اس منزل پر تاریخ ایک نظم رزمیہ تھی اور پرانے علم ادب کا ایک جز تھی۔ اس کی نمایاں مثالیں "ہومر کی نظمیں مغرب میں اور پاک اور شاندار راماین اور مہابھارت کا علم ادب مشرق میں موجود ہیں۔ معمولی علم ادب سے ان کو جو بات امتیاز کراتی ہے وہ یہ ہے کہ ماضی کے تجارب کی بنیاد پر مدبرین اور شہریوں کے طرز عمل کا ایک تخیل سانچہ میں ڈھالا گیا ہے یا یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ آنے والی نسلوں کے سامنے اخلاق کا ہیولیٰ پیش کیا جائے۔

یونانیوں کی حالت دیکھتے ہوئے یہ امتیاز صاف و صریح نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہیروڈوٹس نے اپنے معاصرین کو بتایا کہ میری کتاب کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کی یاد قائم رہے اور وہ واقعات تحریر میں آجائیں جو شہرت کے مستحق ہیں۔ تھیوسی ڈائڈ، ہیروڈوٹس سے بھی آگے ترقی کر گئے یعنی اس نے کہا ہے کہ "ماضی کا نہایت صحیح حال مفید ہوگا اس لئے کہ انسانی امکانات کا لحاظ کرتے ہوئے وہی واقعات پھر پیش آئیں گے"۔ پولی بی اس تھیوسی ڈائڈ کا مقلد ہے لیکن اس نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ واقعات نہایت صحت اور سچائی سے لکھے جائیں۔ چنانچہ دونوں کا خیال تھا کہ اس سے نیک چلنی کی طرف رہنمائی ہوگی اور مدبرین کے لئے یہ ایک آگاہی اور مثال ہوگی۔ یہ دونوں شخص روم کے واسطے نمونہ تھے۔ سنسرو اور ڈایونیسیس ان کے شاگرد تھے۔ چنانچہ اس منزل پر تاریخ علم ادب کا ایک حصہ تھی۔

دوسری منزل مسیحی مذہب کے ظہور کے ساتھ مورخین نے خدا کے طریقوں کو آدمی کے حسب حال اور مطابق کرنا شروع کر دیا۔ اوروسیس نے جس نے خود سینٹ آگسٹن کے زیر اثر لکھا، قدیم پرانی دنیا میں

سوائے ربانی قہر کے اور کچھ نہ دیکھا یعنی طاعون، وبائیں جنگیں اور انسانوں کی جانوں کا اتلاف سب ہی تو ربانی انصاف کے نتیجے تھے۔ سترہویں صدی میں جبکہ خوفناک مذہبی اختلاف یورپ میں پھیلے ہوئے تھے اس طریقہ کا خوب استعمال ہوا۔ لیو اور لوتھر پیرو ٹسٹنٹ اور کیتھولک اپنے معاملات کی تائید میں یکساں تاریخ سے اپیل کرتے تھے۔

اس طرح اگر قدیم پرانی دنیا میں یہ خطرہ تھا کہ تاریخ نظم اور سوانگ کی چھوکری ہو جائیگی تو اب اس کو یہ ڈر تھا کہ مذہب کی لونڈی بن جائے گی۔

تیسری منزل تاریخ کو اس غلامی سے رہائی دلاتی تھی = اور آزادی کا کام جو میچی ویل نے آغاز کیا تھا اُسے مان ٹسک نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ لیکن اس منزل پر بھی تاریخ کے خط و خال ادبی خوبی کا پہلو لئے ہوئے تھے۔ عوام کا یہی خیال تھا کہ ادبی پہلو کو مورخ زیادہ ملحوظ رکھتے اور اُن کی رائے میں مورخ کو قابلیت اور تحقیقات کی صفات کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ ہیوم جو طبیعات کا ماہر اور اسمولٹ جو ناول نگار تھا اور گولڈسمتھ جو ڈرامے لکھتا تھا اپنے زمانہ کے ہر دلعزیز مورخ تھے۔ آئرلینڈ کی تاریخ آئرلینڈ کے شاعر ٹام مور کے سپرد کی گئی جس نے حب الوطنی تخیل یا عبارت کی رنگینی کے سوا تاریخ جیسے انوکھے دشوار مضمون میں اور کچھ زیادہ نہ دکھایا اسی طرح جرمنی میں شلر نے خدمات نظم سے سبکدوش ہو کر جنگ سی سالہ کی تاریخ لکھی۔ چنانچہ یہ روایت کہ مورخ کو فصیح ہونا چاہیئے نصف صدی تک اور باقی چلی آئی۔ بین کرافٹ نیز مُوٹلے نے اپنی کتابوں کے اثر کو غیر ضروری قافیہ آرائیوں سے خراب کر دیا۔ فریمین کی کتاب "فتوحات نارمن" اور تاریخ سسلی میں اگر لفاظی کا میلان نہ ہوتا تو اُن کی زیادہ قدر کی جاتی کیونکہ یہ کتابیں مکمل تھیں ان میں ذکاوت کا اظہار تھا اور پوری تفصیل تھی۔

زمانہ حال کا تخیل اور طرز اُنیسویں صدی کے آغاز پر ایک اور تبدیلی ہوئی۔ یعنی وہی حرکت ذہن جس سے طبیعات۔ کیمیا۔ علم طبقات الارض اور علم نباتات کے میدان میں جدید دریافتیں کی گئیں، تاریخ کے طالب علم میں بھی ظاہر ہوئی۔

تاریخ میں سائنس کا طرز بڑا کارنامہ اُنیسویں صدی کا یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعہ میں سائنٹفک طریقہ کام میں لایا گیا۔ سائنٹفک طریقہ کا تاریخ سے جہاں تک تعلق ہے اس کو تھوڑی صراحت اور صاف وضاحت کی ضرورت ہے۔

ایک طبقہ تو اس سائنٹفک طریقہ سے یہ مراد لیتا ہے کہ مورخ کو تمامی ادبی نزاکتوں کو چھوڑنا اور سادہ طرز خواہ وہ خشک کیوں نہ ہو اختیار کرنا چاہئے۔ پروفیسر سیلے تو یہاں تک کہتا ہے کہ سائنٹفک نقطہ خیال سے قیمتی ہونے کی غرض سے ضرورت ہے کہ تاریخ گندا اور خشک ہو۔

چونکہ یہ عادت ہو چکی تھی کہ تاریخ کو اخلاقی ادب کا ایک حصہ گردانا جائے لہذا یہ رجعت تو ایسی تھی کہ مل ہی نہ سکتی تھی۔ چنانچہ یہ رجعت بین کرافٹ کی حد سے افزوں شاعرانہ بھرمار اور فراؤڈ کی تصویر نما بے پروائی کے خلاف عمل میں آئی۔ یہ رجعت مذاق زمانہ اور عملی کاروبار کے بھی موافق تھی۔

ایک اور طبقہ جس کے نمائندے بکل اور اسپنسر ہیں سائنٹیفک نام کا مدعی ہے اور اس کے ادعا نے یورپ اور امریکا دونوں میں بہت شور برپا کر رکھا ہے۔ اس طبقہ کی یہ جستجو ہے کہ تاریخ کو بلند کر کے یا گھٹا کر ٹھیک سائنس کی سطح پر لے آنا چاہئے جس طرح کہ دوسری طبیعی تحقیقات کے مختلف شعبوں کا حال ہے۔ یہ طبقہ خیال کرتا ہے کہ معاملات انسانی کی علت کا اندازہ عام قوانین سے ہوتا ہے یعنی وہ قوانین متمدن انسان کے افعال پر قواعد فطری کی طرح حکومت کرتے ہیں چنانچہ قومی خصائل۔ ذہنی رجحان اور اقتصادی غرض کے اظہار کا مطالعہ کر کے یہ طبقہ یقین کرتا ہے کہ وہ ایسے قوانین کے دریافت کر لینے کے قابل ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ ان قوانین کی نہایت مفصل چٹکلوں کے ذریعہ سے شرح کرتا ہے۔ ماضی کو اختصار کے ساتھ یکجا کرتا ہے۔ حال کی تفصیل کرتا ہے اور مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرتا ہے۔

اس طبقہ کے متعلق سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ سائنٹیفک نہیں ہے۔ وہ ایک فرد واحد کو نظر انداز کرتا ہے۔ انسانی جماعت کے مظاہر، خارجی فطرت کے مظاہر سے بالکل غیر مشابہ ہیں۔ مثلاً آکسیجن اور ہائڈروجن کو لیجئے۔ ان کا اثر عمل تمامی ممالک میں یکساں پائے گا اور ان کی خاصیت وہی ہے جو آج سے ہزاروں برس قبل تھی۔ لیکن مختلف ممالک میں مختلف اقوام کی انسانی جمعیت کے خط و خال قطعی مغائر ہوتے ہیں پس ان کا مطالعہ زیادہ دشوار ہے۔ چنانچہ کیمیا اور طبیعات کی قطعی غیر متبدل تول ناپ تاریخ کے معاملہ میں کام نہیں دے سکتی چنانچہ یہ کلیہ مایوسی کے ساتھ ناکام رہ جاتا ہے۔ بکل اپنی تاریخ تمدن میں نہایت زوردار انداز کا اظہار کرتا ہے مگر عمومیت کے معاملہ میں جہاں وہ اپنے اصول کو صحیح اور حق بجانب ثابت کرنا چاہتا ہے وہ ناکام رہ جاتا ہے۔ اس کی مشہور و معروف سعی جس میں اسپین اور اسکاٹ لینڈ کو وہ متوازی بناتا ہے صرف مضحکہ خیز ہے اسپنسر نے جس کے یورپ میں کثرت سے متبعین ہیں کم سے کم تاریخ کے معاملہ میں کچھ کر کے نہ دکھایا۔ یعنی ان سب نے تاریخ میں کوئی بات بھی ایسی اضافہ نہ کی جس کو مورخین پہلے سے نہ جانتے تھے۔ اس طبقہ نے جو کچھ دیا ہے وہ اقلیدس کے سے عام دعاوی کا ایک انبار ہے اور ایسے الفاظ میں وہ بیان کیا گیا ہے کہ زبان کے اعتبار سے وہ سائنٹیفک وضع کا معلوم ہوتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ کبھی تو وہ مبہم ہے کبھی گمراہ کرتا ہے اور کبھی اس کو سنجیدہ عبارت کا جامہ پہنایا گیا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ وہ ایسے اصول ہیں جو زیر عمل تھے اور جن کا یہ منشا تھا کہ شہادت کی سخت باقاعدہ جانچ کی جائے اور ذہن صرف اسی طرف مصروف کر دیا جائے

کہ صداقت اور محض صداقت کا تیقن کیا جائے۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے جوش اور ایسے طریقہ نے یقینی تاریخ کی اصل خدمت انجام دی ہے۔

اس طرح پہلی دو منزلوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سائنس یا مضمون کے اعتبار سے تاریخ کی کوئی جداگانہ نہیں ہے۔ اور وہ اسی خطرہ میں تھی کہ یا تو اس کو مذہب جذب کرلے یا علم ادب۔ چنانچہ سیچی ویل سے لیکر ماں ٹیک تک تاریخ کو آزادی دی گئی اور اس کی مسلمہ جگہ قائم ہوگئی۔ اور ۱۸۳۳ء میں جاکر اکسفورڈ اور کیمبرج میں ہسٹری (تاریخ) کا ایک ایک پروفیسر مقرر کیا گیا۔

انیسویں صدی سے انشا اور تخیل کے درمیان بحث جدالی شروع ہوئی جس کی جولانگاہ سائنٹفک اور ادب کے مابین تھی۔ لیکن عمل میں وہ تاریخی صداقت جس پر ہم زور دیتے ہیں نہ تو علم ادب ہی سے غیر مطابق ہے نہ سائنس سے یعنی تاریخ کے مطالعہ کے واسطے علم ادب کی بطور امداد کے ضرورت ہے اس سے ایک خاص زمانہ کی دماغی حالت کی صراحت ہوتی ہے اور سیاسی حرکات صاف سمجھ میں آتی ہیں جو تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کے واسطے ضرورت کی جان ہیں۔ اسی طرح سے علم ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے تاریخ ضروری ہے چنانچہ چاسر۔ شیکسپیر۔ ملٹن۔ برک۔ یا رسکن کے کلام کون سمجھ سکتا اگر وہ ان لوگوں کے زمانہ کی تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہوتا۔ اسی طرح جولیس سیزر۔ میک بتھ۔ کلی او پٹرا اور اینٹونی کو کون سمجھے گا جب تک اس کو واقعی طور سے یہ معلوم نہ ہو کہ تاریخ سیاسی میں ان لوگوں کو کیا درجہ حاصل تھا۔

علم ادب اور تاریخ کی اضافی قیمت کچھ ہی ہو لیکن یہ دونوں آپس میں سوکنیں نہیں ہیں بلکہ بہنیں ہیں جو خیال کو رفعت دینے، چال چلن کو شریف بنانے اور دماغ کو آراستہ کرنے میں یکساں مصروف ہیں۔ تاریخ نگار یا تاریخ کا معلم واقعات کی تعدیل و جرح کے ساتھ تحقیقات کرتے ہوئے اپنا کام شروع کرتا ہے یہی سائنس ہے اور سائنس کی نہایت ہی مشکل شاخوں میں سے یہ ایک شاخ ہے۔ تحقیق شدہ واقعات کو ترتیب دینا اور پھر عام نتائج نکالنا بھی سائنس ہے۔ ان کو بہترین سلسلہ میں ترتیب دینا اور بہترین زبان میں ان کو تحریر کرنا علم ادب ہے۔ چنانچہ سائنس سے درستی اور صحت کا کام انجام پاتا ہے۔ ادبی ہنر اس کام کو تاج پہناتا اس کو آگے پھیلاتا اور مقصد کو بہتر طریقہ سے پورا کردیتا ہے۔ سب سے زیادہ بلند پایہ کی تاریخی کتاب کے لکھنے کے لئے مورخ کو چار عطایا کی ضرورت ہے۔ تحقیقات کرنے میں ان تھک محنت۔ درست تجویز (جو اشد ضروری باتوں کو گرفت میں لاسکتی ہو) قوت خیال جو واقعات ماضی کو پڑھا کرسکے اور قادر کلامی جس کو انشا کہتے ہیں۔

تاریخ کا استعمال سائنٹفک طریقہ کے ظہور نے فرانس کے انقلاب سے ملکر تاریخ کے استعمال میں

ایک نیا دور پیدا کیا۔ حکومت کرنے والا اثر قومی ہے۔ تاریخ کی روح قومی ہو گئی ہے جہاں اس نئی تبدیلی نے یہ تعلیم دی ہے کہ موجودہ حالات ماضی حالات سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اشیاء اور افادہ گاہوں میں جو ہمارے گرد و پیش موجود ہیں تبدیلیوں کا ایک تدریجی عمل ہے اور بدون علم ماضی کے ہم حال کو نہیں سمجھ سکتے فرانس کے انقلاب نے روایات کے احترام اور قوم کے گذشتہ تجارب کو بطور قیمتی ورثہ کے یقین کرنا تعلیم کیا۔ اس کے دو فعل ہیں۔ پست اقوام کے لوگوں کو یہ تحریک ہوتی ہے کہ اعلیٰ مثالوں کی پیروی کریں جوان کے مورثوں نے دکھائی تھیں اور ماضی کی شان کو از سر نو تازہ کریں۔ شائستہ اور پختہ اقوام کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ وہ روشن ماضی کو زندہ رکھیں۔ قوم کی عظمت کا سکہ بٹھائیں۔ اور دوسری زندہ اقوام پر اپنی برتری ثابت کریں اور خاص لوگوں پر اپنی حکومت کے حق بجانب ہونے کا اظہار کریں۔

یہ یورپ کی اقوام کا جتھہ ہے جو حیرت انگیز طریقہ سے کامیاب ہوا اور تاریخ اس کو ثابت کرتی ہی۔

اٹلی | یہ بات اٹلی میں پیش آئی جہاں میزینی نے ایک پیغمبر کی سی نگاہ سے بنیادی خرابی کو دیکھ لیا جو اٹلی کی مصیبت کا سبب بنی ہوئی تھی اور یورپ کی دول کا اٹلی شکار تھی۔ وہ میزینی ہی تھا جس نے تاریخ قومی مقاصد کے واسطے استعمال کی۔ اس نے روما کی سلطنت کے جاہ و جلال کو اٹھارہویں صدی کی اٹلی کی حالت سے مقابلہ کرکے دکھایا اور اٹلی والوں میں جوش کی تحریک پیدا کر دی کہ وہ اپنے ماضی اور ایسی شان کو زندہ کریں جو ابھی فراموش نہ ہوئی تھی۔ اٹلی کے حالات ماضی نثر اور نظم میں گائے گئے اُن کی تصویریں کھینچی گئیں اور مثالیں دی گئیں۔ چنانچہ گزشتہ اٹلی کا وہ قومی تکبر ہی تھا جس نے ایسی اٹلی پھر سے پیدا کی جو آج دیکھی جا رہی ہے۔

جرمنی الیسیس اور لورین | جرمنی میں یہ تاریخ ہی کا اثر تھا کہ ولیم۔ بسمارک اور مولٹکی کو تحریک ہوئی اور جرمنی میں اتحاد ہوا اور جرمنی سلطنت پیدا ہوئی۔

یہ ماضی ہی کا تکبر تھا کہ جرمنی اور فرانس کے مابین الیسیس اور لورین بنائے فساد رہا۔

یونان | یہ ماضی ہی کا تکبر تھا جو بالشت برابر یونان کو مشرق میں اسکندر اعظم کی سلطنت کا خواب دکھا سکا کوئی جماعت کبھی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ اپنی تاریخ میں اپنے ماضی کے فخر کی عزت کرکے اس کو اپنا قیمتی مشترکہ ترکہ پہلے یقین نہ کرے۔ اور یہی وہ بات ہے جو مغربی لوگ اپنے بچوں کے دلوں پر نقش کرتے اور ابتدائی مدارس میں سکھلاتے ہیں۔ کیا کوئی اٹلی کا رہنے والا ایسا ملنا ممکن ہے جو میزینی۔ گیری بالڈی یا کیگے وور کے ناموں کی پرستش نہ کرتا ہو۔ یا کوئی فرانسیسی طالب علم ایسا ہے جو نپولین کے نام پر فخر سے اکڑتا نہ ہو اور کیا کوئی انگریزی طالب علم ایسا ہی جو پم اور ہیمپڈن کے نام سے بیخبر ہو۔

اب ہم کو اپنے ہندوستانی طلباء اور نوجوانوں سے یہ سوال کرنے دو کہ آیا اُن میں سے کسی کو اپنے کسی ملک پر فخر ہے یا وہ اس کی عزت کرتا ہے یقیناً اس کا نفی میں جواب ملیگا اور ایسا جواب ضرور ملنا بھی چاہیئے۔ کیونکہ وہ تو وہی جانتے ہیں جو اُن کو سکھایا گیا ہے یا تعلیم دینے والوں نے اپنا مطلب لکھا ہے کہ وہ کیا ہوں۔

حصّہ دوم

آئیے اب اس منزل پر جہاں تک تاریخ کے تخیل کا تعلق ہے ہم اُن اسباب کو دریافت کریں جو ہندوستان میں عمل کر رہے ہیں اور عمل کر چکے ہیں کہ تمامی باقی دنیا کے مقابلہ میں ہندوستان کی یہ موجودہ حالت کیوں ہے اور جس کے جوابدہ یہ اسباب ہیں۔

ہندوستان زمانۂ قدیم اور زمانہ وسطیٰ میں

اس واقعہ کے متعلق کہ ہندوستان کا ماضی نہایت ہی شاندار اور زریں تھا کوئی دلیل لانے کی حاجت نہیں۔ یورپ پر حکومت کرنے والوں نے ہنوز قمیص پہننا بھی نہ سیکھا تھا کہ اس سے بہت زمانہ قبل ہندوستان شائستہ تھا۔ علم و فضل۔ تجارت۔ دولت اور اخلاقی قوت میں ہندوستان کا رتبہ سب سے اعلیٰ تھا۔ صدیوں تک ہندوستان پرانی دنیا کے قالب کا دل رہا ہے اور اسی نے پرانی دنیا کے خیالات کو سانچہ میں ڈھالا اور زندگی پر حکومت کی ہے۔ حضرت مسیح سے بہت قبل شام۔ بابل اور دوسری مشرقی سلطنتوں سے ہمسری کے ساتھ ہندوستان کی تجارت تھی۔ لیکن ہندوستان کی فضیلت تو اس واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ دوسرے ممالک کی تاریخ کی جستجو آثار قدیمہ کے محکمجات کر رہے ہیں جبکہ ہندوستان کی تاریخ سامنے موجود ہے۔ ہندوستان کی کشش نے باہر کی قوموں کو کھینچ لیا یعنی آریا۔ سیتھین۔ ایرانی۔ افغان اور مغل لیکن ہندوستان کی قوت جاذبہ کا یہ حال تھا کہ یہ سب کے سب اسی سرزمین کے فرزند ہو کر اسی میں آباد ہو گئے پس کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کسی سے مغلوب ہوا۔ نہیں۔ بلکہ اسی کو جس نے ہندوستان کو فتح کیا ہندوستان نے مغلوب کر لیا۔ چنانچہ یورپ والوں کے آنے سے قبل ہندوستان کا کوئی زمانہ ایسا نہ ملیگا جو اسی زمانہ کی یورپ کی تاریخ سے پیچھے رہا ہو۔

یورپ کی عظمت اور ہندوستان کی سیاسی حالت کا زمانہ

برطانیہ کی فضیلت قائم ہونے پر صورت حال میں تغیر آتا ہے اور سوا اقت ہندوستان کی جو سیاسی حالت تھی وہی صورتِ حال بدل جانے کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہ بات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انیسویں صدی میں تاریخ مثل ایک جدا مضمون کے موداً ہوئی اور قومی مقاصد کی غرض سے سائنٹیفک بنیاد پر صرف فرانس کے انقلاب کے بعد تاریخ کا مطالعہ شروع کیا گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ ہندوستانی حالت تاریخ کے اعتبار سے یہ ہو رہی تھی کہ جنگ و جدل سے

تھک کر جو لوگ زندہ بچ رہے تھے اُن کے لئے یہی ایک برکت تھی کہ "غضب" مستقل صورت اختیار کرے۔ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ یورپ کی قومیں اغیار کی حکومت سے سبکدوشی حاصل کر رہی تھیں اور خود مختاری کے اعلان ہو رہے تھے۔ اور اس کے برخلاف ہندوستان اپنے ہتھیار آخرکار ڈال رہا، اپنی خود مختاری کھو رہا اور خوشی سے اغیار کی اطاعت قبول کر رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے فرمانرواؤں کی ہندوستان پر گرفت کو اور بھی زیادہ سخت کر دیا اور اپنی مصیبت کی ماری بیکس رعایا کی طرف سے اُن کی ہمدردی کو جدا کر دیا۔ ان حالات میں ہم اپنے فرمانرواؤں سے یہ توقع نہ کر سکتے تھے کہ وہ تاریخ کے مطالعہ میں جدید مغربی طریقوں کو داخل کریں گے تاکہ ہماری قومی جوش کو تحریک ہو اور وہ بیدار رہو اور ہم لوگوں کے درمیان جو حال ہی میں مغلوب ہوئے تھے قومی تکبر پیدا ہو۔ ۱۷۹۹ء کو دیکھ لیجئے جبکہ لارڈ ویلزلی نے میسور کو فتح کیا تو اُس نے ٹیپو سلطان کی اولاد کو میسور کا کچھ بھی حصہ نہ دیا اور کہا "حکمت عملی کے زبردست ترین مقاصد کا لحاظ مانع ہے کہ ٹیپو کا خاندان بحال کیا جائے......... جب وہ ہماری عنایت سے تخت نشین کئے جائیں گے اور ہمارے دباؤ سے ان کے اختیارات محدود ہو جائیں گے تو ٹیپو کا جانشین ضرور محسوس کریگا کہ اُس کی ذلت ہوئی اور ایسی بات کوئی جوشیلا فرمانروا برداشت نہ کریگا۔ اور یہ خیال کرنا بھی معقول وجوہ پر مبنی ہے کہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا وارث اپنے باپ اور دادا کی دلیر مثال اور اُس عزت کے تصور سے جو خود مختارانہ حکومت میں حاصل تھی اور حربی شان کی عظمت کے خیال سے جوش میں بھر جائیگا اور اپنی عظیم الشان سلطنت کو حاصل کرنے کے ارادہ سے اُس ترکہ کو بھی جو اُسے دیا جائے جان بوجھ کر معرض خطر میں ڈال دیگا"۔ بس یہی خطرہ تھا کہ لارڈ ویلزلی نے میسور کے حکمران خاندان کا خاتمہ کر کے اُس کے مقابل قدیم ہندو خاندان کو بحال کر دیا۔ اس معاملہ میں کچھ انگریزوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے کہ اُنھوں نے تمامی ایسے سرچشموں کو بند کر دیا ہو جن سے قومی تکبر اور جوش کے ابھرنے کا امکان ہو۔ نپولین نے بھی یہی کیا تھا یعنی اُس نے کہا "تاریخ اگر حکومت کی ہدایت کے ماتحت نہ لکھی جائے تو وہ تعلیم کا سب سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہے۔ برخلاف اس کے ریاضی سے اندیشہ نہیں۔ طب کے بدون چارہ نہیں اور فیزیکل سائنس مفید ہے"۔ چنانچہ نپولین کا تعلیمات یونیورسٹی کا نظام العمل خاص وضع کے شہری تیار کرنے والا گویا حکومت سے تعلق رکھنے والا کام تھا جس طرح بارگوں کا انتظام یا سامان حرب کا معائنہ یا توپوں کا پڑھانا ہوا کرتا ہے۔

اینگلو انڈین مورخین کی ناقابلیت اور خصومت

ہندوستان کی اس بدنصیبی کی حالت اور فرمانرواؤں کے فطرتی میلان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تاریخ نے اینگلو انڈین مورخوں کے ہاتھوں سے بہت بڑا صدمہ اُٹھایا ہے۔ اول تو ان کو مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی ہی نہیں یا تھی تو بہت ہی کم

تھی۔ انھیں زبانوں میں ملک کا تاریخی حال محفوظ تھا۔ پس انھوں نے یورپ کے لوگوں کی تحریروں پر اعتماد کر لیا جن کے روزنامچوں کی بنیاد بازاری گپ یا عام افواہ پر تھی۔ یہ روزنامچے اس لئے قیمتی شمار کئے گئے کہ ان میں شہروں کا حال۔ دربار کے مناظر۔ دربار کے جشن۔ جلوس اور امرا کا حال جن سے ان کا واسطہ ہوا لکھے ہوئے تھے۔ دوسرے بعض کو الا ماشاء اللہ مطلوبہ واقفیت لسانی ہوئی بھی تو ان میں یہ بصیرت نہ تھی کہ ملک اور اس کے باشندوں کے خط و خال اور مخصوص خصوصیات کی نسبت صاف رائے قائم کر سکتے۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں دیکھو کہ صرف ایک صوبہ بنگال کے نظم میں انگریزوں کو کس مایوسی سے ناکامی ہوئی اور یہ متذکرہ بالا امر میں ان کی خامی کا بیّن ثبوت ہے۔ سوئم۔ باوجود اپنی خامیوں کے ان کی ذاتی خصومت تھی جس نے ان کو اجازت نہ دی کہ ایسے موقع سے جو بتیار نہ تھا محنت کر کے صداقت کے ساتھ سچائی کو ظاہر کریں۔ چنانچہ ملک اور اس کے سیاسی معاملات سے ان لوگوں کی ناما نوسی۔ مشرقی زبانوں سے ناواقفیت۔ ان کی خصومت اور سریع الاعتقادی نے ان کے واسطے یہ بات ناممکن کر دی کہ جو تھوڑا بہت انھوں نے سنا یا قدرے قلیل پڑھا تھا اس کی صحیح ترجمانی کریں۔

ایک اینگلو انڈین تین خصومتوں کے ساتھ تاریخ لکھنا شروع کرتا ہے۔

(الف) ہندو زمانہ کی کوئی تاریخ ہی نہیں اس لئے وہ فراموش کر دینے کے لائق ہے۔

(ب) رہا مسلمانوں کا عہد تو ایلیٹ صاحب کے الفاظ میں اس کا یہ حال ہے کہ "مسلمانوں کے عہد کو یقینی اس لئے ضرور مطالعہ کرنا چاہیے کہ اس سے ہماری ہندوستانی رعایا کو اس بات کا احساس پیدا ہوگا کہ ہماری نرمی اور انصاف سے اس کو کیا کیا فوائد حاصل ہو رہے ہیں"

(ج) یہ کہ ہندوستان کی اصل تاریخ ۱۷۵۷ء سے جبکہ کلائیو نے انگریزی سلطنت کی ہندوستان میں بنیاد ڈالی اور مغربی شائستگی کا تاریکی کو دور کر کے اور جاہلوں پر روشنی پھیلا کر راستہ کھولا شروع ہوتی ہے چنانچہ ۱۷۵۷ء کے معرکہ پلاسی سے قبل کی تین یا چار ہزار برس کے ہندو عہد۔ اور مسلمانوں کی فرمانروائی کے تمامی زمانہ کو یہ اینگلو انڈین تاریخ نگار اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ جنگ پلاسی کا گویا افتتاحی باب تھا۔

چنانچہ ان خصومتوں نے ہندوستانیوں کے دلوں پر نہایت ہی کامل اور پوری کامیابی کے ساتھ اثر کیا ہے اور اب ان کا وہی عقیدہ ہے وہی تبقن ہے اور وہی خیال کرنے کی روش ہے لیکن یہ سطحی جعل اگرچہ عام طور سے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کر چکا ہے لیکن ان جعلوں کی حقیقت پر ذرا سا غور کرنے سے ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے زمانۂ حال کا مفہوم ملحوظ رکھتے ہوئے ہندو عہد کی واقعی کوئی تاریخ نہیں ہے یعنی وہ سائنٹیفک طرز پر

نہ لکھی گئی ہے نہ ایک فن کی طرح اُس کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کے یہ معنی لینا کہ ہندوؤں کے یہاں تحریری حالات اور تاریخی نوشتے سرے سے ہیں ہی نہیں محض حماقت ہے۔ شاستروں میں ایسے مطالعہ کے لئے ہمارے سامنے برابر مواد موجود ہے اور اب شاستروں کی تحقیق اسی سرگرمی سے ہو رہی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

رہا بارہویں۔ پندرہویں اور سترہویں صدی کا ہندوستان کا اسلامی عہد حکومت تو اُس کو یورپ کی بیسویں صدی سے مقابلہ کرنا اور اُن مطامح نظر کا تلاش کرنا جو زمانہ وسطیٰ میں یورپ میں بھی سُنے نہیں گئے ہیں سراسر بغض و عداوت ہے۔ مسلمانوں کے کسی زمانہ کے تاریخی حال کو لیجئے اور اسی زمانہ کے انگریزی تاریخی حال سے مقابلہ کیجئے تو اسلامی عہد انگریزی عہد سے کبھی پیچھے نہ ملے گا۔ مثلاً افغانوں کا زمانہ لیجئے کہ وہ فوجی قسم کا قبضہ تھا۔ لیکن یورپ کے اُس زمانہ سے جبکہ نوابیاں قائم تھیں اور جاگیردارانہ حکومت تھی یہ افغانوں کی حکومت کا زمانہ بہت ہی افضل تھا۔ مغلوں کا عہد حکومت جبکہ یورپ جغرافیائی اقوام میں تقسیم تھا کیا باعتبار طرز حکومت۔ یا ترتیب و نظم و شائستگی۔ علوم و فنون۔ دولت اور عام مرفہ الحالی کے یورپ سے اعلیٰ و ارفع تھا۔ اس زمانہ میں فرانس۔ انگلستان۔ جرمنی اور اسپین کے رسوماتی اور دینی مخالفت و مذہبی عقائد کی وجہ سے لوگوں پر عذاب نے ٹکڑے اُڑا رکھے تھے جبکہ ہندوستان میں اکبر کی مذہبی رواداری اور مختلف الاقوام رعایا میں قومی اتحاد و یگانگت کے وعظ ہو رہے تھے۔

قومیں ہوں یا سلطنتیں سب کے قدرتی عروج و زوال ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ سلطنت مغلیہ اپنی قدرتی رفعت پر پہونچکر آخر کار ایک پُرانے درخت کی طرح خشک ہوگئی۔ پھر اُس کی ایک ایک شاخ گری اور سایہ دینا یا حفاظت کرنا اس نے موقوف کر دیا اور یہی دو چیزیں اس کے قیام و بقا کا ذریعہ تھیں۔ اس کے بعد ملک میں طوفان بے تمیزی شروع ہوا۔ چھوٹی چھوٹی خود مختار بادشاہتیں اور ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان کے باہم رقابتیں اور اندرونی لڑائیاں ہوئیں اور ایسے حال میں جو جو مصائب و نبالہ کی طرح موجود ہوتی ہیں آموجود ہوئیں۔ لیکن اس طوفان بے تمیزی کے درمیان قاعدۂ قدرت کے موافق آخر ایک زبردست حکومت پیدا ہو جاتی۔ مگر یوروپین عنصر کے عروج اور آخر میں انگریزوں کے غلبہ نے ایک زبردست حکومت کو پیدا نہ ہونے دیا جو ملک کی طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیتی۔ ریمزے میور کے الفاظ یہ ہیں "نئے فاتحین (انگریز) بجائے اس کے کہ طوائف الملوکی کے عذاب کو ختم کرتے بنگال میں خود ایسا بدترین عذاب ثابت ہوئے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ویسا عذاب بنگال پر کبھی نازل نہ ہوا تھا۔"

چنانچہ ترقی کا راستہ بند ہو گیا۔ تنزل شروع ہوا اور بڑی حد تک وہ حالت ہوگئی جیسے پانی رُک کر گندہ ہو جاتا ہے۔ فرمانرواؤں اُن کے سیاست دانوں اور مدبرین نے فطرتی بالیدگی اور نشو و نما کو روک دیا اور

ان کے تاریخ نگاروں نے جتھہ بندی کر کے اپنی قوم کے ہندوستانی قبضہ کو حق بجانب ثابت کیا اور برطانیہ کی ہند پر حکومت کو راستبازانہ فعل بتایا۔ قدیم اور زمانہ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کو بھونڈے سے بھونڈے رنگ میں دکھایا اور اب جو ہندوستان کی موجودہ حالت ہے وہ قومی نا قابلیت اور ماتحتی کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ آج ہندوستان اور یورپ میں کچھ نسبت ہی نہیں ہے۔ انگریز کا بچہ جب مدرسہ میں بٹھایا جاتا ہے تو اُس کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ وہ آزاد قوم سے ہے اس کو علم ادب سے متعلق ایسی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں کہ آزادی کا خیال خود بخود اس کو فطرت کا ایک قانون معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو آرتھر۔ الیفریڈ۔ ولیم اول۔ ہنری ثانی۔ ہنری ہفتم۔ کرامویل۔ ولیم خاموش کے حالات اس طرح پڑھتا ہے کہ یہ سب اس کو قومی سورما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وہ نہایت شوق اور دلچسپی سے امریکا کی جنگ خودمختاری جان ولکین کی لڑائی اور چارلس بریڈلا کے حالات پڑھتا ہے۔ اس کے سوا وہ یہ بھی سیکھتا ہے کہ اٹلی کے لال کرتی والے باغی کا لندن نے کس طرح خیر مقدم کیا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ انگلستان کا پوت ہے اور اُس کو اپنی ماں انگلستان سے الفت کرنی چاہئے اُس کی خدمت کرنی چاہئے اور جیئے تو اسی کی خاطر جیئے اور مرے تو اسی کے لئے مرے۔

لیکن ہندوستانی بچہ جب ہندوستانی مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو اُس کو پڑھایا جاتا ہے کہ ہندو تو جاتی بندھن سے جکڑے ہوئے ہیں اُن کو بھلا فوجی کام اور بہادری سے کیا واسطہ۔ مسلمان مذہبی جوش کے دیوانے اور بنی نوع انسان میں ایسی وبا اور بلا ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مسلمان فرمانروا متعصب ظالم۔ اور خونخوار دل اپنے سینوں میں رکھتے تھے۔ سیواجی اور مرہٹے بے حیا ڈاکو بدمعاش اور سفاک تھے۔ حیدر علی اور رنجیت سنگھ خون آشام قسمت آزما تھے۔ باجی راؤ دوم (مرہٹہ پیشوا) حلف دروغ بدکار بزدل تھا۔ اور ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ہر ایک ہندو اور مسلمان قابل نفرت بدبخت۔ بدذات اور شریر تھا۔

اس تعلیم کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے اُس کو تلاش کرنے کے لئے دور جانے کی حاجت نہیں ہے۔ یعنی ایک انگریز اپنی قوت پر بشاش۔ اپنے ملک پر متکبر۔ ایک بیدار حوصلہ مندی کے ساتھ دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے خلاف ہندوستانی شخص کا یہ حال ہے کہ اُسے اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہوتا اور ہر ایک چیز کو جو ہندوستان سے منسوب ہوتی ہے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی واقعہ نے روشن خیال ہندوستانیوں کو یقین دلا دیا ہے کہ ہندوستان پر صرف سیاسی اعتبار سے ہی حکومت نہیں کی جا رہی ہے بلکہ ہندوستانیوں کی روح اور جوش اور اُمنگ پر بھی حکومت ہو رہی ہے۔ اور اسی موجودہ احساس کے سبب سے اس وقت مغربی طرق اور اصول کے خلاف رجعت یا مخالفت پیدا ہو گئی ہے۔

حصّہ سوم

(ملک میں سیاسی بیداری اور تاریخی نگاہ میں تبدیلی) (ہندوستانی تاریخ کے از سر نو لکھنے کی ضرورت)

مغربی تعلیم کے پھیلنے۔ قومی ذلت کے احساس اور سیاسی غلامی کا نتیجہ زمانۂ حال کی قومی حرکت ہے اور اب اس نے زاویۂ نظر میں ایک تبدیلی بھی پیدا کر دی ہے اور سنجیدہ خیال ہندوستانی کو یہ ضرورت واقعی طور سے معلوم ہونے لگی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ صحیح اساس پر پڑھائی جائے۔ اور تمامی ہندوستانی تاریخ زمانۂ حال کے نئے سائنٹیفک اصول پر ضرورت وقت کے مناسب حال لکھی جانی چاہیے۔ کلکتہ یونیورسٹی اور بنگال کے عالموں نے اس معاملہ کی طرف پہلے رہنمائی کا قدم بڑھایا ہے۔ ان کی کوشش ہندو عہد کو نئی زندگی دینے کی طرف تمام تر مصروف ہے اور واقعی یہ لوگ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

لیکن باوجود اس مبارک آثار اور نیک آغاز کے ان لکھنے والوں کا میلان بہت زیادہ ممد نہیں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرکت غلط سمت میں اختیار کی گئی ہے یعنی اس زمانہ کے تاریخ نگاروں کا جوش قومی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص جماعت سے ہے یعنی جس طرح اینگلو انڈین ہندوستان کی تاریخ لکھتے ہوئے یہ نگاہ رکھتا ہے کہ ۱۷۵۷ء اور انگریزوں کی فضیلت قائم ہونے سے قبل کل ہندوستانی تاریخ ایک دیباچہ اور تمہید تھی اسی طرح ہندو تاریخ نگار کا حال ہے کہ وہ ہندو عہد کو ہندوستان کی تاریخ کا دل اور روح یقین کر رہا ہے اور مسلمانوں کے عہد کو خالی اور کورا سمجھتا ہے۔ لیکن قدرت میں خلا محال ہے اس لئے خلا کو اسلام کی سات صدیوں کی حکومت نے بھر دیا ہے۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے یقیناً کسی قدر خدمت انجام دی ہے کہ اسلام کی تاریخ لکھنے میں اس نے بڑی محنت سے اورنگ زیب پر اپنی کتاب لکھی۔ لیکن پروفیسر جادو ناتھ سرکار کی یہ کتاب جب ایک غیر جانبدار پڑھتا ہے تو اس کو حیرت اور تاسف ہوتا ہے کہ قومی تعصب سے جو انصاف پر غالب ہو جایا کرتا ہے اور فراہم کردہ مواد سے صحیح نتائج اخذ نہیں کرتا یہ کتاب بھی پاک نہیں۔ انیسویں صدی کی انگریزی تعلیم کا یہ صرف نتیجہ ہے۔ تاہم اس کتاب کی اہمیت فراموش کرنے کے لائق نہیں ہے۔ پروفیسر مذکور کی تحقیقات نہایت قیمتی ہے اور دوسرا غیر جانبدار آزاد خیال تاریخ نگار اس تحقیقات کو بہتر مقاصد میں استعمال کر سکتا ہے۔

۱۹۱۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں مغلیہ عہد کی تاریخ از سر نو لکھنے کا ارادہ کیا گیا لیکن پروفیسر رشن بروک ولیمس اپنے پانچ سال کے قیام میں بابر پر صرف ایک چھوٹی کتاب لکھ سکے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کام سے دست برداری کر لی گئی اور پروفیسر موصوف کے جانشین ڈاکٹر شفاعت احمد خاں برٹش عہد کی طرف مائل ہو گئے۔

حقیقت میں اسلامی عہد کے متعلق صرف ایک کتاب ہے جو عام سطح سے بلند ہے اور وہ پروفیسر بینی پرشاد کی

شاندار کتاب عہد جہانگیر پر ہے۔ اس کتاب کی بنیاد اصل ذریعوں کے کامل علم پر ہے اور اضافی تاریخ کا وہ ٹھوس مطالعہ ہے اور سب سے بڑھکر یہ ہے کہ وہ غیر جانبداری سے لکھی گئی ہے اور وہ مذہبی اور قومی تعصب سے آزاد ہے جس کی وجہ سے آج کل کے بڑے عالموں کی کتابوں کی قدر گھٹ گئی ہے۔ یہ کتاب ان سب لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے جن کو ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی ہے اور ان سب کے واسطے جو تاریخ لکھنا چاہتے ہیں نمونہ ہے پروفیسر بینی پرشاد نے صرف ایک بڑی خدمت ہی انجام نہیں دی ہے بلکہ اپنے ملک کے مسلمانوں پر احسان کیا ہے کہ عمومیت کے ساتھ مغلیہ فرمانروائی کی سچی تصویر دکھادی ہے اور خاص کر نہایت تاریک اور افسانہ نما مغل اعظم کے سلسلہ کی پوری وضاحت و تفصیل کردی ہے۔

زاویۂ نظر میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کو یکجا اور مجموعی طور سے سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا گیا ہے چنانچہ زمانہ حال کے مورخین کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مساعی ایک ہی مشترکہ مقصد کیطرف رہنمائی نہیں کرتیں۔ ہندو مورخین جن کے لئے ہر طرح سے آسانیاں موجود ہیں اعلیٰ تعلیم اور تعداد کی افزونی کے فوائد بھی ان کو حاصل ہیں جماعتی خصومتوں کی سطح سے اوپر نہیں ابھرے ہیں۔ اور دانستہ یا نادانستہ ان کی حالت بھی جہاں تک اسلامی عہد سے تعلق ہے اینگلو انڈین جیسے تاریخ نگاروں کی ہورہی ہے۔ سنت نہال سنگھ جیسی تعلیم اور شائستگی کا شخص جو تاریخ نگاری کی تنخواہ بھی پارہا ہے موجودہ حیدرآباد کی تاریخ لکھنے میں ذلیل چھوٹی چھوٹی خصومتوں کے اظہار سے باز نہ رہ سکا۔ اب دوسری طرف دیکھئے تو اینگلو انڈین تاریخ نگار بھی تبدیلی کے گرفت کرنے میں سست نہیں ہیں اور انھوں نے بھی موجودہ روش پر انگریزی زمانہ کی تاریخ لکھنی شروع کردی ہے یعنی اگر انیسویں صدی کے مورخین نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی ترنگوں کی پردہ پوشی اور ان کے جرائم کی مذمومیت گھٹانے اور انگریزی حکومت کی ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود ہندوستانیوں کے دلوں پر یہ بات نقش کرنے کو کہ مسلمانوں کے مذہبی جوش سے دیوانے بدنظم عہد حکومت کے مقابلہ میں انگریزی راج اندازہ سے زیادہ بابرکت ہے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کے واسطے اپنے قلم کو آلودہ کرکے ہندوستانی تاریخ کو تاریک ترین رنگ سے اور نیز غیر صحیح پرداز پر لکھا تو اس بیسویں صدی کے لکھنے والے یہ دیکھکر کہ یہ رنگ تو اتر چلا اور ایسے واقعات اب ناقابل قبول ہیں اور نہ اب اسلامی عہد سے مقابلہ کرکے دکھانے کی ضرورت ہی باقی ہے اپنے انداز تحریر کو بدل کر اپنے عزم و ہمت کو اس بات کے اظہار پر صرف کررہے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی برکات طشت از بام کی جائیں اور ان کا پیرایہ بیان حسب ذیل ہے .... [۱۵]

پروفیسر ریمزے میور کی ——— [۱۶] انگریزی عہد کی تبدیلی پر ایک سچی شرح ہے۔ اسمتھ صاحب کی

---

[۱۵] پروفیسر ابن حسن صاحب نے اس کے آگے خالی جگہ چھوڑدی ہے اور "حسب ذیل" کو نہیں لکھا ہے۔ معین الدین

[۱۶] اصل میں جگہ خالی ہے۔ معین الدین

اکسفورڈ تاریخ ہند جو ایک انگلو انڈین کی لکھی ہوئی سب سے پچھلی تاریخ ہے دو رایوں یا طرزوں کے درمیان ایک مصالحت ہے۔ ایک طرف تو اسمتھ صاحب ہندوستانی فرمانرواؤں اور دیسی طاقتوں کے اختیارات کلی حاصل کرنے یا قوت میں توازن قائم کرنے کی مساعی کو جبریہ خراج ستانی سے بہتر نہیں خیال کرتے اور دوسری طرف دیسی ریاستوں کے درمیان انگریزوں کی سازش کی ہر ایک مثال کو کارشجاعت بیان فرماتے ہیں۔ مثلاً کلایو کی جعلی دستاویز اور استحصال بالجبر کی اس خوبصورتی سے تاویل فرمائی گئی ہے "وہ زمانہ ہی سخت گیری کا تھا اور ایسے زمانہ میں انگریزوں کی بھی یہ ایک خامی تھی۔" "اور یہ ناگزیر تھی کیونکہ ہندوستانیوں کے درمیان ایسی خرابی عام تھی"۔ اسی طرح دوسرے فقرے ملاحظہ طلب ہیں۔ "ایسے نازک موقعہ پر یہ بات اشد ضروری تھی" "موقع اور وقت کے لحاظ سے سخت اور اشد ضروری تھی"۔ "اعلیٰ سیاسی اصول کا لحاظ کرتے ہوئے"۔ اور جہاں پر غاصبانہ حکمت عملی یا الحاق کا ذکر ہے وہاں مدافعت اور لیپ پوت کی غرض سے "کرور ہا بیکس مظلوم دیہاتیوں کی نزاعی تکلیف کا مذکور کیا گیا ہے۔ ۱۷۵۷ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کا جو کوئی بھی ہندوستانی ہے، بس وہ بدذات کمینہ اور بدمعاش ہے۔ لیکن ہر ایک ایرا۔غیرا۔کلو۔نتھو جس کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات سے تعلق ہے بس وہی "مرد اشراف حکومت کرنے کی صفات سے متصف شریف الخیال اور شائستہ ہے"۔ مختصر آنکہ انگریزی راج کی برکات کو دل پر نقش کرنے کی غرض سے بڑی شرح وبسط سے کام لیا گیا ہے۔ حال کی تاریخی کتب انڈر گریجویٹ طلبا کے درس میں اس غرض سے داخل کی گئی ہیں کہ طلبا ان کو ازبر کریں اور واقعات کے متعلق ایسی مینا کاری اور دستکاری سے کام کیا گیا ہے کہ سطحی نظر سے پڑھنے والا بھی گورے چمڑے والوں کی ذمہ داریوں اور ہندوستان پر انگریزی شاہنشاہی کے حق بجانب ہونے کی منطق کا قائل ہو جائے

مسلمانوں کا عہد ہند وار انگریزی عہد کا بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ یا تو اُسے پردہ فراموشی میں ڈالا ہے یا کچھ کا کچھ دکھایا ہے۔ اُس کے مداحین نے اب تک کوئی سعی نہ کی کہ اُس کو اُس کی صحیح سطح پر لائیں یا اُس کا وہ درجہ قائم کریں جس کا وہ مستحق ہے یا اُس کی حقیقی جگہ ہے۔ اس کی علت تعلیم یافتہ مسلمانوں کی عدم توجہی۔غیر دلچسپی۔انگریزی تعلیم اور اکسفورڈ اور کیمبرج کی تربیت ہے جس کی بدولت ہر شے کی بابت جو انگریزی نہ ہو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شے فراموش کردینے اور نفرت کرنے کے قابل ہے۔ یہ انیسویں صدی کی پیداوار ہے اور اب تک اکسفورڈ اور کیمبرج کے مسلمانوں ڈگری یافتوں نے اس کو گرد کی طرح اپنے دامن سے نہیں جھٹکا ہے اور ان کی تاریخ کی بے سروسامانی کی۔ اُن کی بے پروائی۔ عدم توجہ۔ لحاظ نہ کرنا اور اپنے عزیز ورثہ کی بے عزتی خاصکر جوابدہ ہیں۔ چنانچہ عمیق الخیال عالموں نے اس تاریخ جیسے مضمون کو محنت اور التفات کے قابل اب تک خیال نہیں کیا ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا شخص جس کے پاس ان جیسی آبدار ڈگریاں یا ان کی طرح مخصوص آسانیاں نہیں۔ محنت بھی کرے تو اُس کی محنت اس میدان میں ان کی سی وقعت نہیں رکھتی۔ پس نتیجہ یہی نکلا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے رفتہ رفتہ تاریخ کو نظر انداز کردینے

میں کامیابی حاصل کرلی۔ ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ زمانۂ وسطیٰ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے نصاب میں لازمی مضمون کی طرح داخل تھی۔ لیکن اب نصاب تعلیم سے وہ موقوف کردی گئی اور اس کی جگہ یورپ کی تاریخ زمانۂ حال نے لے لی۔ اور بی اے میں اکبر پر ایک پرچہ بطور اختیاری مضمون کے باقی رکھا گیا ہے۔

خصوصاً اینگلو انڈین مورخین کی چھٹے بندی اور مسلمان عالموں اور ماہرین تعلیم کی بے پروائی کے ساتھ ساتھ ایک نہایت قوی وجہ مسلمانوں کے عہد سے ناانصافی کی جوابدہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ تین جدا اور مختلف زمانوں پر تقسیم کرکے نہایت بدنصیب غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ کسی ملک کی تاریخ کو مختلف زمانوں پر منقسم کرنا اور ہر ایک زمانہ کو دوسرے سے جدا بحث میں لانا قطعی حماقت اور بے معنی پن ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے تین زمانے کوئی ایسے مستحکم کمرے جن میں ہوا نفوذ نہ کرسکے نہیں ہوسکتے کہ ایک زمانہ کا دوسرے سے رشتہ یا تعلق ہی نہ ہو تاریخ کا تسلسل تو اس کا متقاضی ہے کہ یکجائی مضمون کا ایک سلسلہ کے ساتھ متصل مطالعہ کیا جائے۔ کوئی ایک حصہ ایسا مکمل ہو ہی نہیں سکتا کہ دوسرے سے اس کا لگاؤ نہ ہو۔ ہندوستان کے لوگوں کے خط وخال۔ جغرافیائی اثرات تینوں زمانوں پر یکساں عمل کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے اطوار، رسوم سیاسی افادہ گاہوں نے زمانۂ وسطیٰ میں نئے آنیوالوں پر اپنا اثر کیا اور پھر ان نئے آنے والوں نے ملک کے باشندوں پر اپنا اثر ڈالا۔ ان کے باہمی اختلاط، آپس میں شادی بیاہ اور سیاسی ومعاشرتی تعلقات نے ایسی نئی وضع کے ہندوستانی پیدا کئے جو زمانہ حال کے ہندوستانیوں سے بہت زیادہ مغائر نہیں ہیں۔ اسلامی عہد کا اثر۔ ملک کی جماعت پر مسلمانوں کا دباؤ اور اسلامی عہد کا مذہب اور روایتیں ایسی عمیق ہیں کہ اب تک ان کا اثر دور نہیں ہوا ہے اور نہ زمانہ آیندہ میں اس کو میٹ دینا ممکن ہے مسلمانوں نے ملک کو ایک نئی وضع میں ڈھال دیا اور جماعت افادہ گاہوں اور آئین حکومت جو آج ہم کو ملتا ہے اسی زمانہ کا متروکہ ہے۔ ہندو عہد نے مسلمانوں کی رہنمائی کی اور اسلامی عہد انگریزوں کے لئے محفوظ رہنمائی تھی اور چلی آرہی ہے جس معیار سے مغل رعایا سے آمیز ہوئے اور سرانجام امور سلطنت میں جس قدر مغلوں نے رعایا کو شریک کیا وہ معیار انگریزوں کو ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اگر انگریزوں کو اس معیار تک پہنچنے میں شک ہو۔ ہندوستان میں مغل اجنبیوں کی طرح آئے اور فاتحین کی حیثیت سے ہندوستان میں بسے اور رفتہ رفتہ خود اسی ملک کے فرزند ہو گئے لیکن اس کے خلاف انگریز ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے آئے غاصبوں کی طرح ملک پر تحکم کیا اور اجنبیوں کے مانند تحکم کررہے ہیں۔

پس جب تک ہندوستان کی تاریخ کا بہ حیثیت مجموعی مطالعہ نہ کیا جائے گا اور عمومیت کے ساتھ ہندوستانی یہ نہ سیکھ جائیں گے کہ یہ مجموعہ ان کا مشترکہ قیمتی متروکہ ہے اس وقت تک صرف تاریخ ہی کو بلند کرنے نہیں بلکہ ملک

کو رفعت اور قوم کو سربلند کرنے کی تمامی مساعی بیکار ہیں۔ مشترکہ بنیاد یہی ہے جس پر مختلف نسلوں سے بنے ہوئے لوگ ملکر مضبوط قوم بنا سکتے ہیں کہ وہ ماضی کو اپنا مشترکہ ورثہ خیال کر کے ایک متحدہ مقصد کے واسطے موجودہ حالات کو ترقی دینے کے لئے ملکر کام کریں۔ چنانچہ ہندوستان کی تاریخ کے زمانوں کو پہلو بہ پہلو رکھکر مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہر زمانہ کی بجائے خود ایک اہمیت ہے۔ زمانہ موجودہ کی ترقی یافتہ قوموں کی تاریخ کی سطح کے برابر لانے کو ہندوستان کے سب سے زیادہ شاندار لیکن سب سے زیادہ فراموش کئے ہوئے تاریخی حصہ کو روشنی میں لانا چاہیئے۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تاریخ کے مطالعہ کو ایک قومی کام خیال نہ کیا جائے۔ اور اس کو موجودہ طرز پر نہ لکھا جائے۔ اور اس کی بنیاد سچے معاصر ذریعوں پر ہو جو فارسی زبان میں کثرت سے موجود ہیں۔ گہرا ایماندارانہ مطالعہ اور سب سے صحیح ترجمانی اس دھوکے اور غلط خیالی کو جو عام طور سے قصداً تاریخ سے متعلق پھیلائی گئی ہے بہ آسانی دور کر دیگی۔ تاریخ نگار کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ زمانہ موجود پر اس طرح کام کرتا ہے کہ اس کا ہاتھ تو زمانہ ماضی پر ہوتا ہے اور نگاہ مستقبل پر جمی ہوتی ہے۔ تاریخ کی عدالت میں تاریخ نگار کی حیثیت اجلاس کے جوری کی طرح ہوتی ہے۔ زمانہ حال کے لوگ کٹگڑے میں کھڑے ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو بعد کو آتے ہیں جج بن کر فیصلہ دیتے ہیں، رحم۔ صداقت اور انصاف کا یکساں یہی تقاضا ہے کہ اس بات پر فتوے نہ دیا جائے کہ ہندو، مسلمان اور انگریزی عہد میں کیا بات تکمیل کو پہنچائی گئی۔ بلکہ تجویز اس بات پر دینی چاہیئے کہ تمامی عہد میں جو کچھ کیا گیا ملک کے واسطے اس کی قطعی قیمت جس کا صدیوں کی کوشش اور ناکامی نے انکشاف کیا ہو، کیا ہے؟

باب سوم

اسلامی حکومت کے متعلق غلط خیالیاں

باب ہائے ماسبق میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ تاریخ نگاری بجائے خود ایک ایسا فن ہے جس میں ٹھوس واقعات اور صحیح مواد پر جو تاریخ نگار کے سامنے ہوتا ہے تاریخ نگار اپنے خاص مقصد کے واسطے اپنے ہنر اور ذکاوت کا اظہار کرتا ہے۔ جو کتاب وہ لکھتا ہے ایک بڑی حد تک غلط راستہ بتانے والی ہوتی ہے اور ایک غیر طرفدار مطالعہ کرنے والا مختلف مصنفین کی تاریخوں کے اضافی مطالعہ سے گھبرا جاتا ہے۔ تاریخ کا استعمال قومی کام ہو گیا ہے۔ اور تاریخ مورخ کے جذبات و تعصبات سے رنگ آمیزی کی بگڑی ہوئی تصویر بن گئی ہے۔ صحت نگاری، بے تکلفی اور ایماندارانہ ترجمانی جس سے مشرقی اور مغربی قدیم اور زمانہ وسطیٰ کی تاریخ پہچانی جاتی ہے اب معدوم ہے۔ فرقہ بندی۔ جماعتی۔ مذہبی اور قومی خصوصیتیں اس حد کو پہنچ گئی ہیں کہ زمانہ حال کے روزانہ اخباروں میں بھی ایسے

واقعات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش آتے رہتے ہیں درستی اور صحت کے ساتھ نہیں لکھے جاتے موجودہ زمانہ کی نوعی حکومتوں میں مطیع ذلیل ہو کر فرقہ بندی کی کل بن گیا ہے!، اور یہ متعدی مرض ایسے ممالک میں بھی جا پہنچا ہے جنھوں نے خوش نصیبی یا بدنصیبی سے موجودہ اوعائی تہذیب کا معیار حاصل نہیں کیا ہے۔ اور یہ بات ہماری روز مرہ کی زندگی میں اب اس قدر عام ہو گئی ہے کہ ثبوت یا مثال کی حاجت نہیں۔

زمانہ حال کے تخیل نے جو تاریخ کے استعمال کے متعلق قائم ہو گیا ہے۔ شوم میلان اور گم کردہ راہ عزم و ہمت نے بڑی کامیابی سے اپنا کام ہندوستان میں کیا ہے۔ اور جیسا اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے ہندوستان کی تاریخ جس طرح آج بھی جا رہی ہے یہ اُنیسویں صدی کے انگریز مدبرین و مورخین کی جتھے بندی کا ثمر ہے۔ اسلامی عہد کے یہ جانشین ہیں اور انھوں نے ہر ایک اسلامی چیز کے خلاف جو ہندوستان میں ہے بے رحمانہ حملوں اور سفاکانہ ترنگوں سے کام لیا ہے۔

چونکہ زمانہ حال کا ہر ایک تاریخ نگار اصل واقعات اور اصول کی تشریح کرنے کو قلم ہاتھ میں نہیں اٹھاتا بلکہ اپنا مدعا حاصل کرنا اور تاریخ کے ذریعہ سے اپنی رسالت وسیع کرنا چاہتا ہے لہذا مناسب یہی ہے کہ ان لوگوں کے مدعا کا صحیح اندازہ کر لیا جائے جو ایسی تاریخ لکھتے ہیں کہ وہ نہ تو تخیل کے اعتبار سے ہندوستانی ہی ہوتی ہے نہ تمامی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے لفظ تاریخ کا اس پر اطلاق ہی ہوتا ہے۔ اس مدعا سے ہم ایلیٹ اور ڈاؤسن سے جن کی تاریخ اسلامی عہد سے متعلق انجیل مقدس کا درجہ رکھنے والی خیال کی جاتی ہے چند اقتباس ذیل میں دیتے ہیں۔

"اگر ڈایونی سیس کا یہ مصنوعی مقولہ صحیح مانا جائے کہ" تاریخ ایک فلسفہ ہے جو نظائر کے ذریعہ سے تعلیم دیتی ہے" تو سرے سے ہندوستان کی تاریخ کا وجود ہی نہیں ہے۔ ایسے بلند معیار کو کوئی نہ پہنچا۔ ایسی نظیروں اور نہایت بھونڈی نظیروں کا ہمارے پاس ایک ذخیرہ بھرا پڑا ہے۔ رہا فلسفہ جو ایسے نتیجے نکالے کہ ماضی کے تجربوں اور سبقوں سے ہم کو فائدہ ہو اور آیندہ کے واسطے عاقلانہ مشورہ ملے تو ہم کسی نشان یا علامت پانے میں رائگاں کوشش کرتے ہیں .... ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جو اپنی جھلکتی ہوئی سطح سے ہم کو نیچے جانے کے لایق بنائے اور ہم خودسر فرمانروائی اور سخت اور شدید قوانین کے عمل کا مشاہدہ کریں اور قوم کے بڑے گروہ پر ان ضرر رساں اثرات اور افعال کو دیکھیں۔" "لیکن اگر ہم اپنی نگاہ ہندوستان کی موجودہ ریاستوں کی طرف پھیریں اور رئیسوں کے چال چلن کا جائزہ لیں اور ان کے زیر حکومت رعایا کا حال دیکھیں تو ہم زمانہ قدیم کی اور موجودہ حالت کو اس طرح متوازی پاتے ہیں کہ حالات اور تعلقات میں فرق ہی پیدا نہ ہوا حتیٰ کہ ہم اپنے خلق کئے ہوئے فرمانرواؤں کو دیکھتے ہیں کہ "یا، اور عیاشی میں غرق ہیں۔ چنانچہ ایسے رئیسوں کے ماتحت ہمیں کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ عدل و انصاف کے چشمے گندے اور گدلے ہو رہے ہیں اور بددن

جور وظلم اور رعایا کی عزت خراب کئے ہوئے کبھی محاصل وصول نہیں کئے جاتے۔ اُدھر ان رئیسوں کے عمّال کا یہ حال ہے کہ رعایا کو امن دینا تو کجا یہ خود ہی خاص ڈاکو اور غاصب ہیں اور بیچارے غریبوں کی داد فریاد کا سننے والا اور ظالم کے ظلم سے پناہ دینے والا کوئی نہیں۔"

یہ حال تھا اس خصومت وتعصب کا جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر اوپر بیان ہوا اور یہ وہ مورخ ہے جو اسلامی عہد کی تاریخ نگاری پر نہایت مستند مانا جاتا ہے۔ دیسی فرمانروائیوں کا اس طرح حوالہ دینا نہایت ہی بیجا ہے جیسا مصنف کو خود ہی تسلیم ہے ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں انھیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا تصور بندھ رہا ہے جن کو انگریزوں نے اپنے رحم وعنایت سے خلق کیا ہے۔ یہ بیان اگر سچا ہو تو انگریزوں کی فضیلت اور اعلیٰ حکومت پر یہی سب سے بڑا ما خوذی کا دعویٰ ہے۔ لیکن باوجود ان ریاستوں کے ذاتی عیوب کے اس مورخ کو ذرا ملاحظہ تو فرمائیے کہ تمامی اپنی واقفیت کے ہوتے ہوئے وہ کس اہتمام کے ساتھ انگریزوں کے اس اثر کو اپنے حافظہ سے محو کر دیتا ہے جو خود اس کے زمانہ میں انگریزوں کو ان ریاستوں پر حاصل تھا اور ایسے اثر کی موجودگی میں ان ریاستوں کے درمیان ایسے ایسے مظالم برابر ہوتے رہے جن کو یہ مصنف گنا تا ہے نہیں واقعہ یہ ہے کہ جب ہی کسی ریاست نے اندرونی اصلاح یا ترتیب ونظام کی کوشش کی تب ہی وہ شاہنشاہی اقتدار کے خلاف اعلیٰ درجہ کی نمک حرامی خیال کی گئی اور فوراً اس کوشش کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ایک ایسی اصلاح کا یہ مطلب لیا گیا کہ اس سے وہ شکنجہ ڈھیلا ہو جائیگا جس نے اس بدنصیب ریاست کو گھر رکھا تھا۔ جب وہ زمانہ ہو چکا شکنجہ ڈھیلا ہوا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیسی ریاستیں کسی طریقہ سے انگریزی راج سے کمتر نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف وہ شخص جو موجودہ برٹش ہندوستان کی بے چینی اور اس بےچینی کی وجہ سے پیدا ہونیوالے ہنگاموں اور ان ہنگاموں کے فرو کئے جانے کو جانتا ہے بلاخوف تردید کہہ سکتا ہے کہ اول درجہ کی دیسی فرمانروائیاں حیدرآباد میسور۔ بڑودہ لے لیجئے اور دیکھئے کہ وہاں کی رعایا زیادہ رضامند، آسودہ اور مرفہ الحال ہے اور اس کو برٹش ہندوستان کی دیسی رعایا کے مقابلے میں زیادہ چین اور زیادہ امن حاصل ہے۔

اپنی خصومتوں کو آب وتاب کے ساتھ بیان کر چکنے کے بعد یہ مورخ اپنے مقاصد کی شرح کرتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی نہایت محنت طلب تاریخ نگاری کا کام اس نے اپنے ذمہ کیوں لیا ہے۔ کہتا ہے:-

اول۔ ایلیٹ صاحب کے الفاظ میں تو تاریخ اسلام کے مطالعہ کا یہی فائدہ ہے کہ "اس سے ہماری ہندوستانی رعایا کو یہ محسوس ہوگا کہ ہمارے نرم اور منصفانہ طرز حکومت سے اس کو کیسے کیسے فائدے ہیں .... اور جب ہم ایسی شخصیتوں کے متعلق جواب صرف اپنی شان وشوکت، کارہائے نمایاں اور مسلسل فتوحات کے لئے مشہور ہیں نقاب خوشامد کو اٹھا دیں گے اور ان کو رنگین عبارت آرائیوں کے لباس سے عاری کر دیں گے اور ان کو

اُن کے اصلی رنگ میں دکھائیں گے تو غالباً یہ شخصیتیں دنیا کے سامنے اس طرح پیش کردی جائیں گی کہ بنی نوع انسان کی لعنت کا وہ مورد بنیں۔

دوم۔ پھر ہمارے کانوں میں لفاظ (بنگالی) بابو کی آواز نہ آئے گی جو ہمارے راج میں ایسی اعلیٰ درجہ کی ذاتی آزادی کا لطف اُٹھا رہا ہے کہ دیسی آزادی کسی فاتح قوم کے ماتحت نصیب نہوئی تھی.......... اگر وہ ان جلدوں میں جن کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے غواصی کریں تو ان بروٹس اور فوشیں کی قماش کے لوگوں کو یہ معلوم کر لینے میں کچھ دیر نہ لگے گی کہ اُس تاریک زمانہ میں جس کی واپسی کے لئے یہ لوگ آہیں بھر رہے ہیں ایسی دیوانوں کی طرح پُرجوش الفاظ کا صرف منہ سے نکالنا بس اُسیقدر جُرم خیال نہ کیا جاتا تھا کہ آواز خاموش کردی جاتی یا اس کی طرف التفات نہ کیا جاتا۔ نہیں بلکہ پگھلا ہوا سیسہ اور سُولی اُنکے لچھّن ٹھیک کردیتی......... ان سے یہ بیکار شور وشغب مچانے والے یہ بھی سیکھیں گے کہ حبّ الوطنی کی چنگاری یہاں ایک غیر ملک کا پودا ہے۔

سوم۔ یوروپ اور ایشیا کی فرمانروائیوں کا اضافی خوبیوں کے اعتبار سے مقابلہ کرنا بہت مفید سبق دے گا یعنی ہمارے دلوں میں خود اپنے ملک کی محبت و منزلت قائم ہوگی اور اُس کی محترم افادہ گاہوں کی ہم عزت کریں گے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ایک خود سر فرمانروا کے ظلم اور تلوّن مزاجی کے جھلسا دینے والے اثر کو ہم دیکھیں تاکہ زیادہ اچھی طرح ہم ایسی حکومت کی قدر کرنا سیکھیں جس کے انصاف کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔

چہارم۔ اس کے مطالعہ سے وہ پُرآب وتاب دھوکے بھی دلوں سے دور ہو جائیں گے جو عام طور سے ماضی خاندانوں کی بابتہ دلوں میں قائم ہیں۔ اور ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ اپنی بزم حکمت عملی۔ خلاف مزاجی ملک کی آب و ہوا اور ان نقائص کے باوجود جو باہر والوں کی حکومت میں ذاتی طریقہ سے شامل ہوتے ہیں ہندوستان کے لوگوں کو مادی طریقہ سے اس ملک میں ہم نے اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچایا ہے جو وس گونہ وقت میں ہمارے پیش رَو پہنچا سکتے تھے۔ فقط

مترجمہ

مولوی سید محمد معین الدین صاحب شاہجہانپوری

لکچر نمبر ۳

علم طبقات الارض

پروفیسر سید محمد ہادی حسن صاحب بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلام علیکم یا ایہا المسلمین ۔ فریضۂ اوّلین بندہ این ست کہ برائے تکلیفے کہ بدو مامور شدہ ام، اظہار کمال تشکّر و امتنان نمایم در خدمت رئیس این حلبۂ علمیۂ اسلامیہ ہندوستان جناب مستطاب حضرت اجل اشرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مدظلہ العالی کہ اساس این حلبۂ مبارک بنام نامی ہالیشان ست و تنظیم این انجمن سعید بسعی و اہتمام این والاحضرت۔ اما از حیث نظر قلت وقت بہ بندہ واجب ست کہ مستقیماً بر سر مطلب روم و آنچہ گفتنی ست عرض کنم بطریق ایجاز لفظ و اعجاز معنی تا الفاظ متابع معانی افتد و سخن کوتاہ گردد۔

علم طبقات الارض علمے ست قدیم امّا ادعائے سائر علمائے اعلام فرنگستان و ممالک متحدۂ امریکہ بر آنست کہ این علمے ست جدید یعنی قرون ہیژدہم و نوزدہم مسیحی نظم پذیرفت و ثبت اوراق کتب گردید۔ این سہویست بزرگ چہ اول کسی کہ درین باب چیزے نوشت ارسطاطالیس بود و لے ارسطاطالیس بطریق بسیار اختصار سخن ہمی راند و آں ہم راجع فقط بہ کوہ ہا و رود ہا و جواہر بود۔ بعد ازاں علمائے عرب در دورۂ خلافت عباسیہ وقت شاں را بدین علم مبذول داشتند و آنچہ از صحف سلف و مشہودات و محسوسات خود شاں قابل اعتنا بود جلیب نمودند۔ مثلاً در رسائل اخوان الصفا یک رسالہ ایست تمام تر منحصر بہ بحث در اکتشاف مسائل معادن۔ بعد ابوعلی بن سینا کہ از سنہ سہ صد و نود و ہشت تا ہزار و سی و ہفت مسیحی حیات داشتہ است و ابوریحان البیرونی کہ ہمعصر ابوعلی بود علم طبقات الارض را بذروہ اوج علیین رسانید

و ابوریحان البیرونی مخصوصاً باید اینجا یاد کرده آید زیرا که وے یک کتاب ممتاز که تمامتر در بارۂ علم جواہر و معادن ست ترتیب داده است۔ مقام تاسف ست برائے ما اہالی آسیا چه ما نه فقط از کتب قدیمی بے بهره و بے خبریم بلکه گمان می کنیم که علوم طبیعی علوم از تبۂ دول اروپاست یعنی از اقدم ازمنه تا یوم الحال سائر علوم عالم ربط و ضبط اہالی اروپ بوده است۔ حالانکه واقع این ست که آنچه ما گم کرده واز دست داده ایم آنها فراہم آورده و جمع کرده اند و بنا ہائے علوم ما که در ممالک خود ماں ویران شده آنها خشت خشت ترتیب داده اند بنوعی که قصور عالی منظر ساخته شده است۔

علم طبقات الارض اصلاً علم طبقات زمین ست و ایں علمے ست منتج علم الہیئت و علم الافلاک و علم الکیمیا و علم الحیات و علم الآثار الحیات۔ سوال اوّل این ست که چه طور زمین آفریده شد۔ اغلب فیلسوفان عالم برآں اند که زمین و سائر سیارہا جزو یک کرۂ نار بوده و آں کره در افلاک در حرکت بود و ازیں کره Nebula پارہائے علاحده گشت ہمچناں که شرار ہا از آتش جدا می شود۔ یکے ازیں پارہا زمین ماست۔ پس اول الحال زمین کلیتۂ آتش بوده است و لے در دہور طوال و مرور ایام حرورش متدرجاً کمتر شد تا آنکه سطوح بیرونیش مجسم شد و ہمیں سطوح یا طبقات علم ہا را اسم علم طبقات الارض داده۔

اما از آں چه سابقاً ذکر شد واضح خواہد شد که کیفیت درون زمین ہماں ست که بود یعنی آتشین ست و کوہ ہائے آتش فشاں و چشمه ہائے گرم آب و عیون زیبق و کبریت و حرارت معادن که متدرجاً از فوق تا تحت زیاد می شود شاہدان قوی مقال ماست۔ و علم طبقات الارض بایست که علم الارض نامیده شود زیرا که ایں علم مشتمل ست نه فقط بر طبقات زمین بلکه ہم بر آنچه که بالائے زمین ست یعنی ہوا و تاثیر ہوا بر زمین و ہم بر آنچه که در زیر طبقات زمین ست یعنی آں آتش که در اندرون زمین ست و بواسطۂ لرز زمین و شگاف ہائے عمیق و عریض گاه گاه بالا یا بیروں می آید و با خود سنگ ہائے متحلل را می آرد چنانچه که به بعض جاہا (مثلاً دکن ہندوستان) سطح زمین از سنگ ہائے متحلل که لہذا زبیروں آمدن مجسم شده مرکب ست۔

اما در بارۂ اہمیت و افادۂ علم عظیم طبقات الارض محتاج به شرح و بسط کلام نیستم۔ علمے که ما را از آغاز آفرینش زمین و از رموز جبال و بحار و معادن و از احوال ابتدائیۂ جمادات و نباتات و حیوانات و انسان ہائے قدیم خبر دہد البته جاذب تفحص و تجسس ست واز روے معاشیات ہم ایں علم دارائے اہمیت فوق العادہ ایست چه کانہائے سیم و زر و سرب و ارزیز و کانہا جواہر مانند یواقیت و زمرد و الماس و کانہا سنگہا قیمتی ہمچو مرمر و زبر جد جمله فروع علم المعادن ست و علم المعادن از فروع علم طبقات الارض ست و ما ہندیہا را بایست مہارت نامه دریں علم حاصل کنیم چو معادن ہندوستان از مزارع ہندوستان بیش بہا تر ست واگرچه آبا و اجداد ما حرارت

بوده اند مارا نه باید به کشتن زمین قناعت کرد۔ کجاست الماسهائے گلکندا؟ کجاست فضیات و ذہبیات استخر ایران؟ ہشیاری نیست در کشتن زمین۔ ہشیاری ست در کندن کوه گرچه کوه کندن کار مجنوں بوده است۔

بارے از مطلب دور افتادم۔ استادگان را باید بطورے درس دہند که ازدیادِ اشتیاق شود و طلاب در تجوی افتند و این در ہر علم لازم ست۔ خاصه در علوم طبیعی۔ چه بنا بر علوم طبیعی بر مشاہدات عینی و محسوساتِ شخصی ست پس ظاہر ست که عادت باید کرد به سفر کردن و دیدن و از انچه که دیده شود نتیجه گرفتن۔ سائر اختراعات که عالم را دگرگوں کرده نتیجه توہم و تفکر و خواندن کتب نبوده بلکه نتیجه شہادت عینی بوده است۔

آقایان! بسما فرموده شده است که در طلب علم برو تا بچین۔ اما به عقیدهٔ بنده ہر پارهٔ زمین که برای العین و عین التحقیق نگاه کرده آید ملکِ چین ست و ہر مشتِ خاک حکایتے ست تا اندازهٔ مرغوب و دلکش که انسان در وحیران فرماند۔ ملاحظه بکنید مثلاً زغال را۔ تقریباً پنجاه ملیوں سال پیشتر جاہہا که حالا آنجا معادن زغال ست جنگلہائے بزرگ بوده مسکونِ حیواناتِ عجیب و غریب که امروز نوع آنہا منقطع گشته و این جنگلہا بر ساحل دریا واقع و بواسطۂ لرز و حرکت عظیم زمین دفن شده و بدیں جہت چوب مبدل به ہیزم و ہیزم مبدل بزغال گشت۔ در ایام القدیم از وسط انگلستان و فرانسه و المان و آسیائے کوچک و ایران و شمالِ ہندوستان تا بمملک چین یک دریائے بزرگ بود و کدام کس را گمان باشد که کوه بلند ہمالیه محض تحتِ دریا بوده است؟

آقایان! پس بما واجب ست که این آثار الہی و اسرار علمی به طلاب آشکار کنیم و بہترین طریقه آشکار کردن این ست که اولاً چیزہائے حاضره و حالیه و نزدیک را بیاموزیم مثلاً ابر چیست و باراں چیست و رود چیست و دریا چیست و ابر باراں چرا می بارد و آب از سرچشمه به چشمه و از چشمه به رود و از رود به دریا چه طور رود۔ و نیز این که اثر جریانِ آب چیست چه طور دره ہائے عمیق و تنگ بریده شود و ہر گاه که زمین سخت باشد دره ہائے عریض بے عمق۔ ہر گاه که زمین نرم باشد۔ و ہم بتوسطِ نمونه ہائے در مدارس و ہم بتوسط احزاب تفرج کناں picnic parties طلاب را درس آنہا را عیناً نشان باید داد۔ و در ہر موقعه از عجائب و غرائب چیزہا را جمع باید کرد خاصه در موقع تفرج excursions دیک جوف و شیشه و بیل و تبک از لوازم ہیچو تفرج ست تا ہر شئی که از نوادر باشد نمونه اش جمع کرده آید و این نمونه ہا از قبیل سنگ ہائے آبی (aqueous rocks) و آتشی (Igneous Rock) و نقش اقدام بر سنگ و نشانِ برگ در زغال و موو دندان و ناخنہائے حیوانات و دیگر آثار الحیات جمعاً موزه (museum) (عجائب خانه) خواہد شد و موزه ہا که در فرنگستان ست مبنی بہاترین ملک ملی و اعلیٰ ترین خزینهٔ علمی ست۔

وچون چیزها در مقام اصلی معائنه و نمونه هائے برائے یادداشت فراهم آورده شده باشد باید نقشهٔ مقام را کشید- چناں که بلندی و پستیِ زمین و سمتِ جریانِ آب درو مندرج و از و کیفیت آشکارا گردد و طبقات زمین را به تعیین زمان و مکان در هیچ نقشه بالوان گوناگون اظهار باید کرد تا مابین سنگهائے آبی و سنگهائے آتشی تفاوت معلوم شود- سنگهائے آبی آنست که از سنگ ریزه هائے و بتوسطِ آب جمع شده و این نوع بر ضد سنگ هائے آتشی که از اندرونِ زمین بالا آمده و علم الحجار (petrology) مشتمل ست بر هر دو نوع بزرگ سنگ و نوع دیگر سیومی که نیم آبی و نیم آتشی ست -

آقایان! چنانکه باغ وحوش (Zoologicalgarden) بهترین طریقهٔ آموختن علم الحیوانات است و باغ نباتات (Botanicalgarden) بهترین طریقهٔ آموختن علم النباتات بر همان نهج موزهٔ علم الحجار (petiological museum) و موزهٔ علم الآثار الحیات - Palaeontological musium - بهترین وسیلهٔ آموختنِ علم الطبقات الارض ست -

چون چیزهائے نزدیک و حاضره دریافته شد کیفیت چیزهائے بعید و احوال دهورِ گزشته باید دریافت اعنی که در ایام القدیم ترتیب هوا چه بوده رطوبت و حرورش آیا همان قرار بوده که هست و یا دیگر گون بود- و کوه ها و صحرا و دریا ها که امروزه اینجاست آیا همیشه همانجا بوده و اگر نه کجا بوده است و سبب تبدیل چیست؟

مختصر این ست که بدین طریق ما می توانیم از محسوسات و مشاهدات به معقولات برسیم و کامل العقل باشیم و کامل العقل بودن سبب ترقی انسان و باعث مدنیت اقلیم ست -

لکچر نمبر ۸

کتب خانوں کا قیام اور اُن کی نگہداشت

خواجہ اسداللہ صاحب بی اے۔ گورنمنٹ لائبریرین دہلی

تمہید لائبریری کے مفہوم سے آپ میں سے ہر ایک صاحب بخوبی واقف ہونگے۔ اس لئے اس کی توضیح کئے بغیر میں لائبریریوں کے اجرا و قیام اور اُن کی نگہداشت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں اور اس مضمون میں میں ان (Institutions) کے مفید ہونے کی بحث میں نہ پڑوں گا۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ کوئی بھی تعلیم یافتہ شخص اس کے برعکس رائے نہیں رکھ سکتا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ ہم خود کبھی بڑی بڑی وسیع اور شاندار لائبریریاں قائم کر چکے ہیں اور ان کے مالک رہے ہیں بلکہ فی زمانہ ہر ایک مہذب ملک میں جن کو اس وقت ہم اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے راہ نما بنائے ہوئے ہیں۔ اس تحریک کو پُرزور طریقوں سے رواج دیا جا رہا ہے اور لائبریریوں کا قیام تعلیم کا ایک لازمی جزو قرار دے دیا گیا ہے۔ تیسرے اس وجہ سے بھی کہ آگے چل کر جو کچھ حالات میں غیر ممالک کے اس بارے میں بیان کروں گا۔ ان سے خود واضح ہو جائے گا کہ آخر جس کام کے لئے اس قدر روپیہ اور محنت صرف کی جا رہی ہے۔ وہ بے سود نہیں۔

کلاسیفی کیشن چنانچہ اس مختصر تمہید کے بعد میں نفسِ مضمون کو شروع کرتا ہوا پہلے کتابوں کی تقسیم یا کلاسیفی کیشن کا کچھ حال بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے ہم (Deweys decimal classification) کو لیتے ہیں۔ اس اسکیم کی اختراع کا فخر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ایک صاحب (Melvil Dewey) کو حاصل ہے۔ ۱۸۷۳ء میں یہ اسکیم تیار کی گئی اور اس کو پہلی مرتبہ کتابی صورت میں ۱۸۷۶ء میں شائع کیا گیا۔ جب اس کی کل ۱۰۰۰ کاپی چھاپی گئی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں اس کا گیارہواں ایڈیشن جو پہلے ایڈیشن سے کئی گنا بڑا ہے۔ تیار ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں دیا گیا۔

اور اس کی پانچ ہزار کاپی چھاپی گئیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ اوّل میں اسکیم اور دوسرے میں انڈکس یعنی
ان تمام ہیڈنگز کو جو حصہ اول میں استعمال ہوئے ہیں مع کئی نئے عنوانوں کے حروف تہجی کے لحاظ سے
یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسکیم کے لئے مختلف تجربوں کے بعد اس کے اختراع کرنے والے کو (Decimal system)
سے بڑھکر کوئی مفید چیز استعمال کے لئے نہیں ملی اور اس لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ انڈکس میں جس کا پورا نام
(Relative Index) ہے۔ ہر ایک وہ عنوان جو مختلف جگہوں میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا
ہے اسی طرح الگ الگ دکھایا گیا ہے۔ عام طور پر کلاسیفیکیشن کے کام میں ایک ہی مضمون کی ایک کتاب ایک جگہ اور
دوسری بعض وقت غلطی سے دوسری جگہ رکھدی جاتی ہے۔ چنانچہ اس دقت کو دور کرنے اور کلاسیفیکیشن میں
یکسانیت پیدا کرنے کے لئے یہ انڈکس حد درجہ مفید ثابت ہوا ہے۔ انڈکس میں چالیس ہزار عنوان درج ہیں۔

تقسیم

اس اسکیم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ علوم کو کل نو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور انھیں ایک
سے لے کر نو تک یا زیادہ سہولت کے لئے ایک سو سے لے کر ۹۰۰ تک نمبر دیئے گئے ہیں۔ یعنی
ایک سو فلاسفی۔ دوسو مذہب۔ تین سو (Sociology) چار سو (Philology)
پانچ سو (Natural Science) چھ سو (Useful Arts) سات سو (Fine Arts)
آٹھ سو Literature اور نو سو (History) اس کے علاوہ ایک کلاس اور بھی ہے جسے صفر کا
نمبر دیا گیا ہے اور اس میں وہ تمام (Encyclopaedias) اور (Journals) وغیرہ
شامل کئے گئے ہیں۔ جن کا تعلق مندرجہ بالا علوم میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص طور پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان سب
پر حاوی ہیں۔ چنانچہ اس طرز یعنی صفر سے مراد (general) ہے جس کو تمام اسکیم میں بنایا گیا ہے۔
اب ہر ایک کلاس کو پھر دس (Divisions) میں تقسیم کیا گیا ہے اور کل اسکیم ایک سو حصوں میں تقسیم
ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر کلاس (Sociology) کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔

Political science 320 / Statistics 310
Administration 350 Law 340 / Political Economy 330
Education 370 Associatons and Institutions 360
Customs, Costumes and Folklore 390 Commerce and Communications 380

اب ہر ایک ڈویژن پھر دس (Sections) میں تقسیم کیا گیا ہے جس سے ہر ایک کلاس
سو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور کل اسکیم ایک ہزار حصوں میں ہے۔ مثال کے طور پر ڈویژن (330 یعنی
Pol. Economy) کی تقسیم دکھائی جاتی ہے Capital Labour & wages - 331

Banks, money, Credit 332 ؛
Cooperation 334 ؛ Land and ownership 333
Finance 336 ؛ Socialism and Communalism 335
Protection and Free trade 337
Production and manufactures 338
Consumption and Pauperism 339

اب ان سیکشنز میں سے کسی کو یا اس کے کسی حصے کو مزید حصوں میں تقسیم کرنا ہو تو Decimals کی مدد سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ تقسیم بھی دس تک محدود رہے گی۔ مثال کے طور پر 332 یعنی Private Finance کو 332.1 Saving Banks .2 Bank & Banking
.3 Money .4 Loan Insts
.5 Stocks and shares
وغیرہ وغیرہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اب اگر 332.3 یعنی Loan Institutions کی مزید تقسیم کی ضرورت ہے تو Coins & Coinage + Credit insts 332.31
.32 Building Associations .34 Pawn Shops
وغیرہ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں .35 سے .39 جگہیں خالی ہیں۔ کہ آئندہ پیدا ہونے والے عنوان یہاں قائم کئے جائیں Credit insts 332.31 کی پھر تقسیم اس طرح کی گئی ہے:-
Agr. Banks and Credit. 332.311
اور Manufacturers Credits. 312
اسی طرح ہر ایک عنوان کی خواہ وہ ڈویژن ہو یا سیکشن یا سب سیکشن برابر تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور یہی اس اسکیم کا ایک خاص وصف ہے جو کسی اور اسکیم میں نہیں ملتا کہ اس میں Expansion کے لئے نہایت کھلا میدان موجود ہے اور جب ایک دفعہ اس کا اصول سمجھ لیا جائے تو پھر اس کو پھیلانے یا استعمال کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ کلاس ہسٹری میں تقسیم بلحاظ ممالک کے ہے اور وہاں بھی ایک خاص نقشے کے ذریعے سے ہر ایک ملک کا ایک مقررہ نمبر ہے اور پھر جب آپ کو کسی Topic کا تعلق خاص ملک سے دکھانا ہو تو وہی نمبر Topic کے نمبر کے ساتھ لگا دیجئے۔ چنانچہ اس تقسیم کا تھوڑا سا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً نمبر ۴ سے مراد یورپ ۵ سے ایشیا۔ ۶ سے افریقہ ۷ سے

شمالی امریکہ ۸ سے جنوبی امریکہ اور ۹ سے آسٹریلیشیا لیا ہے۔ پھر ہر ایک براعظم کو ممالک میں تقسیم کیا گیا ہے
جس کی وضاحت ہم ایشیا کی مثال سے کریں گے۔ یعنی چین ۵۱۔ جاپان ۵۲ - عرب ۵۳ - ہندوستان ۵۴
فارس ۵۵ - ٹرکی ۵۶ - سائبریا ۵۷ - افغانستان، ترکستان، بلوچستان ۵۸ Further India ۵۹
اب جہاں کہیں آپ ان ملکی نمبروں کو کسی عنوان کے ساتھ شامل کردیں تو اس تمام نمبر سے مراد
اس عنوان کا تعلق اس خاص ملک سے ہوگا۔ مثلاً ۹۵۴ سے مراد تاریخ ہند ہے۔ اس طرح کہ کلاس ۹
تاریخ اور ۵۴ ہندوستان یا اگر ہم سیکشن ۳۷۰ Education کے ساتھ ۹۵۴ لگا دیں۔ تو
۳۷۰.۹۵۴ کے معنی History of education in India ہو جاویں گے
اس طرح کہ ۳۷۰ تعلیم ۹ History اور ۵۴ India اس کے برعکس اگر فرض کیجئے کہ آپ کے
پاس ایک کتاب Indian Currency and Finance by Keynes
ہے اور آپ اسے کلاسیفائی کرنا چاہتے ہیں تو اتنا تو ہر شخص بتا سکے گا کہ کتاب Economics سے
تعلق رکھتی ہے اور اس کے بعد اس کا تعلق Finance سے ہے یا اگر یہ بھی نہ ہو تو Index
میں فنانس کے لفظ کے سامنے اسے ۳۳۶ کا نمبر ملے گا۔ جس سے کتاب کی تقسیم اتنی تو ہو گئی
بحث ہے ہندوستان کے فنانس کی، اس لئے ہمیں اپنی کلاسیفکیشن میں یہ بات بھی ظاہر کرنی ہوں۔ چنانچہ
۳۳۶ کے بعد Decimal لگا کر ۵۴ لکھدیں تو کتاب کا نمبر ۳۳۶.۵۴ جس کی تشریح یہ ہوگی کہ
India 54 Finance6 اور Economics 3 دوسرا اور Sociology
اس تقسیم کے علاوہ ہر ایک کلاس۔ ڈویژن سیکشن اور سب سیکشن کی تقسیم بلحاظ Form بھی
کی گئی ہے یعنی Theory.01 Compends.02 Dictionaries.03
Essays.04 Periodicals.05 Societies.06
Teaching and Education.07 Colletive works.08 History.09
یعنی اگر آپ کو ڈویژن ۳۳۰ پولیٹیکل اکانومی کی ڈکشنری کو نمبر دینا ہے تو آپ ۳۳۰ کے ساتھ ۰۳
لگا دیجئے۔ تو ۳۳۰.۳ کے معنی یہی ہوں گے یا اگر آپ کے پاس Economic Journal
ہے اور آپ اسے کوئی نمبر دینا چاہتے ہیں تو وہ ۳۳۰.۵ ہوگا۔ اس ضمن میں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ ان
کے معنی مقرر ہیں۔ یعنی جہاں بھی کسی مضمون کو آپ اس صورت میں تقسیم کرنا Form divisions
چاہیں وہاں ۰۳ کے معنی ڈکشنری ۰۵ کے معنی اس مضمون کے Periodicals ہی ہونگے
اسی طرح ایک اور مشہور سکیم Subject Classification | Subject Classification

واضع مسٹر James Duff Brown باشندۂ انگلستان ہیں۔ صاحب موصوف اپنی قوم میں لائبریری کی تحریک کے نشو ونما کے روح رواں گزرے ہیں۔ وہ نہ صرف ہر طرح لائبریریوں کے قیام اور توسیع کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ بلکہ متعدد کتب کے جو Library Economy سے تعلق رکھتی ہیں۔ مصنف بھی تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ اس سکیم کا اختراع تھا۔ جو بجائے خود ایک نہایت محنت طلب کام ہے۔ اس اسکیم کا مختصر بیان ذیل میں درج ہے:

۱۸۹۸ء میں ان ہی صاحب نے ایک سکیم بنام Adjustable Classification شائع کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ اسکیم جس مدعا کو لئے ہوئے نکلی تھی۔ اس پر وہ پورے طور پر حاوی نہ ہو سکی۔ لہذا کچھ سالوں کے وقفہ کے بعد اسی اسکیم کے ردّ و بدل کا نتیجہ اسکیم زیر بحث کا وجود تھا۔ جو ۱۹۰۶ء میں ظاہر کیا گیا اس اسکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی ترتیب Logical طریق پر رکھی گئی ہے اور اس دعوے کی بنا پر اس کی فوقیت دوسری اسکیموں پر اور خصوصاً Dewey پر ظاہر کی جاتی ہے۔ خیر یہ تو بحث طلب سوال ہے اور ہمارے اس پرچہ کی حدود سے باہر۔ بہرحال اس سکیم کا تھوڑا سا بیان بطور مقابلہ ضروری ہے۔ اس اسکیم میں علوم کی تقسیم تو Dewey کی طرح دس حصوں ہی میں کی گئی ہے۔ لیکن Notation یا نشان بجائے ہندسوں کے حروف تہجی سے لئے گئے ہیں اور چونکہ حروف تہجی میں Decimal کی طرح Elasticity نہیں ہے۔ لہذا بعض جگہ ایک ہی کلاس کے لئے کئی حروف ملا کر کام نکالا گیا ہے۔ جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے ظاہر ہوگا:

B. C. D. Physical Science & Generalia;
E. F. Biological Science.
G. H Ethnological and medical science
I. Economic Biology and Domestic Arts; J. K. Philosophy and Religion
L. Social and political Science;
M. Language and Literature;
N Litirary forms;
O-X History, Geography and Biography.

اس تقسیم سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ وہی Elasticity کا سوال جو ابھی اٹھایا گیا تھا۔ جو دیو

کے استعمال سے حاصل نہیں ہو سکتا مثلاً جہاں Dewey نے کلاس ۹۰۰ ہسٹری کو
Biography, 920 Geography and Topography 910
Modern History 940-990, Ancient History 930
میں تقسیم کیا ہے۔ اور صرف ایک ہندسہ ۹ کو ہی پھیلا کر اپنا مطلب پورا کرلیا ہے۔ براؤن کو اسی مطلب کے لئے
x — ۵ تک یعنی دس حروف کو استعمال کرنا پڑا ہے اور جہاں ڈیوی میں ۹۱۰ یا ۹۲۰ کا کلاس
نوسو کی شاخ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں q یا P سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ بجائے خود علیحدہ علیحدہ
ڈویژن معلوم ہوتے ہیں۔ اب دوسرا سوال Expansion کا ہے۔ اس کے لئے براؤن کو
ہندسوں سے کام لینا پڑا ہے اور پھر حسب ضرورت (Decimal) چھوڑا بھی نہیں یعنی جہاں
Deway کی Notation pure ہے وہاں براؤن کی (Mixed) ہے جو
کلاسیفیکشن کے اصولوں کے ماتحت ایک نقص ہے۔ اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے کلاس B-D کو لیجئے۔
اس کی تقسیم اس طرح ہے کہ B999 سے B1 تک جگہ Physics کو دی گئی ہے جن میں
بعض جگہ خالی بھی ہیں۔ کہ آئندہ نئے عنوان قائم کرنے میں سہولت ہو اور پھر C/ Magnetism
Electricity and ہے۔ اب حالانکہ یہ دونوں عنوان یعنی E and M فزکس کی شاخیں ہیں اور سکیم کے
مطابق کلاس B-D کی ممبر ہیں۔ لیکن ان کا نمبر C.I اس بات کو ظاہر نہیں کرتا کہ وہ B.I یعنی
فزکس سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی قسم کے اور اعتراضات بوجہ زیادہ ٹیکنیکل ہونے کے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اس
سکیم کی ایک خصوصیت (Categorical tables) ہے۔ جو ڈیوی کے Form
Classification کا مقابلہ ہے۔ ان (Tables) کی رو سے ۰ سے لے کر ۹۷۵ تک
مختلف عام استعمال کے ہیڈنگز جمع کر دیئے گئے ہیں جن میں سے مثال کے طور پر ۲۲ governments
اور ۹۳۱ گزیٹر کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں main classification میں ان
ہیڈنگز میں سے کسی ایک کی ضرورت ہو۔ تو اس کلاس یا ڈویژن کے whole No کے ساتھ یہ
Decimal No لگا کر مطلب حل کرلیا جاتا ہے۔ جیسے ۸۷۵ ۵۲۰ M سے مراد
(= Pronunciation of English Language)
بہر حال یہ ہے مختصر خاکہ ان دو مشہور سکیموں کا۔ ان کے علاوہ چند اور مشہور سکیمیں بھی ہیں۔ جن کے
محض نام گننے پر میں اکتفا کروں گا یعنی Expansive اس کے موجد مسٹر Cutter
ایک امریکن لائبریرین ہیں۔ دوسری اسکیم Library of congress scheme of
Clasification ہے جو ۸ ۔ ۶ ۔ ۱۹

کی قومی لائبریری میں رائج ہے اور بعض اور جگہ بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی لائبریریوں میں جن میں سب سے زیادہ مشہور برٹش میوزیم ہے۔ اپنی اپنی اختراع کردہ سکیمیں رائج ہیں لیکن اس بات کے کہنے میں مجھے تامل نہیں اور یہ محض میری ذاتی رائے نہیں۔ کہ اب تک جو جو سکیمیں مختلف لائبریریوں یا سوسائٹیوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔ ان میں D.C یعنی Dewey کو سب سے برتری فوقیت حاصل ہے اور اس کے مفید اور ہر دلعزیز ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے علاوہ جو اس کا پیدائشی وطن ہے اور جہاں قریب قریب ہر ایک لائبریری میں یہ مروج ہے۔ خود انگلستان میں جہاں ایک سے زیادہ سکیمیں نکالی گئیں۔ نصف سے زیادہ لائبریریاں اسی کو استعمال کرتی ہیں اور دن بدن اس کا رواج عام ہو رہا ہے۔ بلکہ اکثر لائبریریاں جب اپنے ہاں کی کسی خالی اسامی کا اشتہار نکالتی ہیں تو اس میں ایک شرط یہ بھی لگا دی جاتی ہے کہ Dewey سسٹم جاننے والا شخص ترجیح پاوے گا۔ ڈیوئی سسٹم تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ ہمارے ہاں بھی بخوبی کارآمد ہو سکتا ہے اور اس وقت چند لائبریریوں میں رائج بھی ہے۔ جن میں سے ایک ہماری مسلم یونیورسٹی کی لٹن لائبریری بھی ہے جو آج سے تین سال پہلے اسی اسکیم کے مطابق از سرِ نو ترتیب دی گئی تھی۔

Author numbers

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ ایک ہی مضمون پر کئی کتابیں ہوتی ہیں اور جب ان سب کو بلحاظ مضمون ایک ہی نمبر دیا گیا۔ تو ان کی آپس کی تفریق کس طرح پر ہوگی۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے Author nos یا Cutters author tables استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ:

حروف تہجی کے مختلف Combinations جمع کر کے ان کو گیارہ سے ننانوے تک نمبر دے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً

Cam 15 اور Cal 14 ; Caq 13 ; Case 12 ; Cab 11 اور اسی طرح ۹۹ تک +

چنانچہ Cabanis نام کے لئے C 11 نمبر تجویز ہوگا۔ اور Caelor کے لئے C) ۱۲) اب ان دونوں ناموں کے درمیان جتنے نام آئیں گے یعنی (Cab) اور (Cae) کے درمیان وہ سب (C 11) کہلائیں گے۔ اب پھر اگر ایک ہی مضمون پر ایک ہی مصنف کی ایک سے زیادہ کتابیں موجود ہوں۔ تو اس کے لئے آتھر نمبر کے بعد کتاب کے نام کا پہلا حرف لگا دیا جاتا ہے چنانچہ اسی Keynes کی کتاب کو جسے ہم نے ۳۳۶ ، ۵۴ کا نمبر دیا تھا۔ آتھر نمبر کے لئے K 18 i دیا جائے گا اور کتاب کا call no K 18 i 336.54 ہوگا۔

Cataloguing — کٹیلاگ یا عام طور پر جسے ہم فہرست کتب کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

Author Catalogue — اس میں محض مصنفین کے ناموں کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر فہرست تیار کر لی جاتی ہے اور سبجکٹ وغیرہ کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ کٹیلاگ بڑے بڑے فاضل اور اکسپرٹ حضرات کے کام آسکتا ہے۔ عام شائقین اس سے چنداں فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس قسم کا کٹیلاگ برٹش میوزیم اور لندن لائبریری میں ہے۔ گو شاید اسی دقت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ عرصہ سے وہاں اب ایک سبجکٹ کٹیلاگ بھی شروع کیا گیا ہے۔

Dictionary — دوسری قسم ڈکشنری کٹیلاگ کی ہے جس میں تمام اندراجات ایک ہی سلسلے میں مثل ڈکشنری کے ترتیب دیئے جاتے ہیں اور Title, Author سبجکٹ وایڈیٹر اور ترانسلیٹر وغیرہ کے واسطے جو بھی اندراجات ہوں۔ ان میں آپس میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی کٹیلاگ کی یہ قسم امریکہ اور انگلستان دونوں جگہ مقبول ہے اور دراصل یہ ہے بھی ایک نہایت کارآمد چیز۔ گو بعض حضرات مثل براؤن کے اسے پسند نہیں کرتے۔ اس کٹیلاگ کے عمدہ ترین نمونے امریکہ میں

اور Brookly library catalogue

Index catalogue of Surgeon General's Library

ہیں اور انگلستان میں Hampstead اور Bishopsgate Instt. London

Public Libraries

میں ملیں گے۔ معترضین اس قسم کے کٹیلاگ میں یہ نقص ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اس میں اول تو مضامین کا کوئی تناسب نہیں اور پھر یہ کہ Allied subjects ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے بڑا نقص یہ کہ اگر اس قسم کا کٹیلاگ چھاپا جائے تو It is out of date as soon as it is out of press کا مصداق ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں ایزاد شدہ کتابوں کے متعلق نئے اندراجات نہیں ہو سکتے۔ بہر حال جہاں بھی اس قسم کا کٹیلاگ رائج ہو۔ وہاں subject entries میں یکسانیت قائم رکھنے کے لئے A.L.A. list of subject headings کا استعمال لازمی ہے۔ ڈکشنری کٹیلاگ کا نمونہ لٹن لائبریری کے کٹیلاگ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ سوا اس فرق کے کہ یہاں بجائے سبجکٹ کے Reference cards بنائی گئی ہیں۔

5- Classified Catalogue   کیٹلاگ کی تیسری قسم جس کا بہترین نمونہ   Classified

Carnegie Library of Pittsburgh
کا کیٹلاگ پیش کرتا ہے (اس کیٹلاگ کی ایک کاپی لٹن لائبریری میں موجود ہے) اور انگلستان کی لائبریریوں میں سے Islington اور Patent office New castle upon Tyne
کی لائبریریاں اس قسم کے کیٹلاگ تیار کرتی ہیں۔ اس کیٹلاگ میں کتابیں مضمون وار ترتیب دی جاتی ہیں اور الماریوں میں ان کی ترتیب کیٹلاگ کے مطابق ہوتی ہے اب ہر مضمون کے تحت میں پھر جس قسم کی ترتیب پسند ہو۔ استعمال کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کا کیٹلاگ عام لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ ملتے جلتے مضامین ایک دوسرے کے قریب رکھے جاتے ہیں۔ لیکن عام قارئین کے لئے یہ جب ہی مفید ہوسکتا ہے جب اس کے ساتھ Author اور Subject Index شامل کئے گئے ہوں۔

کیٹلاگ کی چوتھی قسم   Alphabetical classed catalogue

Alphabetical classed catalogue
ہے۔ اس میں بھی تیسری قسم کی طرح ترتیب بلحاظ مضامین کے ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس میں مضامین حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیئے جاتے ہیں جیسے

Mathematics،
Meteorology
Museums، optics
Philosophy، physics

اس ترتیب سے یہ ظاہر ہوگا کہ (optics) کا کوئی تعلق میوزیم یا فلاسفی سے نہیں ہے اور اس سے قریب ترین مضمون فزکس ہے مگر Alphabetical Order کو قائم رکھنے کے لئے فلاسفی درمیان میں آگئی۔ اس قسم کے کیٹلاگ کی مثالیں دیکھنے کے لئے آپ کو
L.A Subject Index to Periodicals
London Library subject, Index اور
B. Museum Subject Index اور

دیکھنے پڑیں گے۔ یہ ترکیب نہ صرف آتھر کیٹلاگ کے ضمیمہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جیسے کہ برٹش میوزیم کی حالت میں۔ بلکہ بعض لائبریریوں میں پورے کیٹلاگ صرف اسی صورت میں بنائے گئے ہیں۔

Catalogue forms یہاں تک تو کیٹلاگ کی اقسام کا مختصر حال تھا۔ اب تھوڑا سا بیان اس کی صورت یعنی Form کا بھی ضروری معلوم دیتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک چھپے ہوئے کیٹلاگ کا رواج عام ہوتا تھا اور اس کا استعمال کتابی صورت میں بہت آرام دہ تھا مگر ایسی لائبریریوں میں جہاں کتابیں عموماً ایزاد کی جاتی رہتی ہیں اور کون ایسی لائبریری ہے جو لائبریری کہلا کر اس بارے میں پیچھے رہے۔ کیٹلاگ کا یہ طریقہ مفید نہیں ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ اس پر بھی وہی اعتراض تھا کہ پریس سے شائع ہوتے ہی یہ ردی ہو جاتا تھا۔ جو کہ بالکل درست بھی ہے لیکن اب اس کا رواج دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ گو بعض بڑی بڑی لائبریریوں میں عام circulation کے لئے چھپا ہوا کیٹلاگ رہتا ہے۔ اور خود لائبریری میں استعمال کے لئے اسے upto date رکھنے کی کوئی اور صورت اختیار کر لی جاتی ہے۔

Card catalogue لیکن کیٹلاگ کی ایک اور صورت یعنی کارڈ کیٹلاگ کا رواج دن بدن ہر جگہ بڑھ رہا ہے اور اب تک کیٹلاگ کو upto date رکھنے کی اور اس سے بہتر صورت کوئی سوجھی بھی نہیں۔ یہ کیٹلاگ عموماً ہاتھ سے لکھا جاتا ہے اور ہر ایک اندراج علیحدہ علیحدہ ایک چھوٹے سے کارڈ پر جس کا عام سائز "۳ × ۵" ہوتا ہے۔ درج ہوتا ہے۔ یعنی ایک کارڈ پر صرف ایک ہی entry از قسم Subject entry، Title entry، Author entry ایڈیٹر۔ ٹرانسلیٹر یا Analytic entry درج کی جاتی ہے۔ اس طرح ایک کتاب کے لئے ایک سے لے کر بعض اوقات ۲۵۔۳۰ کارڈ تک تیار کرنے ہوتے ہیں کیٹلاگ کے کارڈ لکڑی کے صندوق میں مختلف درازوں میں رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی ترتیب اس بات پر منحصر ہے کہ کیٹلاگ کی کونسی قسم کس لائبریری میں رائج ہو گی۔ یعنی آیا وہ ڈکشنری ہوگا یا محض آتھر یا classed کیٹلاگ کی اس صورت کی سب سے بڑی خوبی اس کی لامحدود توسیع اور اس کا ہر وقت upto date ہونا ہے۔ کیونکہ جونہی کوئی کتاب لائبریری میں آئی۔ اس کے کارڈ تیار کر کے آپ فوراً انہیں اپنی جگہ پر لگا سکتے ہیں۔ اس کیٹلاگ کا بہترین نمونہ Library of congress, Washington میں ملے گا۔ اس لائبریری میں کتابوں کے کارڈ نہ صرف لائبریری کے اپنے ہی استعمال کے لئے چھاپے جاتے ہیں۔ بلکہ دیگر لائبریریاں بھی وہاں سے یہ کارڈ خرید کر اپنے اپنے کیٹلاگ میں لگا لیتی ہیں اور اس طرح

نہ صرف تمام ان لائبریریوں میں جہاں یہ صورت اختیار کی جائے۔ یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ کیٹلاگ کی تیاری کا خرچ بھی بہت حد تک محدود ہو جاتا ہے۔ ان کارڈوں کی تیاری کا اندازہ آپ کچھ ان اعداد سے لگا سکتے ہیں۔ کہ ۱۹۱۴ء تک قریب ساڑھے چھ لاکھ کتابوں کے کارڈ تیار کئے جا چکے تھے۔ اور اس تعداد میں ہر سال پچاس سے پچپن ہزار کارڈ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کارڈوں میں بیشتر تعداد امریکہ کی تیار شدہ کتابوں کے متعلق ہوتی ہے مگر انگریزی کتابوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ ایک کتاب کے لئے اس کے کارڈ ایک آنہ قیمت میں خریدے جا سکتے ہیں حالانکہ اگر وہی کارڈ ہر لائبریری اپنی اپنی جگہ تیار کرنے لگے تو اس سے کئی گنا زیادہ لاگت اس پر صرف ہو انگریزی زبان کی کتابوں کے متعلق یہ سہولت تا حال صرف[1] U. S. A تک محدود ہے۔ مگر برٹش لائبریریز اس کے فوائد سے بے بہرہ ہیں۔ اور تا حال اس کام کا بیڑا کسی لائبریری نے وہاں نہیں اٹھایا۔ اس کے علاوہ چار اور لائبریریز یعنی Institute International de Bibliograpio. Brussels; Concilium Bibliographicum, Zurich John Crerar Library, Chicago Pittsburgh Library of Pittsburgh اور بھی چھپے ہوئے کارڈ شائع کرتی ہیں۔

کیٹلاگ[2] میں کارڈ ہاتھ سے لکھے جاتے ہیں۔ ٹائپ کئے جاتے ہیں۔ چھاپے جاتے ہیں اور بعض جگہ چھپی ہوئی سلپس[3] کارڈوں پر چسپاں کر دی جاتی ہیں۔

Sheaf catalogue کیٹلاگ کی دوسری صورت شیف کیٹلاگ ہے۔ جو کتاب کی شکل میں ہوتا ہے لیکن اس میں الگ الگ ورق بڑھانے یا گھٹانے کی سہولت ہوتی ہے۔ اس میں عموماً چھ سو سے آٹھ سو تک ورق اکھٹے کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک یہ کیٹلاگ کارڈ کیٹلاگ سے مشابہت رکھتا ہے۔ مگر جہاں کارڈ سسٹم میں ایک کارڈ پر ایک اندراج ہوتا ہے شیف میں ایک صفحہ پر کئی اندراجات ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر ایک صفحہ وقتاً فوقتاً دوبارہ لکھنا پڑتا ہے۔ اسی صورت سے ملتا جلتا طریق کیٹلاگ کا ایک اور بھی ہے جس میں چھپی سلپس رجسٹروں میں جو اسی مطلب کے لئے خاص طور پر بنائے جاتے ہیں چسپاں کر دی جاتی ہیں اس قسم کا کیٹلاگ برٹش میوزیم اور Bodleian لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے۔

Catalogue Codes کیٹلاگ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بیان کر دیا جائے۔ کہ کیٹلاگ بنانے کا کام محض اٹکل پچو نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بھی یکسانیت پیدا کرنے کے لئے قواعد

---

[1] ممالک متحدہ امریکہ [2] فہرست کتب [3] چٹیں

مقرر ہیں اور ہر قابل قدر لائبریری میں ان کے مطابق کیٹلاگ تیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے جہاں برٹش میوزیم اور باڈلین میں اپنے اپنے تیار کردہ Codes کے مطابق کام کیا جاتا ہے۔ عام لائبریریوں کے واسطے ایسی کتب مثلاً Cutter's Rules for a dictionary catalogue

Hitchler's cataloguing rules for small libraries.

Brown's Library Classification اور and cataloguing

موجود ہیں۔ اس سلسلہ کی زیادہ مشہور کتاب Anglo-American code ہے جسکو A. L. A. اور لائبریری ایسوسی ایشن (لندن) کے نمائندوں نے مل کر ۱۹۰۸ء میں تیار کیا تھا۔ اس بیان سے ظاہر ہوگا کہ جہاں ہمارے ملک میں ابھی تحریک لائبریری کی ابتدا بھی نہیں ہوئی دوسرے ممالک میں اس بارے میں کیا کچھ انجام دیا جا چکا ہے اور ہر ایک بات کو ایک قانون اور قاعدہ کے مطابق لایا جا چکا ہے۔

اقسام لائبریری

لائبریریوں کی نگہداشت یا رکھ رکھاؤ کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم خود لائبریری کی مختلف اقسام کا ذکر کریں گے اور اس میں سب سے پہلے اسکول لائبریری کو لیتے ہیں۔

اسکول لائبریری

ہمارے ملک میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً میٹرک کے درجے کے بعد بہت کم طلبا اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں بلکہ انھیں تلاشِ روزگار کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہمارے ملک کا تسلیم شدہ افلاس ہے۔ لیکن دوسری وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ ان میں مطالعہ کا شوق پیدا نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اگر محض تلاش روزگار کے لئے ہی وہ تعلیم کو ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہوں۔ تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اسکول چھوڑنے پر وہ یہ بھی خیال کرلیں۔ کہ اب ہمارے کتاب کو ہاتھ لگانے کے دن بھی ختم ہوگئے۔ یا وہ یہ سمجھیں کہ دس سال کے عرصہ میں انھوں نے کافی کتابیں پڑھ لی ہیں۔ لیکن یہ سب ان کی خام خیالی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شوق مطالعہ کی کمی کا سارا الزام طلبا یا استادوں پر ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ اس کا ذمہ دار ایک حد تک ہمارا طریقۂ تعلیم بھی ہے۔ کیونکہ اسکول کی جماعتوں میں ہی طلبا کو اتنے مضامین کی بھرمار رہتی ہے۔ کہ وہ مشکل کسی اور طرف توجہ۔ کر سکتے ہیں اور شاید استاد بھی انھیں توجہ نہ کرنے دیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دوسری کتابوں کے پڑھنے کے رجحان کا یہ نتیجہ ہوگا کہ

لہ اصطلاحات

کہ طلبا اپنی ٹیکٹ چھوڑ دیں گے۔ جس کی وجہ سے امتحان کے نتائج خراب رہیں گے اور استاد انسپکٹروں کی سرزنش کا مورد ہونگے۔ بہرحال وجوہات کچھ بھی ہوں۔ مگر ہمیں طلبا کو اس قسم کے مطالعہ سے بے بہرہ نہ رکھنا چاہیئے۔ بلکہ کتابی علم کے سوا انھیں تھوڑا بہت دنیوی علم بھی دینا چاہیئے۔ اور ان میں یہ شوق پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ اسکول چھوڑ دینے کے بعد بھی مطالعہ کو جاری رکھیں۔ جس سے وہ نہ صرف قوم کے مفید افراد بلکہ لائق شہری اور قابل باپ بن سکیں گے۔ اس بات کا واحد علاج سکولوں میں لائبریریوں کا قیام ہے لیکن اس تجویز کو سن کر نہ تو سکول ماسٹر صاحبان گھبرائیں اور نہ سکولوں کے ارباب حل و عقد۔ کیونکہ ان لائبریریوں کے قیام سے کوئی بڑی بڑی لائبریریاں جاری کرنی مقصود نہیں۔ بلکہ محض یہ کہ ہر سکول میں چند کتابوں کا مجموعہ موجود رہنا چاہیئے جو کسی ماسٹر کی زیر نگرانی طلبا ء اسکول میں عاریتاً تقسیم ہوتی رہیں۔ اس کے لئے فرض کر لیجئے کہ ہر سکول میں دو سو سے تین سو تک کتابیں اس مطلب کے لئے کافی ہونگی۔ اور اگر ان کی قیمت اوسطاً دو روپیہ فی کتاب بھی رکھی جائے تو کل تین سو کتاب کا خرچ چھ سو روپیہ ہوا۔ اس کے لئے تین چار الماریوں کی ضرورت ہوگی۔ جن کا کل خرچ دو ڈھائی سو سمجھ لیجئے۔ کل ۸۰۰۔ شروع شروع میں ان کتابوں کا کیٹلاگ وغیرہ تیار کرنے میں کچھ صرفہ اور اٹھانا ہوگا۔ چنانچہ اس قسم کے ابتدائی اخراجات کو ملا کر قریب ہزار بارہ سو روپیہ میں تین سو کتابوں کی ایک لائبریری ہر ایک اسکول کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہے۔ یہ اتنی بڑی رقم نہیں۔ جس کے واسطے ہمیں کوئی فنڈ قائم کرنا پڑے یا چندہ جمع کرنے کی ضرورت ہو۔ بلکہ ہر ایک اسکول کو جو لائبریری کی اہمیت کا قائل ہو۔ اس کا انتظام اپنے طور پر کرنا چاہیئے۔ لائبریری کی نگرانی ایک استاد کے سپرد ہونی چاہیئے اور ہر ایک جماعت میں تقسیم کتب کا کام ایک ایک استاد کے سپرد کر دینا چاہیئے جو لائبریری میں سے ایسی کتابیں چھانٹ کرے آوے جو وہ اپنے طلباء کے لئے مناسب سمجھتا ہو۔ ان کتابوں کو وہ خود مختلف طلبا میں ان کی حسب لیاقت و رجحان طبیعت مطالعہ کے لئے تقسیم کرے اور بعض اوقات لڑکوں کو موقع دے کہ وہ بجائے خود کل مجموعہ کتب میں سے اپنے لئے کسی کتاب کا انتخاب کریں۔ اور استاد دیکھے کہ وہ انتخاب مناسب ہے۔ بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ جماعت کے چیدہ چیدہ لڑکوں کو جنھوں نے اس قسم کے مطالعہ میں کچھ ذہانت دکھائی ہو۔ اپنے ہمراہ لے جاکر اسکول لائبریری دکھائے اور پھر انھیں موقع دے کہ وہ وہاں سے اپنے لئے کتابیں انتخاب کریں۔ اس طرح ان کا نظریہ نہ صرف وسیع ہوتا جائے گا۔ بلکہ ان میں شوق مطالعہ بھی بڑھتا جائے گا۔ اس تجویز پر شاید یہ اعتراض ہو کہ یہ ذخیرہ کتب تو مستقل ہوگیا۔ اور اس طرح ہم ہمیشہ پرانی اور فرسودہ کتابیں اپنے طلبا کو دے سکیں گے۔ لیکن اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا۔ کہ اول تو اگر آپ کے ذرائع آمدنی اس بات

کی اجازت دیں تو آپ شوق سے اپنے ذخیرۂ کتب میں اضافہ کریں۔ بلکہ وقتاً فوقتاً ضرور کریں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی خیال کرلیں کہ لائبریری کی ہر کتاب ہر لڑکے کے مطالعہ کے لائق نہ ہوگی۔ دوسرے جوں جوں طالبعلم ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی کرتے جاویں گے۔ اُن کے لیئے نئی کتب خود بخود مہیا ہوتی جاویں گی۔ یا اس بات کو یوں کہیئے۔ کہ ایک اسکول میں ہمیشہ وہی لڑکے نہیں رہتے۔ بلکہ بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ہر آنے والے لڑکے کے لیئے وہی کتابیں نئی ہونگی۔

اس سکیم کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ کہ جہاں ہر ایک سکول اپنے لیئے علیحدہ علیحدہ لائبریری قایم نہ کرسکے یا اگر سرکاری مدارس میں یہ بات پسند نہ کی جاوے۔ تو علاقہ کے چند سکول مل کر یا ڈویژن کے کل اسکولوں کے واسطے ایک مرکزی لائبریری قایم کردی جاوے جہاں سے مختلف سکولوں میں تھوڑی تھوڑی کتابیں بھیجی جاویں۔ اور پھر سال بھر کے بعد جب وہ کتب مرکزی کتب خانہ میں ضروری مرمت یا ازسرِ نو جلدبندی کے لیئے آویں تو اُس وقت ہر ایک سکول کو واپس کردہ کتابوں کے بدلے اور کتابیں بھیجدی جاویں۔ اور اس طرح ہر سال کے بعد ہر سکول کا ذخیرہ بدلتا رہے۔ حتیٰ کہ یہ دور ایک دفعہ ختم ہو جاوے مثال کے لیئے آپ سمجھ لیں۔ کہ ایک ڈویژن یا سرکل میں دس مدارس ہیں۔ اور ہر ایک مدرسہ کو دو سو کتب ایک وقت میں بھیجی جاویں۔ تو کل دو ہزار کتب درکار ہونگی۔ اور جیسا اوپر بتایا گیا ہے۔ جب ہر سال نیا مجموعہ کتب ایک سکول کو بھیجا جاویگا تو یہ تمام کتب ایک سکول کو دس سال کے لیئے کافی ہونگی۔ یعنی پھر گیارہویں سال اس سکول کو وہی کتابیں دینی پڑینگی۔ جو دس سال پہلے بھیجی گئی تھیں۔ لیکن اس عرصہ میں اس اسکیم میں تمام نئے طلبا آجائیں گے۔ یہ تجویز پہلی تجویز کی نسبت زیادہ ذخیرہ بہم پہنچائے گی۔ اور جہاں سرکل کے سکولوں کا سوال درپیش ہو۔ وہاں یہی زیادہ کارآمد بھی ہوگی۔

اس ذکر کے بعد ہم کچھ بیان ممالک غیر کی سکول لائبریری[1] System کا کریں گے۔ امریکہ کی پبلک لائبریریوں میں استادوں کے لیئے خاص رعایت رکھی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ بھی اس قسم کے زائد مطالعہ کے ذریعے سے اپنا علم اور بڑھا سکیں۔ اس وجہ سے انھیں مقررہ تعداد سے زیادہ کتابیں عارتیاً حاصل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ بعض لائبریریوں میں استادوں کے لیئے خاص لائبریریاں قائم کردی جایا کریں اس کے علاوہ بعض اور میں لائبریری کی چابیاں استادوں کے پاس بھی رہتی ہیں کہ وہ جیسا اور جس وقت چاہیں لائبریری سے استفادہ حاصل کریں۔ امریکہ کی اس ترقی کو دیکھکر اہل انگلستان خود اپنے ہاتھ کے انتظامات سے خوش نہیں اور وہاں اس امر کی کوشش ہے کہ نہ صرف ہر سکول کے ساتھ اپنی لائبریری ہو بلکہ اس کے لئے علیحدہ لائبریرین اور کمرہ بھی ہو۔ کیونکہ وہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جس کا کام اسی کو ساجھے

[1] نظام

ہمارے ملک کی طرح نہیں۔ کہ جس کو چاہیں کسی جگہ پر لگا دیں اور اسے اس کا اہل سمجھ لیں۔ ابھی چند روز ہوئے میں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ لاہور میں ایک ہندو مخیر نے ایک لائبریری قائم کی ہے اور اس کے لائبریرین کے واسطے کوئی ایم اے ستر روپیہ ماہوار پر جس کی انتہائی تنخواہ سو روپیہ ہوگی۔ بذریعہ اشتہار مانگا تھا۔ مانا کہ ایک ایم اے علم کا ایک خاص درجہ حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ لازم نہیں آتا کہ جس طرح ایک سویلین ڈاکخانہ کا پوسٹ ماسٹر جنرل بن سکتا ہے۔ عدالت کا جج ہو سکتا ہے حاکم ضلع بن سکتا ہے۔ اکونٹنٹ جنرل بن سکتا ہے۔ دفتر کا افسر اعلیٰ ہو سکتا ہے اور خدا جانے کیا کچھ بن سکتا ہے۔ اسی طرح ایک ایم اے بھی ہر کام چلا سکتا ہے۔ ہاں اگر ایم اے پاس لائبریری کے شعبہ کی خاص تعلیم حاصل کر لے اور پھر اسے کسی لائبریری کا انچارج کر دیجئے۔ تو پھر البتہ اس کا لائبریرین بننا کچھ معنی رکھتا ہے۔ خیر۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔

انگلستان میں مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی رائج ہے کہ استاد کو لائبریری میں سے مختلف طلبا کے نام کے ٹکٹ مل جاتے ہیں اور ان کی بنا پر وہ لائبریری سے چند کتب لے جا کر لڑکوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس طرح ہر کتاب تین ماہ تک اسکول میں رہ سکتی ہے۔ لیکن یہ ایسا طریقہ ہے کہ اگر ہم اس پر کاربند ہونا چاہیں۔ تو جو بھی بڑی بھلی پبلک لائبریریاں یہاں ہیں۔ ان میں یا یونیورسٹی لائبریری میں ایسا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے جو سکول کے طلبا کے مفید مطلب ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی استادوں میں بھی یہ روح ہونی چاہیئے۔ کہ وہ اپنا فرض محض اس بات کو نہ سمجھیں۔ کہ جماعت میں آن کر سبق پڑھا دیا اور بس۔ بلکہ یہ کہ لائبریری سے شاگردوں کے لئے کتابیں لائیں اور خود بھی مطالعہ کریں تاکہ دیکھتے رہیں کہ طلبا کے لئے کون سی کتابیں مفید ہیں۔ بعض اور جگہ استاد کو بغیر ان ٹکٹوں کے جتنی کتابیں وہ چاہے اسے دے دی جاتی ہیں اور ان کی تقسیم اس کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے لیکن ماہرین کی رائے میں یہ طریقے پورا پورا فائدہ نہیں دیتے اور ضرورت ہے کہ ہر سکول کے ساتھ اس کی علیحدہ لائبریری ہو۔

اس بیان کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم تھوڑا سا بیان اس بات کا بھی کریں کہ سکول لائبریری کا رکھ رکھاؤ کن طریقوں پر ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلا سوال انتخاب کتب کا ہے اس کی بنا تین باتوں پر ہے: مانگ۔ ذرائع۔ اور جگہ یعنی جہاں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ عموماً کس قسم کی کتابیں مانگی جاتی ہیں۔ وہاں یہ بھی خیال رہے کہ بعض اوقات یہ مانگ عارضی بھی ہوتی ہے۔ اس واسطے ہر وہ کتاب جو مانگی جائے ضروری نہیں کہ مہیا بھی کی جا دے۔

دوسرا سوال سرمایہ کا ہے۔ تمام کی تمام آمدنی یک دم نہ خرچ کردینی چاہیئے اور تیسرے اتنی کتابیں خریدی جائیں جن کے لئے جگہ مہیا ہوسکے۔ کتابوں کی ظاہری صورت کا بھی خیال رہنا چاہیئے۔ کہ عمدہ چھاپہ۔ نفیس کاغذ اور مضبوط جلد کی کتابیں خریدی جائیں۔ عطیہ جات کے قبول کرنے میں احتیاط برتنی لازم ہے۔ ہر وہ کتاب جو معطی پیش کرے۔ اس قابل نہیں ہوسکتی کہ ضرور لائبریری میں رکھی جائے۔ عطیہ کے پیش ہونے پر انتخاب کرلینا بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کل کتابیں حاصل کرکے ان میں سے بعض ردی کردی جائیں غیر ممالک میں انتخاب کتب کے کام کے لئے بہت سی مدد ایسی تالیفات سے مل جاتی ہے جیسے

Stevenson's A child's Bookshelf

Catalogues of 1000, 2000 or 3000 books for children

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا۔ کہ جہاں ابھی ہم نے بسم اللہ بھی نہیں کی اور جگہ کیا کچھ کیا جاچکا ہے۔

اس کے بعد کلاسیفیکیشن[1] اور کیٹلاگنگ[2] کی باری آتی ہے۔ کلاسیفکیشن کسی مسلمہ اسکیم کے مطابق کرنا زیادہ انسب ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کوئی اپنی سکیم بنائی جائے۔ اسی طرح کیٹلاگ میں بھی کسی کوڈ کی رہنمائی بہتر ہے۔ سکول لائبریریز میں اندراجات کیٹلاگ کو آسان اور زود فہم بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے کتابوں کی عاریت دینے کی یادداشت ہمارے ہاں عموماً رجسٹروں میں ہوتی ہے۔ مگر دوسری جگہ یہ کام بھی کارڈوں سے لیا گیا ہے۔ چونکہ اس کام کا تعلق محض اسکول لائبریریوں سے مخصوص نہیں۔ لہذا اس کا مفصل بیان کسی دوسری جگہ کیا جاوے گا۔ لیکن امریکہ کا

Newark Charging system

جو ہمارے ہاں لٹن لائبریری میں رائج ہے۔ نہایت سادا اور آسان ہے۔

کالج اور یونیورسٹی لائبریری

لائبریریز کی دوسری قسم کالج اور یونیورسٹی لائبریریاں ہیں۔ یہ لائبریریاں پبلک لائبریریز سے محض اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان کا تعلق ایک خاص طبقہ سے ہوتا ہے اور ان ہی کے استعمال کے لئے یہ قائم کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پبلک لائبریری کے مقابلہ میں اس کا ذخیرہ محدود اور چیدہ قسم کا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آرٹس کالج کی لائبریری میں تمام ان کتب کی ضرورت نہ ہوگی جو ایک پبلک لائبریری کے لئے ضروری ہیں جیسے قانون اور انجنیرنگ یا صنعت اور تجارت وحرفت کی کتابیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی کالج لائبریری

---

[1] قسم وار کرنا [2] درج فہرست کرنا۔

کی وسعت کی حد مقرر کرنا بھی آسان نہیں۔ ہاں جب ایک شہر میں ایک ہی کالج ہو۔ جیسا عموماً یہاں رواج ہے تو پھر کالج لائبریری کی وسعت کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ہوگا۔ لیکن جہاں دو چار کالج ہوں۔ وہاں مناسب ہوگا۔ کہ ان میں سے ہر ایک کالج ایک ایک یا دو دو مضامین میں[1] Specialize کرے اور آپس میں ایک دوسرے کالج سے کتاب حاصل کرنے کی اجازت ہو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے مختلف کالج پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ البتہ یونیورسٹی لائبریری کا ایک اہم فرض یونیورسٹی کی تمام ضروریات کا نہ صرف مدنظر رکھنا بلکہ ان کو ایک بڑی حد تک پورا کرنا بھی ہے۔ اس صورت میں عام استعمال کی کتابیں ہر کالج بجائے خود جمع کر سکتا ہے۔ لیکن اعلیٰ اور قیمتی کتابوں اور[2]

Scientific periodicals

کا جمع کرنا جو ریسرچ کے کام کے واسطے مفید ہوں۔ یونیورسٹی کا کام ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے لئے ان کی ضرورت کی کتابیں مہیا کرنا یونیورسٹی کا فرض ہونا چاہیئے۔ ان دونوں جگہ کلاسیفکیشن اور کیٹالاگنگ کے وہی طریقے ہونگے۔ جو پبلک لائبریریوں میں رائج ہیں۔ ہاں اسکول کی نسبت کلاسیفکیشن زیادہ دقیق اور باریک ہوگی کہ اگر اسکول میں تین درجہ استعمال کئے جائیں۔ تو یہاں Decimal کے بعد بھی تین چار دفعہ تک کلاسیفکیشن جانی چاہیئے۔ کیٹلاگ میں سبجکٹ اور Analytic کارڈز ضروری ہونے چاہئیں۔

ریڈنگ روم اس کے علاوہ ایک ضروری جزو ریڈنگ روم ہے جو پھر دو قسم کا ہوگا۔ ایک تو وہ جہاں محض اخبارات اور رسائل مہیا کئے جائیں۔ دوسرے جہاں کتب کا مطالعہ کیا جا سکے۔ یہ دونوں جگہیں ایک دوسرے سے الگ ہونی چاہئیں اور خصوصیت سے آمد و رفت والی جگہ سے دور۔ تاکہ مطالعہ کرنے والے احباب اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو سکیں۔ اس کمرے میں ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی میز اور کرسی کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اخبارات کے کمرے میں رسائل کے لئے[3] Periodicals Rack اور اخبارات کے لئے[4] Stands ہونے چاہئیں اور کمرے کے وسط میں بڑی میز یا میزیں۔ جہاں شائقین بیٹھکر رسائل دیکھ سکیں۔ اخبارات ان کی جگہ پر ہی دیکھے جائیں گے۔ یونیورسٹی لائبریری کی ایک شاخ[5] Reference Library ہے۔ جہاں ایک کمرے میں کل اس قسم کی کتابیں جیسے[6] Dictionaries اور Encyclopaedias وغیرہ اس قسم کی کتابیں جو محض کسی خاص بات کے معلوم کرنے کے لئے استعمال کی جائیں نہ کہ ایک سرے

---

[1] مخصوص کرنے [2] رسائل جات سائنس [3] الماریاں [4] اونچی میزیں [5] حوالہ کی لائبریریاں [6] قاموس و لغت

سے دوسرے سرے تک پڑھنے کے لئے جمع کردینی چاہئیں۔ یہ کتابیں اپنی جگہ پر ہی استعمال ہونی چاہئیں
اور لائبریری سے باہر سوائے خاص صورت یا اشد ضرورت کے نہ جانے دی جائیں۔ اسی سے ملتی جلتی شاخ
لائبریری کی ایک اور بھی ہے جسے[1] Quick Reference Deptt.
کہتے ہیں۔ اور جو عام طور پر پبلک لائبریریز کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے۔ اس میں[2]
Directories, Yearbooks; Codes ; Dictionaries ; Railway Time Tables.
یا اسی قسم کی چیزیں رکھی جاتی ہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو محض کوئی چھوٹی سی بات جیسے
کسی جگہ کی آبادی، کسی فرم کا پتا، کسی لفظ کا سپیلنگ وغیرہ معلوم کرنا ہو۔ تو وہ فوراً مقررہ کمرے میں
جاکر بغیر لائبریرین کی مدد یا اجازت کے اپنا مطلب حل کرسکے۔ اس کام کے لئے اسے کتاب منگوانے یا
اس کے بدلے رسید دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض بڑی بڑی لائبریریوں میں یہ کام ٹیلیفون پر بھی
کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ مستفسر اس کمرے کے انچارج کو ٹیلیفون پر پوچھ سکتا ہے کہ فلاں کمپنی کا تار کا
پتا کیا ہے۔ تو اسسٹنٹ فوراً مطلوبہ انفارمیشن[3] نکال کر ٹیلیفون پر بتا دے گا۔

جائے وقوع وسامان

لائبریری عموماً خاموش جگہ میں ہونی چاہئے۔ جہاں قدرتی روشنی کافی مقدار میں حاصل ہوسکے اور ہوا بھی کافی طور پر کمرے میں پھر سکے۔ اگر
ممکن ہو۔ تو ایک دروازہ داخلہ کا اور دوسرا باہر جانے کا ہونا چاہئے۔ ورنہ عموماً ایک ہی دروازہ
بہتر ہوتا ہے۔ سامان میں الماریوں کی اونچائی ، فٹ سے زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ اسکولوں میں یہ ۵ فٹ
ہوگی تاکہ شائقین سب سے اوپر والے خانے میں سے بھی کتابیں بآسانی نکال سکیں۔ اس مطلب کے لئے[4]
Paper shelf system کا رواج ہونا چاہئے۔ یعنی الماریاں بغیر دروازوں
کے ہوں اور شائقین کو اجازت ہو۔ کہ وہ الماریوں کے پاس جاکر خود کتابیں نکال سکیں۔ یہ طریقہ اب
قریب قریب ہر لائبریری میں مروّج ہے۔

Delivery stations.

لائبریری کی ان اقسام کا تعلق خاص طور پر تعلیمی (Institutions) سے ہے
لیکن چونکہ لائبریری کا خود اپنا مفہوم بھی تو تعلیم دینا ہے۔ لہذا اس سلسلہ میں جو کام ممالک غیر میں ہو رہا ہے
اس کی مختصر کیفیت بھی بتا دینی غیر موزوں نہ ہوگی: چنانچہ سب سے اول ہم ڈلیوری سٹیشن کا ذکر کرتے
ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی جگہوں میں جہاں الگ لائبریری کا قیام ممکن نہ ہو۔ ڈلیوری سٹیشن قائم کردیتے

---

[1] فوری حوالہ کا شعبہ [2] لغت کی کتابیں، سالنامے اور ریل کے ٹائم ٹیبل اور اصطلاحات [3] معلومات [4] کھلی الماریوں [5] مفاد

جاتے ہیں۔ یہ انتظام ڈاک خانہ، پولس کے تھانہ، اسکول یا بعض اوقات کسی دکاندار کے ذریعے کیا جاتا ہے اس کا مدعا صرف اتنا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے حضرات اپنی ضروریات لکھکر اسٹیشن پر دے آتے ہیں۔ جہاں سے وہ پرچے سنٹرل لائبریری میں کتابیں منگوانے کے لئے بھیجدیے جاتے ہیں اور جب کتابیں وصول ہوں یا کوئی جواب آجائے تو شائقین پھر اسٹیشن پر سے لے حاصل کرسکتے ہیں۔ اس اصول کو بعض نقائص کی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہمارے جیسے ملک میں اگر شہروں میں بھی یہ انتظام ہوسکے تو مفید ہوگا

Travelling Libraries } دوسری صورت ٹریولنگ لائبریریز کی ہے U. S. A میں اس کا رواج زیادہ ہے اس انتظام کے ماتحت کتابوں کے چند صندوق جن میں سے ہر ایک میں پچاس یا کچھ زیادہ کتابیں ہوتی ہیں مقررہ جگہوں پر سنٹرل لائبریری سے بھیجدیے جاتے ہیں۔ جہاں مطالعہ کے شائقین ان گران کتابوں میں سے حسب منشا کتابیں لے جاتے ہیں یہ کام بعض اوقات والنٹیر اشخاص کے سپرد ہوتا ہے۔ کہ وہ کتابوں کے صندوق وصول کرکے کتابیں بانٹ دیں اور پھر واپس جمع کرلیں۔ بعض اوقات تھوڑے سے معاوضہ پر بھی کوئی شخص یہ کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے U. S. A میں نیویارک اور Wisconsin میں اس طریقہ کا چرچہ زیادہ ہے لیکن انگلستان میں بھی Carnegie U.K. Trust کی امداد سے اس بارے میں کافی شوق پیدا ہوتا جاتا ہے اور اس قسم کے سنٹر فی الحال Dorset, Staffordshire, Warwickshire, Wiltshire, Cumberland اور Westmorland میں قائم ہوگئے ہیں۔ ان جگہوں میں زیادہ تر پادری یا اسکول ٹیچر والنٹیر بن کر اس کام کو انجام دیتے ہیں ہمارے ہاں ان باتوں کا تو کیا ذکر کیونکہ ابھی یہاں تعلیم بھی عام نہیں۔ لیکن اگر بجائے قصبات کے یہاں شہروں کے لئے ایسی لائبریریاں قائم ہوجائیں تو ان کے مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔

Rural Libraries | تیسری صورت Rural یا قصباتی لائبریریوں کی ہے۔ فی الحال یہ لائبریریاں زیادہ تر پرائیوٹ فیاضی پر منحصر ہیں لیکن پھر بھی بعض جگہوں میں ان کے متعلق نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ اس اسکیم کے مطابق کتابیں صندوق میں بھر کر چیدہ چیدہ قصبوں میں بھیجی جاتی ہیں اور سال میں دو یا تین دفعہ ان کا تبادلہ ہوجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں کارنیگی کی فیاضی نے پھر انگریزی قصباتی لائبریریوں کی دستگیری کے لئے قدم بڑھایا ہے اور اس قسم کا پہلا ٹرسٹ شمالی اسکاٹ لینڈ میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل بوجہ خوف طوالت چھوڑدی جاتی ہے۔

Branch Libraries[1] — چوتھی قسم برانچ لائبریریز کی ہے۔ جہاں اپنا ذخیرہ کتب موجود ہوتا ہے کتابیں وہاں سے عاریتاً دی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ایک ریڈنگ روم بھی مہیا کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی ریفرنس ڈیپارٹمنٹ نہیں ہوتا۔ برانچ لائبریریز کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ مرکزی لائبریری سے فاصلہ پر کے لوگوں کو وہیں بیٹھے ہوئے کتابیں عاریتاً مل سکیں۔ بلکہ ساتھ ہی مرکزی لائبریری پر سے کام کا بوجھ ہلکا کرنا بھی مدنظر ہوتا ہے۔ برانچ لائبریری کو چھوٹے پیمانے پر ایک باقاعدہ لائبریری سمجھنا چاہیئے۔ جہاں اس کا اپنا ذخیرہ کتب موجود ہوتا ہے۔ بخلاف Delivery stations[2] وغیرہ کے۔ جہاں کتابیں دوسری جگہ سے منگوا کر مہیا کی جاتی ہیں اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اس قسم کی لائبریریوں کے ساتھ ریفرنس ڈیپارٹمنٹ قائم نہیں کیا جاتا۔ مگر Quick Referenc Deptt کا قیام ضروری ہے۔ برانچ لائبریریوں کے ساتھ بعض صورتوں میں ایک لکچر روم کا ہونا بھی مفید ثابت ہوا ہے اور ان کے ساتھ Children's Deptt[3] بھی بعض جگہ مہیا کئے گئے ہیں۔ مانچسٹر لورپول Croydon برسٹل اور ایڈنبرا کی برانچ لائبریریاں بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

برانچ لائبریریز کے واسطے انتخاب کتب میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ کہ ہر برانچ میں وہی کتابیں نہ ہوں جو دوسری برانچ میں پائی جائیں۔ بلکہ ایک مضمون کی مختلف کتابیں مختلف جگہوں میں پائی جائیں اور شائقین کے کارڈ Interchangeabl[4] ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہر برانچ لائبریری میں کل برانچز کا یونین کیٹلاگ[5] موجود رہتا ہے۔ کہ اگر ضرورت ہو۔ اور کوئی کتاب ایک برانچ میں نہ مل سکے تو دوسری برانچ سے منگوا دی جائے۔ بلکہ شائقین کی سہولت کے لئے تمام برانچ لائبریریوں میں آپس میں ٹیلیفون لگے ہوتے ہیں اور فوراً معلوم کر لیا جاتا ہے کہ مطلوبہ کتاب اس وقت لائبریری میں موجود ہے یا نہیں اور کتاب لینے والا شخص انتظار کر سکے تو دوسرے دن کتاب منگوا کر اس کے حوالہ کر دی جاتی ہے Croydon میں کتابوں کا اس طرح کا آپس میں تبادلہ کا کام شہر کی ٹرموے کرتی ہے۔ جس سے کتابیں اور بھی جلد شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔

Children's Deptt — یا بچوں کی لائبریریاں۔ جیسا نام سے ظاہر ہے یہ لائبریریاں محض بچوں کے استعمال کے لئے قائم کی جاتی ہیں۔ اور انہی کے مطلب کی کتابیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ جہاں ہمارے لئے لائبریریوں کے یہ تمام انتظام باعث تعجب ہونگے۔ وہاں اہل انگلستان کو اس بات کا رونا ہے کہ ان کے اپنے ملک میں اس بارے میں وہ ترقی نہیں کی گئی جو امریکہ کو حاصل ہے۔ پھر بھی انگلستان میں بچوں کی پہلی لائبریری ۱۸۸۲ء میں Nottingham میں قائم

[1] شاخ کتب خانہ [2] وہ مقامات جہاں سے کتابیں دی جاتی ہیں [3] بچوں کا محکمہ [4] قابل تبادلہ [5] مرکزی کتب خانے کی فہرست

کی گئی تھی اور اُس وقت سے اب تک ہر ایک بڑی پبلک لائبریری کے ساتھ ایک childrens department[1] کھول دیا گیا ہے۔ ان میں چھ سال سے چودہ سال تک کے بچے جا سکتے ہیں۔ اور جہاں بچوں کی علٰحدہ لائبریریاں قائم ہو گئی ہیں وہاں عام لائبریری کے تینوں حصے یعنی لائبریری خاص۔ ریڈنگ روم اور[2] Study corners برابر موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے استفادہ کے لئے وقتاً فوقتاً[3] Lectures - Story hours اور Reading circles قائم کئے جاتے ہیں۔ انگلستان میں علٰحدہ بچوں کی لائبریریاں اس وقت Cardiff — گلاسگو، لورپول، مانچسٹر، لیڈز اور Chelsea وغیرہ میں ہیں۔ یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ جہاں بچوں کی علٰحدہ لائبریریاں قائم کی گئی ہیں۔ وہاں وہ انہی اصولوں پر کام کرتی ہیں جن پر کہ بڑی لائبریریاں اور عمارت یا سامان وغیرہ میں کسی قسم کی کمی نہیں رکھی جاتی۔ بلکہ ان جگہوں کو ہر طرح دل کش اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اب تک لائبریری کی جتنی اقسام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے سب سوائے سکول کالج اور یونیورسٹی لائبریریوں کے پبلک لائبریری کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس لئے خود پبلک لائبریری کی بابت کچھ نہ کہنا بے انصافی ہو گی۔ امریکہ اور انگلستان میں پبلک لائبریری نہ صرف ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کا قیام قریب لازمی ہے اور برخلاف ہماری پبلک لائبریری کے جہاں سے صرف چند اشخاص اور وہ بھی جو چندہ ادا کریں۔ کتابیں پڑھنے کے واسطے لے سکتے ہیں۔ وہاں ہر ایک شخص جو خاص حد عمر سے تجاوز کر چکا ہو۔ بغیر کسی فیس یا چندہ کے لائبریری کا ممبر ہوتا ہے یا یہ کہئے کہ آبادی کا ہر متنفس خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور جہاں چلڈرن[4] ڈیپارٹمنٹ ہو۔ وہاں ہر بچہ بھی لائبریری کے وجود سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس مدعا کے حصول کے لئے حکومت کی طرف سے وہاں قانون رائج ہے جس کے مطابق ہر ایک شہر اور[5] Parish جو[6] (Library Districts) کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ مجاز ہیں۔ کہ وہاں کی آبادی پر ایک پنس فی پونڈ کے حساب سے ٹیکس وصول کر کے لائبریری کے قیام کا انتظام کرے۔ چنانچہ انہی اصولوں پر انگلستان میں پبلک لائبریریاں قائم ہوتی ہیں۔ لائبریری کی انتظامیہ جماعت کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس آمدنی سے پبلک لائبریری میوزیم۔ سائنس سکول۔ آرٹ گیلری اور آرٹس سکول جاری کرے اور ان تمام صیغہ جات کا انتظام اسی جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ قانون مروجہ کے مطابق قواعد بنانا بھی ان کے اختیار میں ہوتا ہے اور جہاں ایک جگہ کی آبادی اس خرچ کی متحمل نہ ہو سکے وہاں ایک سے زیادہ جگہیں مل کر ایک لائبریری قائم کر سکتی ہیں لیکن قانون صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان جماعتوں کو اختیار دیتا

---

[1] بچوں کا شعبہ [2] مطالعہ کا گوشہ [3] لیکچراروں کے قصہ گوئی کے گھنٹے اور مقامات مطالعہ [4] بچوں کا شعبہ [5] مذہبی حلقہ [6] ضلع کے کتب خانے

ہے۔ کہ خاص شرائط کے ماتحت وہ اس مطلب کے لئے قرضہ حاصل کرکے لائبریری کے لئے زمین خریدیں یا عمارت کھڑی کریں یا لائبریری کو furnish کریں۔

Foreign public Libraries — اسی ضمن میں ممالک غیر کی چند مشہور لائبریریوں کا حال بھی گوش گزار کیا جاتا ہے۔ انگلستان کی سب سے بڑی اور مشہور لائبریری برٹش میوزیم ہے۔ جہاں موجودہ کتابوں کی کل تعداد تیس لاکھ ہے اور اگر ان الماریوں کے خانوں کو جن میں یہ رکھی ہوئی ہیں ایک قطار میں رکھا جائے تو اس قطار کی لمبائی ۴۵ میل ہوگی۔ لیکن اس پر بھی محقق لوگ خوش نظر نہیں آتے۔ کیونکہ اگر اس تعداد کو آبادی پر تقسیم کیا جائے تو ہر شخص کے حصے میں ایک سے قدرے زیادہ کتاب آتی ہے حالانکہ برلن میں رائل لائبریری کے علاوہ دو اور پبلک لائبریریاں ہیں اور پیرس میں Bibliotheque Nationale یا قومی لائبریری کے علاوہ دس اور لائبریریاں ہیں۔ برٹش میوزیم میں سالانہ داخل ہونے والی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جو زیادہ تر کاپی رائٹ ایکٹ کی مدد سے حاصل ہوتی ہیں اسی طرح محض وہ کتابیں جو بطور ریفرنس ریڈنگ روم میں رکھی ہوئی ہیں تعداد میں بیس ہزار ہوتی ہیں۔ حالانکہ ریڈنگ روم کی کل کتابوں کی تعداد ستر ہزار ہے۔ مبادا مذکورہ بالا تعداد کو لائبریری کا کل ذخیرہ سمجھ لیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اورینٹل[1] اور[2] B. M. کا ذخیرہ اس سے علیحدہ ہے۔ اس لائبریری کے متعلق ایک اور بات کا ذکر جہاں دلچسپ ہوگا۔ وہاں اس سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ اس کے امینوں کو اس کی حفاظت کا کہاں تک خیال ہے اور وہ اسے کیسا عزیز رکھتے ہیں۔ یعنی اس لائبریری میں سوائے قدرتی روشنی کے کسی اور قسم کی روشنی کو دخل نہیں۔ اور اسی وجہ سے لائبریری میں بیٹھکر پڑھنے والے اشخاص موسم کے مطابق صرف ایک خاص وقت تک وہاں بیٹھ سکتے ہیں۔

* Oriental Books

لنڈن یونیورسٹی لائبریری میں کل تعداد کتب ساڑھے پانچ لاکھ سے کچھ اوپر ہے۔ انگلستان کی لائبریریوں کے متعلق ۱۹۱۹ء میں وہاں کی لائبریری ایسوسی ایشن نے کچھ اعداد جمع کئے تھے۔ جو اس امر کا اندازہ پیش کرنے کے لئے کہ وہاں لائبریریوں کے متعلق کس قدر فراخ حوصلگی سے کام ہوتا ہے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے کل مالیہ کی تعداد جو ۵۵۸ شہروں سے Library Rate کے نام سے وصول کیا جاتا ہے۔ سات لاکھ دس ہزار پونڈ ہے۔ اور کل کتابوں کی تعداد جو ان لائبریریوں میں موجود ہے۔ ایک کروڑ اور اٹھائیس لاکھ ہوتی ہے۔ جن میں سے قریب آٹھ لاکھ کتاب بچوں کے پڑھنے کے واسطے مخصوص ہیں۔ اس سال میں گیارہ کروڑ اشخاص نے

[1] مرتب [2] قلمی

ریڈنگ روم میں مطالعہ کیا۔ اور چھ کروڑ کتابیں لوگوں کو عاریتاً دی گئیں اوران لوگوں کی تعداد جن کو یہ کتابیں دی گئیں قریب ساڑھے تیئیس لاکھ تھی۔

ہندوستان کے حالات ممالک غیر کی لائبریریوں کے یہ حالات جو کسی صورت میں مفصل اور مکمل نہیں کہلا جا سکتے سننے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہی کہ خود ہمارے ملک میں اس بارے میں کیا ہورہا ہی اور آئندہ کیا ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں اس وقت چند بڑی بڑی لائبریریاں مثل امپریل لائبریری کلکتہ، خدابخش لائبریری بانکے پور، پنجاب پبلک لائبریری لاہور۔ اور Connemara پبلک لائبریری مدراس ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا علم جاتا ہی یہ لائبریریاں بھی ابھی ان معنوں میں جو امریکہ یا انگلستان میں آج کل لفظ لائبریری سے لئے جاتے ہیں، کسی طرح پبلک لائبریری کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس کے بعد ہر ایک یونیورسٹی کے ساتھ ایک بڑی یا چھوٹی لائبریری پائی جاتی ہی ان میں سے اس وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا کام اول نمبر پر شمار ہونے کے قابل ہی۔ جہاں نئے سائنٹفک طریقوں پر لائبریری کو آج سے ۸ سال پہلے از سر نو ترتیب دیا گیا تھا۔ اور اس ضمن میں اس وقت وہاں نوجوانوں کو اس فن کی تعلیم بھی دی جاتی ہی۔ جن میں ہمارے مسلمان بھائی حسب عادت پھر سب سے پیچھے ہیں۔ بعدازاں ہماری مسلم یونیورسٹی لائبریری کا نمبر ہی جسے بھی اسی طریقہ پر[۱] organise کیا گیا ہی۔ گو ابھی اس میں اور بہت سی اصلاحات کی گنجائش ہی۔ تعداد کتب کے لحاظ سے بھی ابھی یہ لائبریری بہت پیچھے ہیں۔ نئی یونیورسٹیوں کے اجرا کے سلسلہ میں یہ خوشی کی بات ہی کہ ان میں لائبریری اور لائبریرین دونوں کے وجود کو ضروری تسلیم کیا گیا ہی اور اس پر ایک حد تک عمل شروع ہوگیا ہی۔ مگر لائبریرین کا کام تا حال کہیں بھی کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کیا گیا جو اس کام میں خاص مہارت رکھتا ہو۔ بلکہ ہر جگہ یہ کام کسی پروفیسر کے سپرد ہی۔ ہمیں پروفیسر کی علمی لیاقت اور تبحر علم کا اقرار ہی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہنے میں تامل نہیں کہ لائبریرین اور پروفیسر کا کام الگ قسم کا ہی مزید براں پروفیسر اس کام کے لئے حسب ضرورت وقت بھی نہیں دے سکتے۔

بڑودہ اس سلسلہ میں ریاست بڑودہ نے اپنے ہاں جو کام لائبریریاں قائم کرنے اور انھیں توسیع دینے میں کیا ہی۔ وہ اس بات کا مستحق ہی کہ اس کا مختصر سا خاکہ سامعین کے سامنے کھینچا جائے خود بڑودہ میں ایک مرکزی لائبریری ہی۔ جہاں قریباً ایک لاکھ کتاب موجود ہی اس کے Lending Department[۲] میں سے ہر ایک شخص کو کتاب حاصل کرنے کا حق حاصل ہی اور اسی طرح شائقین لائبریری میں کتابیں الماریوں میں سے خود نکال سکتے ہیں کتابیں دینے کے لئے امریکہ کا Newarkcharging system

---

[۱] مرتب [۲] صیغہ تقسیم کتب

رائج ہے اور کلاسی فیکیشن[1] کے لئے (Dewey) اور (Expansion) سسٹم
کو ملا کر ایک اسکیم تیار کی گئی ہے۔ لائبریری کے ساتھ ایک ریفرنس ڈیپارٹمنٹ بھی ہے۔ جہاں سے کتابیں باہر
نہیں دی جاتیں۔ ریڈنگ روم میں قریب دو سو کے رسائل و اخبار وصول ہوتے ہیں۔ اسی طرح لائبریری
کے ساتھ ایک[2] (Childrens Department) بھی ہے اور بالکل چھوٹے بچوں کے لئے جو انگریزی
نہیں پڑھ سکتے ایک[3] (Playroom) مہیا کیا گیا ہے۔ اسی کی شاخ کے طور پر ایک اور لائبریری
محض مستورات کے استعمال کے لئے موجود ہے۔ جہاں لیڈی لائبریرین کام کرتی ہے اور وہی بچوں کے
صیغہ کی بھی مہتمم ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۱۱ء سے مفصلات کے لئے بھی لائبریریاں قائم کر دی گئی ہیں۔ اس
اسکیم میں شہر اور گاؤں دونوں شامل ہیں اور اگر گاؤں پچاس اور شہر تین سو سے سات سو روپے تک کی
رقم سالانہ اکٹھی کرے تو اسی قدر رقم دربار سے اور اتنی ہی رقم وہاں کی پرنٹ پنچایت سے حاصل کر کے
علیحدہ لائبریری قائم کر دی جاتی ہے۔ اسی قسم کے قواعد عمارت بنانے کے لئے بھی ہیں اس طریقہ سے
اب تک قریب سات سو بیس لائبریریاں اور ریڈنگ روم قائم ہو چکے ہیں۔ ان لائبریریوں کا انتظام
قصباتی کمیٹیوں کے سپرد ہے اور ان کی دیکھ بھال کا کام انسپکٹروں کے ذمہ۔

اس کام کی ایک اور شاخ[4] (Travelling Libraries) بھی ہے۔ جس کے مطابق
پندرہ سے تیس تک کتابیں ایک صندوق میں بند کر کے لوکل لائبریریوں، سکولوں، کلبوں یا کسی اور
انسٹی ٹیوشن کو بھیجی جاتی ہیں۔ کرایہ ریل ڈیپارٹمنٹ کے ہی ذمہ ہے اور لائبریرین کا کام اعزازی
طور پر انجام پاتا ہے۔ ان صندوقوں میں دو قسم کی کتابیں ہوتی ہیں۔ ایک تو مقررہ اور دوسری حسب ضرورت
منتخب کردہ۔

مسٹر ناگیا کی رپورٹ

ہمارے ہاں کی لائبریریوں کے حال پر کچھ روشنی مسٹر ناگیا لائبریرین میسور
یونیورسٹی کی رپورٹ سے پڑے گی۔ جو انھوں نے ۱۹۱۶ء میں ہندوستان
کی کچھ لائبریریوں کے معائنہ کے بعد لکھی تھی۔ سکول لائبریریز کے متعلق ان کا بیان ہے کہ ہندوستان میں
کہیں بھی ان لائبریریز کا معقول تو کجا معمولی انتظام بھی نہیں۔ نہ ہی اس کی طرف کوئی توجہ کی جاتی ہے۔
سوائے اس کے کہ بعض پرائیویٹ سکولوں مثل پارسی ہائی سکول بمبئی کے ساتھ عمدہ لائبریریاں ہیں۔ ہاں
یوروپین ہائی سکولوں کی لائبریریاں خوب شاندار ہیں۔ ہندوستانی ہائی اسکولوں میں بہت تھوڑی رقم
لائبریری کے کام کے واسطے دی جاتی ہے اور جو ملتی بھی ہے وہ ٹیکسٹ بکس[5] خریدنے میں صرف ہو جاتی ہے
لائبریری کا چارج عموماً سکول کلرک کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن جہاں کہیں ہیڈ ماسٹر یا کسی اور ماسٹر نے

[1] قسم وار کرنا [2] بچوں کا شعبہ [3] کھیل کا کمرہ [4] سفری کتب خانہ [5] کتب نصاب

اس معاملہ میں دلچسپی لی ہے۔ وہاں حالت امید افزا ہے۔ کالج لائبریریوں کا انتظام ان کے مقابلہ میں اعلیٰ ہے اور کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج کی لائبریری کا ذکر انھوں نے خاص طور پر کیا ہے۔ لاہور کے کالجوں کی لائبریریوں کی حالت سے وہ بہت خوش تھے۔ ہندوستانی لائبریریوں میں کلاسیفیکیشن کے لئے انھوں نے بھی Dewey کو پسند کیا ہے اور کیٹلاگ کے لئے کارڈ کیٹلاگ کو۔

اس بیان کے بعد یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ فی زمانہ لائبریریوں کا قیام لابدی ہے اور ان کی موجودگی تعلیم کا ایک ذریعہ ہے لیکن ہمارے ملک کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے۔ ابھی ایک بڑے پیمانہ پر لائبریری موومنٹ کا اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہونا تو کیا بغیر سرکاری امداد کے یہ معمولی طریق پر بھی انجام پزیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک خود گورنمنٹ اس بارے میں کارروائی شروع نہیں کرتی ہم بھی خاموش بیٹھے رہیں۔

لائبریری کانفرنس ۱۹۱۸ء کے شروع میں محکمہ تعلیم۔ گورنمنٹ ہند کی جانب سے لاہور میں ایک لائبریری کانفرنس ہوئی تھی جس میں چند تجاویز بھی پاس کی گئی تھیں جہاں۔

Reference Libraries; Lending Libraries and Travelling Libraries

کا مسئلہ بھی زیر بحث تھا۔ لیکن کچھ نہ معلوم وجوہات کی بنا پر اس معاملہ میں پھر کچھ کارروائی ہوتی دکھائی نہیں دی۔

تجاویز لیکن اگر ہماری ایجوکیشنل کانفرنس اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے جیسا کہ اسے لینا چاہیئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس مفید کام میں کچھ نہ کچھ ترقی نہ کرسکیں۔ اس مطلب کے لئے کانفرنس ایک کمیٹی مقرر کرے جو دیکھے کہ لائبریری موومنٹ فی الحال کن صورتوں میں شروع ہوسکتی ہے۔ اور اس کے لئے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے جس درخواست کے منظور ہونے کی اس وجہ سے بھی کہ تعلیم اب ایک Transferred subject ہے کافی امید ہے۔ کہ سکولوں کے ساتھ لائبریریاں قائم کی جائیں اور اگر بوجہ کمی روپیہ یہ سکیم تمام کی تمام صوبہ میں رائج نہ بھی ہوسکے۔ تو بطور امتحان اسے صوبہ کے کسی تعلیمی ڈویژن یا سرکل میں شروع کردے۔ دوسری صورت اس تجویز کی یہ ہے۔ کہ اگر گورنمنٹ کی طرف سے اس بارے میں کچھ تساہل ہو تو کانفرنس ایک فنڈ قائم کرے۔ اور اس کی مدد سے ہر ایک اسلامیہ سکول کے ساتھ خاص شرائط پر لائبریری کھولنے کا انتظام کرے۔ اس تجویز کو مؤثر بنانے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم پہلے بہت جلد مسلم یونیورسٹی سکول کے ساتھ ایک لائبریری قائم کریں اور اس کے ساتھ انٹرمیڈیٹ کالج میں ایک برانچ لائبریری۔ اس سے

[1] قسم وار کرنے کے لئے [2] حوالہ کی کتابوں اور تقسیم کتب کی لائبریریاں اور سفری کتب خانوں [3] تحریک [4] منتقل شدہ صیغہ۔

یہ بھی فائدہ ہوگا۔ کہ ہم عملی طور پر گورنمنٹ کو دکھا سکیں گے۔ کہ ایسے انسٹیٹیوشنز کا قیام اسکولوں کے لئے کس حد تک مفید ثابت ہوتا ہے۔ تیسری تجویز یہ بھی ہے کہ جس جس صوبہ میں اس وقت کوئی پبلک لائبریری ہے جیسے پنجاب میں پبلک لائبریری لاہور اور صوبجات متحدہ میں لکھنؤ پبلک لائبریری۔ تو ان لائبریریوں کو نئے اصولوں پر از سر نو ترتیب دیا جائے۔ ان کا اسٹاک بڑھایا جائے اور پھر خاص شرائط کے ماتحت صوبہ کے دوسرے ایسے شہروں میں جہاں کوئی لائبریری نہیں۔ وہاں سے کتابیں بھیجنے کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ لوگ بھی لائبریری کے وجود سے مستفید ہوں۔ یہ کام[1] Travelling Libraries کے اصولوں پر ہو سکتا ہے۔ چوتھی تجویز یہ ہے کہ ملک میں ایک یا حسب ضرورت زیادہ[2] Copyright Libraries معرض وجود میں لائی جائیں کیونکہ اب تک شاید کسی لائبریری میں بھی ہندوستان کا کل شائع شدہ لٹریچر نہ مل سکے گا۔ لیکن یہ سب باتیں جب ہی ہو سکتی ہیں کہ ہم عملی کام کرنے کے لئے تیار ہو جائیں جس بات کا اس وقت اچھا موقع ہے۔ کیونکہ ہماری قوم کے فخر صاحب صدر اس تحریک میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں اور بعض صوبوں میں تعلیم کی باگ ڈور اس وقت نہایت قابل اور مضبوط ہاتھوں میں ہے۔

---

[1] سفری کتب خانوں [2] جملہ مطبوعات کے کتب خانے

لیکچر نمبر ۹

مصوّری ونقاشی

مسٹر واسدیو شرما سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

میں اپنے مضمون کو اپنی ہی زبان میں ادا کرونگا تو بھلا معلوم ہوگا۔ اس فن کے سیکھنے میں ایک خصوصیت نہایت اہم ہے۔ یعنی سچائی اور صداقت کا ساتھ دینا ؎

راستی موجب رضائے خدا است کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست؟

اِس شعر کے مفہوم کو جس قدر مصوری اور نقاشی میں پورا کیا جائے تھوڑا ہے۔ کچھ اسی پر منحصر نہیں بلکہ معمولی سے معمولی باتوں میں بھی سچائی ہی وہ توت ہے۔ جو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں انسان کی مشعلِ راہ رہتی ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دراصل خوبصورت نہیں تو مصور کا فرض ہے کہ اس کی رنگت وشباہت کو اصلی پیرایہ میں ظاہر کرے نہ کہ اس کے برعکس تصویر میں اس کا رنگ گورا اور چہرہ خوبصورت بنا دے۔ آدمی جب تک جیے سچائی کی تلاش میں رہے۔ راست گو کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے۔ شعر وسخن میں حقیقت نگاری ہی اونچا مقام ہے۔ پس میرا لیکچر درحقیقت اول سے آخر تک سچائی کی شان دکھانے پر ہوگا۔ مصوری ونقاشی کو ایک مثال محض سمجھیے۔

مغرب میں فنِ مصوری ونقاشی کو محض سچائی اور حقیقت نمائی سے آج وہ درجۂ مقبول ملا ہے کہ دنیا ان کی شاگردی پر فخر کرتی ہے۔ مگر اہلِ مغرب کی اساتذہ کی پشت پر ایک اور زبردست قوت کام کرتی ہے جو ان کی ہنرمندیوں کو اچھال دیتی ہے۔ وہ کیا ہے۔ ملک کے اخبار نویس اور نامہ نگار جو اپنے فن میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اور مصوروں ونقاشوں کے کام کے حسن وقبح دکھا کر باعث شہرت ہوتے ہیں۔

تصویر کے ہر خط وخال نوک پلک اور دیگر خصوصیات کو بھی مصور کے خیالات کا پتہ لگا کر دلکش پیرایہ میں پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور زبردست قوت شعرا کی ہے جن کے جادو بھرے کلام سے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ان باتوں کی طرف توجہ نہیں۔ تیسری قوت جو ہر اہلِ فن کی حوصلہ افزائی کرتی ہے (خصوصاً مصور کا دل بڑھاتی ہے) وہ عوام الناس کی قدر شناسی ولیاقت ہے۔ دراصل نہ صرف مصور بلکہ شاعر۔ ادیب۔ موسیقی کا ماہر یا اور فنونِ لطیفہ کے کاملین۔ تدبیر منازل وتعمیر۔ منبت کاری۔ گلکاری۔ لکڑی اور دھات پر گھدائی کا کام۔ شیشہ آلات۔ ہر طرح کے ڈیزائن اور اختراعات۔ خوشنویسی۔ لیتھو۔ بوقلمونی وغیرہ سب اسی فن کے شعبے ہیں جس کے اساتذہ بغیر اس قدر شناسی کے گویا فی الحقیقت مر جاتے ہیں۔ مگر قدر شناسی کچھ توصیف ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ اصل شئے توجہ ہے۔ خواہ وہ توجہ نقد وتبصرہ کی صورت میں ہو خواہ کھلے اعتراض یا نکتہ چینی کی شکل میں ہو۔ بہرحال اگر کسی اہلِ فن کو یہ مقام نصیب ہو گیا کہ پبلک نے اُس کے کام پر ان میں سے کسی طرح پر توجہ کی تو یہ سمجھو کہ وہ جی اُٹھا۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ایک مرتبہ امریکہ میں ایک ایسی تصویر منظر پر آئی کہ اُسے دیکھنے کے لیے کئی روز تک خلقت کا تانتا بندھا رہا۔ اور ملک کے اخبارات کا یہ عالم تھا کہ تصویر کے ہر خط وخال پر کالم کے کالم سیاہ کرتے تھے۔ دراصل یہ اخبار نویس ہی ہیں جو کسی اہلِ فن کے خیالات کو چاہے وہ نظم ونثر کی صورت میں ہوں یا تصویر۔ مجسمی یا ہیکل کی شکل میں ہوں۔ ترتیب وتسلسل کے ساتھ پبلک کو دکھاتے ہیں کاش ہمارے ملک میں بھی یہ قوت خواب غفلت سے بیدار ہو۔ تاہم مجھے اپنے ملک کے شعرا کا ممنون ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے ہندوستان کی پبلک پر نسبتہً زیادہ احسان کیا۔ پچھلے تین سال کے جہاں آشوب زمانہ میں اپنا سحر آفریں کلام سُنا سُنا کر گویا دور بدل دیا ہے۔ شیخ سعدی نے اپنے کلام میں جو برجستہ تمثیلیں واستعارے بیان فرماتے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ درحقیقت مصور کامل تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے ؎

بامداد آں کہ تفاوت نکند لیل ونہار — خوش بود دامنِ صحرا وتماشائے بہار

؎ تواضع کند ہوشمندِ گزیں — نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

مگر اس طوطیِ شیراز کا کیا کہنا۔ وہ شاعر نہ تھا بلکہ مصور فطرت تھا۔ اس میں وہ بلند فلسفہ پوشیدہ ہے جس کی جیتے جاگتے انسان کے قدم قدم پر ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اسی کے بالمقابل ہمارا حالی بھی کچھ کم پایا نہیں رکھتا۔ وہ بھی انسان کی اُنگلی پکڑ کر زندگی کی راہوں پر گویا خود رہنما بن کر چلتا ہے

حالی ؎

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے — اس میں کی تاخیر اُس نے جسقدر اچھا کیا

کب کیا۔ کیونکر کیا۔ یہ پوچھتا کوئی نہیں   بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا۔ اچھا کیا

مجھ سے زیادہ شاید کسی شخص نے بھی اس نصیحت کی قدر و قیمت نہ کی ہوگی۔ انگلستان میں مجھے اسی نے درجہ قبولیت دلایا۔ جب میں لندن میں فنِ مصوری کا کام سیکھتا تھا تو جس قدر نکتہ چینی اور اصلاح اساتذہ میرے کام پر کرتے تھے میں اس کے مطابق نہایت مستقل مزاجی جانفشانی و دیدہ ریزی سے اپنے کام کو مکمل کرتا تھا۔ کیونکہ حالی صاحب کا مندرجہ بالا شعر میرا ماٹو بنا رہا۔ باوجودیکہ میں ایک غیر ملک کا رہنے والا تھا۔ میری تہذیب۔ معاشرت۔ ذہن اور طرز خیال جداگانہ تھا۔ تو بھی تحصیل فن میں اپنے ہم رتبہ طلباء سے بازی لے گیا۔ اِس بارے میں مفصل ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ فنِ مصوّری کے اس قدر نکتے ہیں کہ میں ان کی تفصیل بیان نہیں کرسکتا۔ اگر موٹی موٹی باتیں بھی بتاؤں تو ایک دفتر چاہیے۔ پھر بھی دو تین مرکزی باتیں بتاؤنگا۔

۱۔ یعنی انسانی شکل کا نقشہ بنانا اور جسم انسانی۔ عضلات استخوانی ڈھانچ کی پوری پوری واقفیت حاصل کرنا ایک بہت بڑا باب ہے جس کی تکمیل میں ہزارہا نکتے ہیں۔

۲۔ کمپوزیشن۔ یعنی مختلف اشکال کی ترکیب و ترتیب ایک اور بڑا باب ہے۔ مثلاً لڑائی کا نظارہ دکھاتا ہے۔ تو اِس مرقعہ میں جس قدر اجزائے ترکیبی ہیں۔ پھر ہر چیز کے اجزا الگ الگ ہیں۔ اُن سب کو اس طرح ترتیب دینا کہ موزونیت کا دامن نہ چھوٹے۔ اصل چیزوں میں جس طرح باہم تناسب ہے وہی تصویر میں بھی قائم رہے۔ یہ کمپوزیشن ہے۔ خیالی تصاویر بھی اسی سلسلہ میں آتی ہیں جن کا اول پنسل سے خاکہ تیار کرتے ہیں۔ یہ اصل چیزوں کی تصویریں نہیں ہوتیں۔ بلکہ محض واقعات۔ حوادث یا کیفیات کے خیالی خاکے ہوتے ہیں۔ اور صرف قوتِ متخیلہ سے پیدا ہو کر متصورہ کی مدد سے صفحہ قرطاس پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس کو حقائق کے مقابلہ پر عالمِ امثال سمجھتے۔ مثلاً امن   غصہ یا دوقت شام کی تصویر بنانے کے ایک فرضی دیوی یا غضبناک آدمی اور ایک عورت کی تصویر بنانا۔

۳۔ کلر سکیم یا رنگ آمیزی۔ یہ فن مصوری کا ایک اور شاندار باب ہے۔ جب تصویر کو لباس پہناتے ہیں تو لباس کا رنگ منتخب کرنے میں بہت بڑے فکر رسا کی ضرورت ہوتی ہے۔ رنگ کچھ زیبائش ہی پہ منحصر نہیں بلکہ قوم کی معاشرت و تہذیب۔ آب و ہوا۔ وقت اور موقعہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستانی تصویروں کے عموماً رنگ زیادہ شوخ ہوتے ہیں۔ کیونکہ گرم ملک ہے۔ دھوپ خوب چمکتی ہے۔ ہر ایک رنگ حد سے زیادہ تیز ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح لباس کی قطع وضع میں قوم کی معاشرت جھلکتی ہے۔ اور مختلف جگہ پر ایک ہی رنگ کے ٹون (یعنی ہلکا و بھاری پن یا پھیکا و گہرا پن) کا خیال کرنا نہایت

ضروری ہے خاصکر جب تصویر کا کچھ حصہ سایہ میں ہے۔ اور دوسرا حصہ تیز روشنی میں ہے۔ یہ نہایت ضروری باب ہے۔ آج کل ولایت میں کئی شہرۂ آفاق اشخاص ہیں جنھوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا ہے پروفیسر فرنیک برینگ وائن پروفیسر گیرلڈ مورا اور پروفیسر ولیم روتھن سٹائن پرنسپل رائل کالج آف آرٹ لندن بہت بڑے ماہر فن ہیں جو مشہور زندہ مصوروں میں شمار کئے جاتے ہیں ان کا کام یورپ اور امریکہ کے میوزیم (عجائب گھر) اور نیشنل گیلریوں میں موجود ہے۔ مہرشی ٹاگور نے اپنی مشہور تصنیف گیتانجلی کا تمدیہ انہی کے نام نامی پر کیا ہے ہندوستان میں بھی یہ فن کبھی درجہ کمال پر تھا۔ آج کل معرض فراموشی میں پڑا ہوا ہے۔

دراصل ڈرائینگ ہر فن و ہنر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے پنسل کا خاکہ تیار کرنا ضروری ہے بعد میں خواہ کپڑے پر۔ لکڑی۔ لوہے۔ مٹی۔ شیشہ۔ وغیرہ کسی پر کام کریں۔ یہ سب فنون کی روح رواں ہے۔ اس کے بعد قابل لیکچرار نے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں دکھائیں۔ جو مختلف اقسام کی پنسل۔ چارکول کرے آن۔ واٹر کلر پاسٹل کلر اور آئل کلر کی بنی ہوئی تھیں جن میں سے پارک کا نظارہ یاترا کا منظر۔ زندگی کی شام۔ ورجن اینڈ چائلڈ (مریم و حضرت عیسیٰ) وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں آخر میں ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم کی بڑی قد آدم روغنی تصویر (آئل پنٹنگ) دکھائی۔ تو ناظرین نے تالیوں سے پرتپاک خیر مقدم کیا اور تصویر کی عمدگی اور خوبصورتی کی ایسی داد دی کہ تمام ہال گونج اٹھا۔

اختتام تقریر پر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مقرر سے پوچھا کہ مغرب اور مشرق کے آرٹ میں کیا فرق ہے۔ اور اس فن (ڈرائنگ و پینٹنگ) کو مدرسوں میں رواج دینے کا بہترین طریقہ کیا ہے مقرر نے جواب دیا کہ یہ بہت پیچیدہ اور وسیع سوال ہے۔ اس امر کے جواب کے لیے مغربی مصنفوں کے علاوہ مسٹر ہاول اور مسٹر کمارسوامی جی کی تصانیف کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ فن مصوری پر مغرب و مشرق کی تہذیب۔ رسم و رواج آب و ہوا۔ پوشاک۔ پیداوار۔ علم ادب۔ نظم و نثر۔ روایات مذہب کا جداگانہ اثر ہوا ہے۔ اگر آپ ان سے واقف ہیں تو فوراً آپ مغرب و مشرق کے آرٹ میں فرق معلوم کر سکتے ہیں۔ البتہ مشرق میں رمنی لے جر اور باریکی و اجزا کی طرف زیادہ رجحان رہا ہے۔ مگر برعکس مغرب میں آئل پنٹنگ اور بہیئت مجموعی بڑی بڑی باتوں پر زور دیا ہے۔ مشرق میں عموماً تصاویر پروفائل (صرف ایک رخی جس میں صرف ایک آنکھ اور ایک کان نظر آئے) کی طرز پر ہیں۔ مگر مغرب میں فرنٹ ویو (جس میں ہر دو آنکھیں یا ایک آنکھ بڑی اور دوسری ذرا فاصلے پر چھوٹی نظر آئے) تصاویر میں دکھلایا ہے۔ مشرق میں رنگ کی اسکیم شوخ مگر مغرب میں مدھم اور دلکش ہے۔

مشرق میں موزونیت (سمٹری) مثلاً روضہ تاج محل آگرہ کے ایک طرف سرخ مسجد ہے۔ تو اس کے جواب کے لیے ویسی ہی عمارت سیمیٹریکل بنانے کے لیے موجود ہے۔ علاوہ اس کے مشرق میں علم نظارہ (پرسپکٹو) کی کمی ہے۔ یعنی موازنہ کا خیال ہمیشہ مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مگر مغرب میں یہ ضروری نہیں۔ یا موجودہ زمانے میں مغرب میں فن مصوری کو کمال پر پہونچانے کے لیے برہنہ عورت و مرد کے زندہ ماڈل سے تعلیم دیجاتی ہے۔ اور اس کو معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس قسم کی باتوں میں خیال کی غایت حد تک شرم و حیا کے جذبہ کو قائم رکھتے ہیں۔ اور مغرب کا اخلاق اسبارے میں بہت بلند ہے۔ مشرق میں پوشاک اور زیور نے جسم انسانی کو اس قدر ڈھانپ رکھا ہے کہ مصور کو سر فن اے ناٹولی کی ضرورت نہیں۔ اور اسی لیے خیالی تصاویر پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ مدرسوں میں اِس فن کو رواج دینا آسان نہیں۔ تاوقتیکہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ افسران اس طرف توجہ نہ کریں اور اس میں خاص طور پر دلچسپی نہ لیں۔ اور عوام اس مضمون کی ضرورت کو خود محسوس نہ کریں۔ اور طلبہ اِس مضمون کی طرف فطرتاً راغب نہ ہوں۔ اُن کی حوصلہ افزائی امداد اور اعلیٰ تعلیم مصوری کا بندوبست کیا جائے تو مدرسوں میں یہ مضمون ہر دلِ عزیز ہو سکتا ہے۔ فقط

۴

لیکچر نمبر ۱۰

طبی معائنہ مدارس و حفظ صحت

ڈاکٹر عبدالحمید صاحب۔ بی ایس سی ایم بی بی ایس لکھنؤ

جناب صدر و معزز حاضرات و حاضرین

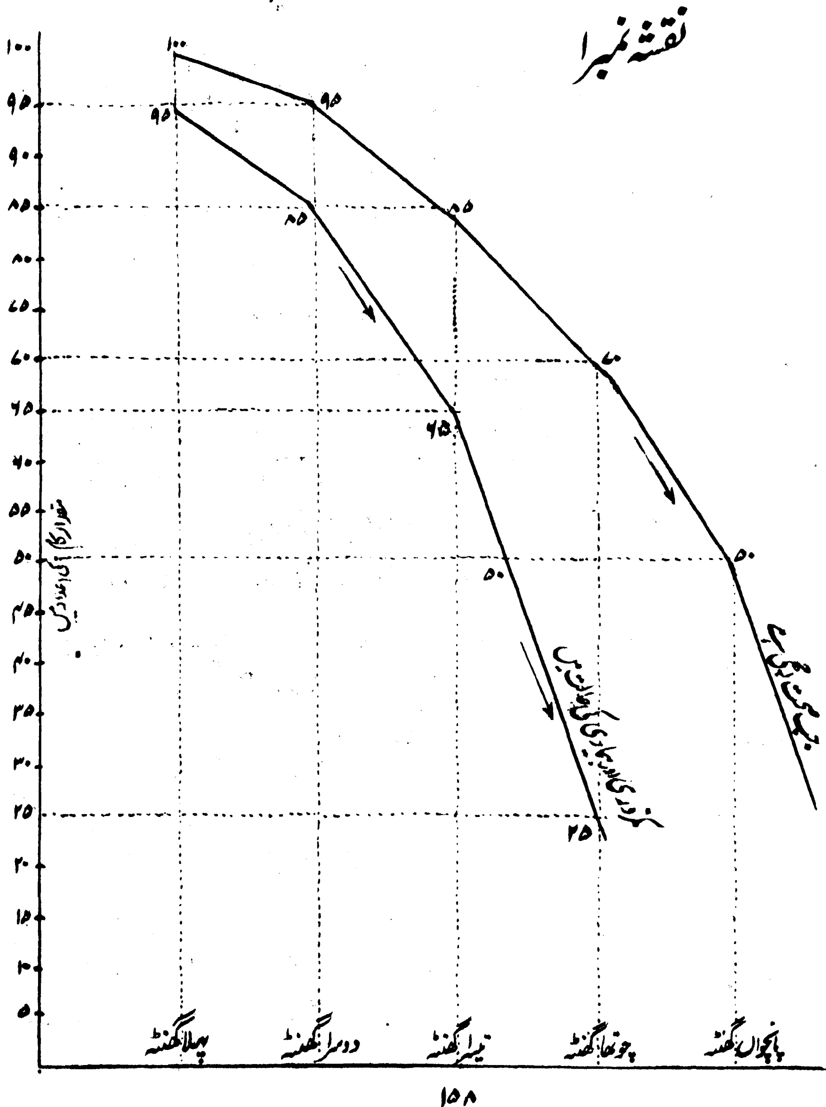
ابتدا

۱۔ مدارس کے طبی معائنہ کی ابتدا ابھی حال ہی سے ہوئی ہے۔ انگلستان و امریکہ کے ممالک میں بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ کام شروع ہوا ہے یعنی بیس یا تیس برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہو۔ انگلستان کا قانون طبی معائنہ کا نفاذ ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ شروع میں یہ کام بہت معمولی طور پر ہو رہا تھا۔ اور اس میں کچھ ایسی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ اتنے میں لڑائی چھڑ گئی اور اس لڑائی سے اس کام کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس کام کا مقصد یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً طلبا کا طبی معائنہ ہوا کرے اور ان کی صحت کی جانچ کی جائے اس کام کی وجہ سے ایسے لوگوں کا معائنہ ہوا جو نشو و نما پا رہے ہیں یعنی وہ لوگ جن میں قوت نمو ہے۔

مزدور پیشہ

۲۔ دوسرا ایک کام اور ہے جو پہلے سے ہو رہا تھا اور اب بھی ہوتا ہے مگر اس کا تعلق اس کام سے بالکل نہیں ہے۔ اس کی غرض یہ ہے کہ مزدور پیشہ لوگوں کے صحت کی جانچ کی جایا کرے اس کا ایک نتیجہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ ننگے پیر کیچڑ یا پانی میں کام کرتے ہیں اکثر ان کی آنتوں میں کیڑے پائے گئے۔ ان کیڑوں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے انڈے تو کیچڑ میں ہوتے ہیں جو پاؤں کی جلد میں بالوں کی جڑ میں گھس کر دوران خون کے ساتھ آنتوں تک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں وہ بڑھتے ہیں۔ ان کی غذا انسان کا خون ہے۔ چنانچہ جس انسان کے جسم میں ان کا دخل ہو گیا پھر اس کا خون برابر چوسا کرتا ہے جس سے وہ کمزور ہو تو یقیناً ہو جاتا ہے۔

اس سے کام پر بہت اثر پڑ جاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ جس وقت مزدوروں کی صحت بہت اچھی ہے اُس وقت پہلے گھنٹہ میں کام کی مقدار سو ہے۔ یہ محض فرضی عدد ہے۔ اور دوسرے گھنٹہ میں ۹۵، تیسرے میں ۸۵ چوتھے میں ۷۰، اور پانچویں میں ۵۰۔ گویا کہ اس حساب سے کام کی مقدار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ مگر جب مزدور علیل ہیں تو اس مقدار میں شروع ہی سے کمی رہے گی اور چند گھنٹوں کے بعد تو کام کی مقدار بالکل ہی کم ہو جائے گی۔ جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے۔



چنانچہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کام میں بے حد نقصان ہو رہا ہے۔ حفظ ما تقدم علاج سے کہیں بہتر ہے سیکڑوں روپیہ اسی کام میں صرف کر دیا گیا کہ مزدوروں کی صحت کا کافی انتظام کیا جائے اور وہ اس طرح کہ اُن کو جوتے عنایت کیے گئے تاکہ اُن کا پیر خشک رہیں۔ یہ انتظار کہ کیڑے جب اپنا قبضہ کر لیں تب علاج شروع ہو خلاف عقل تھا۔ اور اس ترکیب سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ اس کام کی وجہ سے ایسے لوگوں کا معائنہ ہو رہا جو نشو و نما پا چکے ہیں اور جو پا رہے ہیں۔ کیونکہ مزدور پیشہ لوگوں میں لڑکے لڑکیاں اور مرد عورت سب ہی شامل ہیں۔ یہ کام مدارس کے معائنہ سے پہلے شروع ہوا تھا۔

جنگ یورپ

۳۔ اس کے بعد لڑائی کی باری آئی۔ اس لڑائی کی وجہ سے اُن سب لوگوں کے طبّی معائنہ کی ضرورت پڑ گئی جو عمر کے اعتبار سے لڑائی کے قابل تھے یعنی ۱۸ سال سے ۳۵ سال تک کے لوگوں کی جانچ کی گئی۔ اس جانچ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ محض امریکہ میں ۲۵ فی صدی حضرات محنت کے کام کے بالکل قابل ہی نہ تھے اور ۲۵ فی صدی صرف ہلکے قسم کے کام کر سکتے تھے۔

قومی کام

لڑائی کی مشغولیت سے جب فرصت ہوئی اس وقت پتہ چلا کہ ان تین مختلف شعبوں سے قوم کی جسمانی حالت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اس سے تو ہر عمر کے لوگوں کے طبی معائنہ کا موقعہ مل گیا۔ مثلاً امریکہ کے متذکرہ بالا فی صدی نمبروں میں جو خرابیاں تھیں وہ سب شروع کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ہوئیں جو رفتہ رفتہ اثر کر گئیں۔

بچوں کی حالت سے قوم کی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہی بچے بڑھ کر قوم کی آیندہ نسل ہونگے اس کو ملحوظ رکھ کر اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ مدارس کا طبی معائنہ ایک بہت بڑا قومی کام ہے ۱۹۱۷-۱۹ء سنہ میں ایک تعلیمی کمیشن کا تقرر ہوا تھا۔ اس کے رکن تعلیمی امور کے ماہران فن تھے۔ اِن لوگوں نے بہت سا وقت تعلیم اور جسمانی صحت کے مسئلہ پر صرف کیا۔ اس کمیشن کا نام عام طور پر سیڈلر کمیشن تھا۔ جو اظہارات اُنہوں نے جمع کیے اس کا لب لباب یہ تھا کہ عام طور پر ہندوستان کے طلبا میں دماغی و جسمانی صحت کا اجتماع شاذ ہے۔ ان کی رائے میں خراب صحت کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دماغی محنت کی زیادتی
۲۔ گھروں کی ناگفتہ بہ حالت
۳۔ نامناسب غذا
۴۔ ورزش کا معدوم ہونا

وہ لکھتے ہیں کہ بورڈنگ ہاؤس یعنی دارالاقامت میں نہانے وغیرہ کا انتظام عموماً بہت خراب ہے بیماروں کے علاج کا تو کوئی بندوبست ہی نہیں۔ کمروں میں روشنی کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ جہاں بجلی کا انتظام ہے اور ایسی جگہیں شاذ و نادر ہی ہیں طلبا خراب روغنی اور دھوئیں دار لیمپوں سے اپنی بینائی پر خراب

اثر ڈال سکتے ہیں۔ اچھی تندرستی سے جسمانی صحت تو قائم ہی رہتی ہے مگر اس سے دماغی اور اخلاقی حالت پر بھی نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ جگہ اور موقعہ بہت ہے مگر ایسے کام کے لیے ہمت اور انتظام کی ضرورت ہے۔"

یہ امر تو مسلمہ ہے کہ دمڑی کی احتیاط علاج کے سینکڑوں روپیہ سے ہزار درجہ بہتر ہے جب کہ علاج سے فائدہ کا ہونا یقینی امر نہیں ہے۔

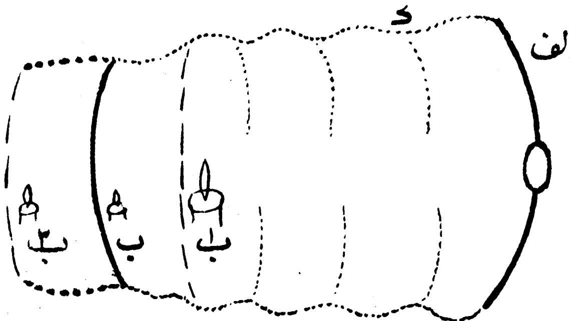
آج میرا ارادہ یہ ہے کہ مدارس کے طبی معائنہ کی اہمیت بیان کروں اور اس تشریح میں حفظ صحت کے چند اصول پر بحث کرکے یہ جتادوں کہ وہ خرابیاں جن کا بچپن میں خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھ کر کیا برے نتائج پیدا کرتی ہیں۔ اور کس طرح ان کی تصحیح ہو سکتی ہے اور کیونکر یہ سب خرابیاں دور کی جا سکتی ہیں۔

کمزوری بصارت

۵۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مدارس میں جو سب سے بڑی اور عام خرابی ہے وہ آنکھوں سے تعلق رکھتی ہے۔ آنریبل جسٹس سر آشوتوش مکر جی صاحب بالقابہ نے جو اٹھارسیڈلر کمیشن تعلیمات میں بیان کیا کہ اُن کے زمانہ میں اچھے طلباء کی پہچان یہ تھی کہ اُن کے عینک چڑھی رہا کرتی تھی اور اُن کی صحت خراب رہتی تھی۔ بینائی کی خرابی ایک اہم خرابی ضرور ہے مگر آپ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اب یہ اتنی عام نہیں رہی۔ بہر حال میں اس کا ذکر پہلے کرونگا۔

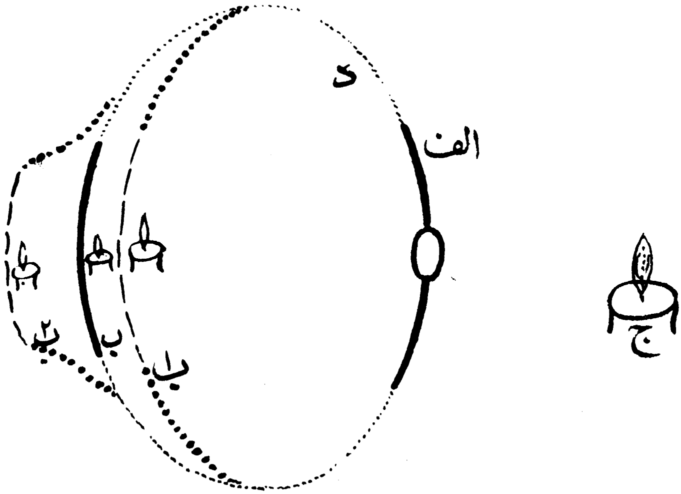
ذیل میں نقشہ نمبر ۲ ہے۔ یہ تصویر اتارنے کا کیمرا ہے۔ الف سامنے کا رُخ ہے۔ ب پشت ہے جس طرف سے مصور موم بتی ج کو دیکھتا ہے۔ کیمرے کے حصہ د کو وہ آگے بڑھاتا ہے یا پیچھے ہٹاتا ہے۔

نقشہ نمبر ۲ تصویر کا کیمرا



۵

نقشہ نمبر ۳ - آنکھ کا ڈھیلا



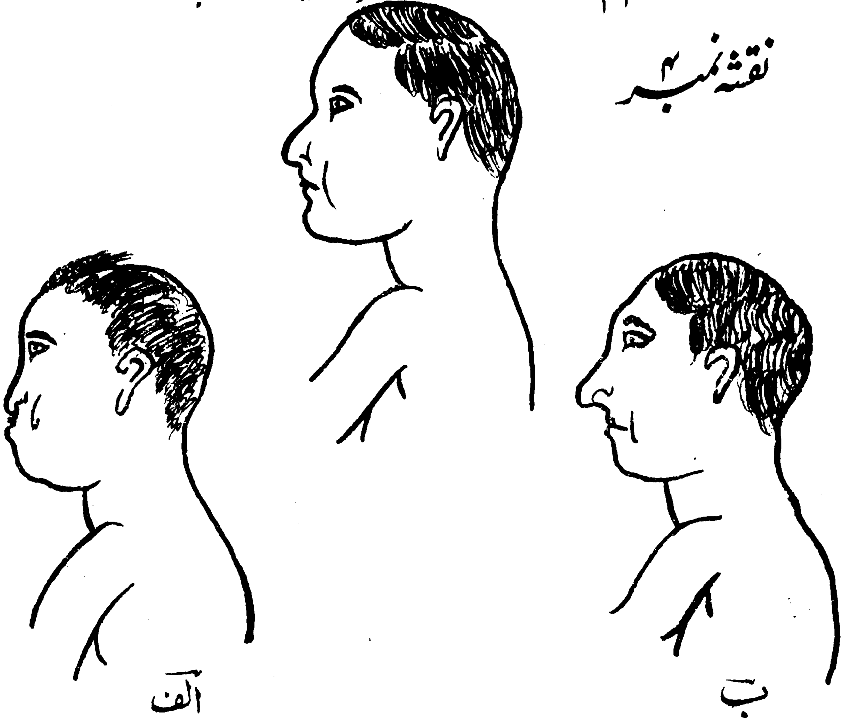
جب کیمرے کی پشت ب تک آجاتی ہے تو موم بتی کی شکل بہت اچھی دکھائی دینے لگتی ہے اور اس جگہ پر مصالحہ کی پلیٹ لگا کر تصویر لے لی جاتی ہے۔ مگر ب۱ آگے لیجانے پر شکل خراب دکھائی دینے لگتی اور ب۲ اور پیچھے لیجانے پر بھی خراب ہوجاتی ہے۔ صرف ایک ہی مقام ب ایسا ہے جہاں موم بتی اچھی نظر آتی ہے۔ اب آپ نقشہ نمبر ۳ دیکھیے یہ آنکھ کا ڈھیلا ہے۔ اس میں اور تصویر کے کیمرے میں صرف اتنا فرق ہے کہ حصہ د گول ہے۔ موم بتی اس وجہ سے نظر آتی ہے کہ اُس کی شکل مقام ب پر بن جاتی ہے۔ جہاں دماغی اعصاب ہیں جن سے احساس ہوتا ہے۔ اب اگر کسی طرح آنکھ کے کیمرے کی پشت مقام ب سے ہٹ کر ب۱ یا ب۲ پر پہنچ جائے تو موم بتی کی شکل خراب نظر آئے گی۔ یعنی بینائی خراب ہوجائے گی۔ دور کی چیز بھی نظر نہ آئے گی ضعف بصارت ہوجائے گا۔ اور اس کیمرے کی پشت اپنی جگہ سے بآسانی ہٹ سکتی ہے۔ اگر آپ حصہ د کو اوپر نیچے سے دبائیے تو ب ہٹ کر ب۲ تک چلا جائیگا اور اگر آگے پیچھے سے دبائیے تو مقام ب ب۱ پر پہنچ جائے گا۔

اعضا کی نرمی

۶- آنکھ کے ڈھیلے میں اس قسم کی تبدیلیاں بآسانی ہوجایا کرتی ہیں - یہ بات اس طرح سمجھ میں آجائے گی۔ شیرخوار بچوں کے اعضا نہایت نرم اور ملائم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہڈیوں میں بھی سختی نہیں ہوتی ہے۔ آپ نے ایسے قصے سنے ہونگے کہ شیرخوار بچے

چلتی ریل سے گر پڑتے ہیں۔ اور اُن کو کوئی ضرب نہیں لگی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کی ہڈیاں ملایم ہوتی ہیں اُن میں لچک ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ٹوٹتی نہیں ہیں۔ بلکہ مُڑ جاتی ہیں جس طرح بید کی چھڑی۔ بچہ کو اُٹھا کر ہڈی سیدھی کر لی جاتی ہے اور کوئی صدمہ نہیں پہونچتا۔

یا دوسری عام فہم مثال لیجیے۔ ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۴۔ یہ ایک نوزائیدہ بچہ کا سر ہے۔ اب اگر



آپ روز اس کی ناک کو دباتے رہیے تو رفتہ رفتہ ناک بدشکل اور چپٹی ہو جائے گی جیسی کہ نقشہ نمبر ۴ الف میں دکھائی گئی ہے۔ اگر روزانہ اس کی خدمت کرتے رہیے اور اس کو کھینچتے رہیے تو رفتہ رفتہ یہ دراز اور خوبصورت بن جائے گی۔ ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۴ ب۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ موم کی ناک کو جس طرف چاہیے موڑ لیجیے یہ تو ایک نہایت ملائم چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سب اعضا شروع میں ملائم رہتے ہیں جو رفتہ رفتہ پختہ ہو کر ۲۵ برس کی عمر تک بالکل سخت ہو جاتے ہیں۔ اور بالکل یہی حالت آنکھ کے ڈھیلے کی ہے۔ اب دیکھیے آنکھ کے ڈھیلے پر کس طرح اثر پڑتا ہے۔

روشنی کی تیزی میں کمی زیادتی

۷۔ فرض کیجیے کہ میرے دوست کا خط غروب آفتاب کے وقت

آتا ہے۔ اندھیرا ہو رہا ہے اس روشنی میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ لیمپ کے آنے میں ابھی عرصہ ہے۔ اس تاریکی میں آپ ملاحظہ کیجیے کہ ایسی کوشش کا بیّن اثر کیا پڑتا ہے۔ مجھ کو زور لگانا ہوتا ہے۔ جس کا اظہار تو پیشانی اور ابرو کے بل ہی سے ہو رہا ہے۔ اسی طرح اگر بچے برابر اپنی آنکھ پر زور ڈالتے رہیں تو آنکھ پر زور پڑتا رہے گا اور چونکہ ان کے ڈھیلے نرم ہیں اس زور کا اثر یہ ہوگا کہ آنکھ پر بیجا دباؤ پڑے گا اور آنکھ کے کیمرا کی بیئت اپنی جگہ سے خواہ مخواہ کھسک جائے گی۔ دو ایک دن میں یہ بات نہیں پیدا ہو سکتی۔ نہ دو ایک ہفتہ میں۔ یہ بات تو دو ایک مہینہ کیا شاید دو ایک سال میں بھی نہ پیدا ہو مگر آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اثر پڑتا رہے گا۔ اور ضرور پڑے گا۔ جس کا احساس اُسی وقت ہوگا جب کہ خرابی بہت بڑھ چکی ہے اور بینائی میں بہت فرق آگیا ہے۔ جس وقت عینک بغیر کام نہیں چل سکتا اور اس سازکے لگانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

جس طرح کم روشنی میں آنکھ پر بُرا اثر پڑتا ہے اسی طرح تیز روشنی کا اثر بھی بُرا پڑتا ہے۔ آفتاب کی طرف دیکھنے سے آنکھ کو چکا چوند ہو جاتی ہے اور آنکھ پر بیجا زور اور دباؤ پڑتا ہے۔ اس سے بھی آنکھ کے ڈھیلے پر اگر وہ ملائم ہے اثر خراب پڑے گا۔

روشنی کی سمت

۸۔ کمرے میں اچھی طرح روشنی آرہی ہے نہ کہ بہت تیز اور نہ بہت کم۔ اور پھر بھی لاعلمی کی یا بے توجہی کی وجہ سے اُس سے بچے فائدہ نہیں اُٹھا ناجانتے جس سے اُن کے ڈھیلے پر بے جا زور پڑتا رہتا ہے۔ فرض کیجیے کہ سامنے کے دروازے سے روشنی کا دخل ہو رہا ہے۔ اگر اس طرف کتاب رکھی جائے گی تو ورق پر روشنی اچھی پڑے گی مگر آنکھوں میں سامنے کی چمک کا اثر ہوگا۔ اور اگر دروازے کی طرف پشت کی جائے تو جسم کا سایہ کاغذ پر پڑ کر سرِ شام کی دھندلی روشنی کا مقابلہ کرنے لگے گا۔ ان دونوں صورتوں میں آنکھوں پر دباؤ یا زور پڑے گا۔ اگر طالب علم اس طرح بیٹھے کہ دروازہ اس کے داہنے جانب ہو تو ورق بھی روشن رہے گا اور آنکھوں میں چمک بھی نہ آئے گی۔ مگر لکھتے وقت ہاتھ کا سایہ صفحہ پر پڑ کر اندھیرا پیدا کر دے گا اور اس طرح آنکھوں پر زور پڑنے لگے گا اور اگر اس طرح بیٹھا جائے کہ بائیں جانب دروازہ پڑے تو کوئی نقصان نہ ہوگا اور لکھتے وقت بھی ہاتھ کا سایہ تحریر کی جانب نہ پڑے گا۔ بشرطیکہ طالب علم بائیں ہتا نہ ہو۔

آنکھ سے کتاب کا فاصلہ

۹۔ ایک صورت اور ہے جس سے آنکھ پر نامناسب طور پر زور پڑا کرتا ہے۔ اور اُس کا مضر اثر ہوتا ہے وہ امر یہ ہے کہ تحریر یا کتاب کا فاصلہ اگر ۱۲ سے ۲۰ انچ کے درمیان نہ رکھا جائے تو آنکھوں پر ضرورت سے زیادہ اثر پڑنے لگتا ہے

اگر چھوٹے حروف ہوں تو کسی قدر قریب رکھنا چاہیے اور اگر بڑے حروف ہوں تو ۱۰ انچ تک لیجا سکتے ہیں اور اسی طرح سلائی کے کام کے متعلق خیال رکھنا چاہیے۔ واضح ہو کہ اِن باتوں کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ اور بچوں کو زیادہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کے ڈیلے ملائم ہوتے ہیں۔

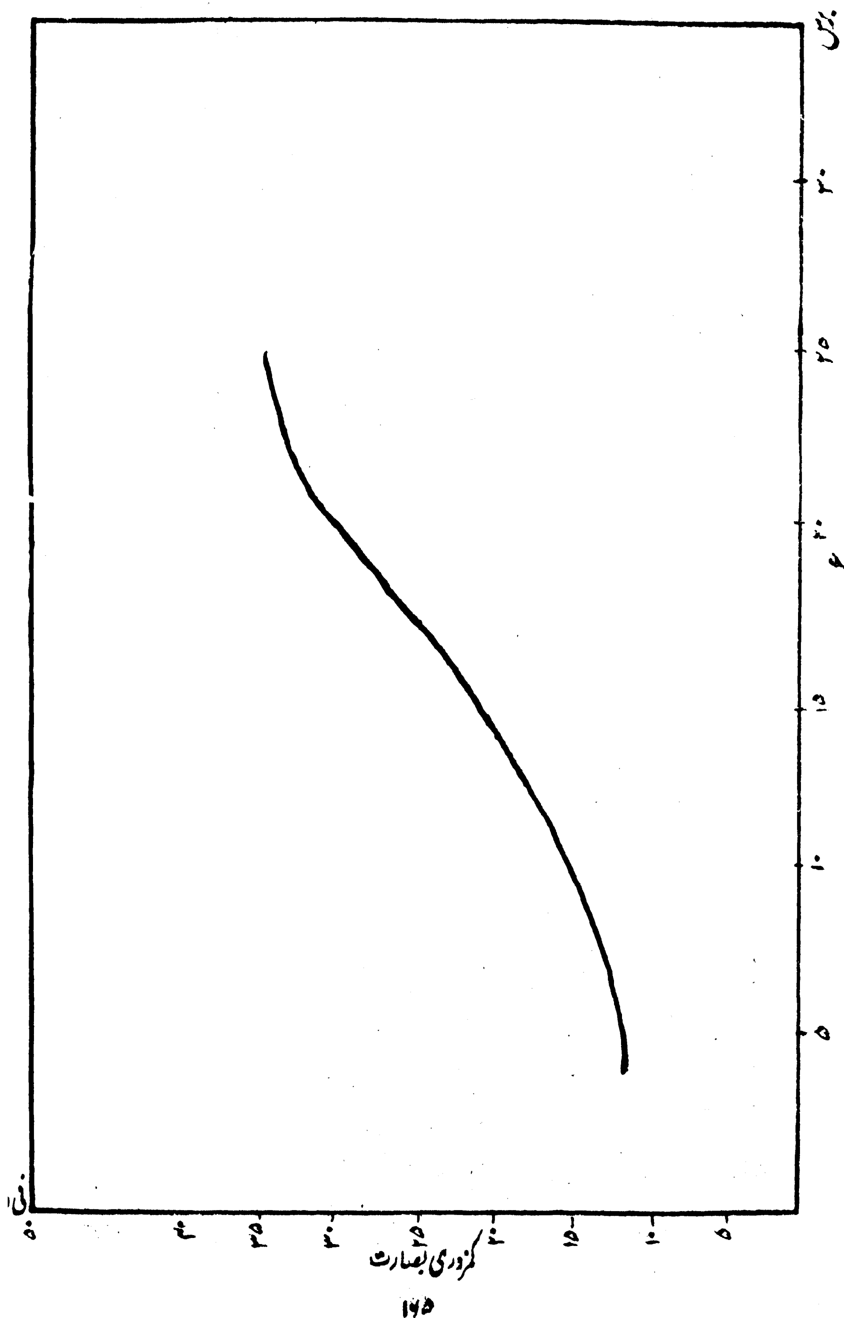
آنکھ پر زور پڑنے کے نتائج

۱۰- ذرا ذرا سا جب اثر ہو اس وقت تو عینک سے کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل سکتا مگر جب بڑھنے لگے اُس وقت عینک بہت ضروری چیز ہو جاتی ہے۔ صوبہ بہار میں کم سے کم دس فی صدی طلبا کی آنکھوں میں نقص پایا گیا ہے اور صوبہ بمبئی خاصکر سندھ و کراچی میں بیس فی صدی کی آنکھیں خراب تھیں۔ یہ اعداد صرف ایسے نقائص کے ہیں جو بہت بڑھ گئے تھے۔ جب یہ کام شروع کیا گیا اس وقت مناسب یہ خیال کیا گیا تھا کہ والدین کہیں بھڑک نہ جائیں اور اسی لیے صرف موٹے موٹے عیوب کی اطلاع اُن کو کی گئی تھی۔ انگلستان میں جس وقت یہ کام شروع کیا گیا تھا تو ایسا اکثر ہوا تھا کہ والدین نے اپنے بچوں کی طبی معائنہ کے دن مدرسہ نہیں بھیجا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ڈاکٹروں کو تو خبط ہوتا ہے ممکن ہے بچہ میں کوئی نقص نکل آئے اور بچہ مدرسہ سے خارج کر دیا جائے۔ حالانکہ یہ کام اس نیت سے نہیں ہوتا ہے۔ اس کی غرض تو یہ ہے کہ بجائے اخراج کے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ طلبا مدرسوں میں رہیں۔ ناقابل کو قابل بنا کر رکھنے کی نیت ہونی چاہیے۔

طبی معائنہ کے نتائج

(۱۱) تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جن مدارس میں اونچی تپائیاں ہیں جن پر بیٹھنے سے پیر زمین پر نہیں ٹکتا اور جہاں نیچی میزیں ہیں جس سے فاصلہ کتاب کا ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے وہاں آنکھوں کے نقص بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بچہ جب شروع شروع میں مدرسہ آتا ہے اُس کی بینائی بہت اچھی ہوتی ہے اور جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اُس کی بینائی میں فرق آتا جاتا ہے۔ چنانچہ اونچے درجوں میں آنکھوں کے نقص زیادہ پائے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۵۔

نقشه نمبر ۵



اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ۱۲ سے ۱۸ برس کی عمر میں آنکھوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ ۲۰ برس کے بعد تعداد فی صدی بہت کم بڑھتی ہے اور اسی طرح ، برس کے قبل کی حالت ہے۔ ۲۰ یا ۲۵ برس تک آنکھوں کے ڈھیلوں میں ایسی سختی آجاتی ہے کہ اب زیادہ اثر پڑنے کی امید نہیں رہتی تجربہ سے معلوم ہوا کہ جن مدارس میں روشنی کا انتظام اچھا نہیں ہوتا وہاں آنکھ کے نقائص کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بہار کے ایک مدرسہ میں تو یہ تعداد پچاس فی صدی تک پہنچ گئی یہ مدرسہ ایک قصبہ میں واقع تھا اور وہاں ڈھیری (ڈبیا) کا استعمال زیادہ ہوا کرتا تھا۔

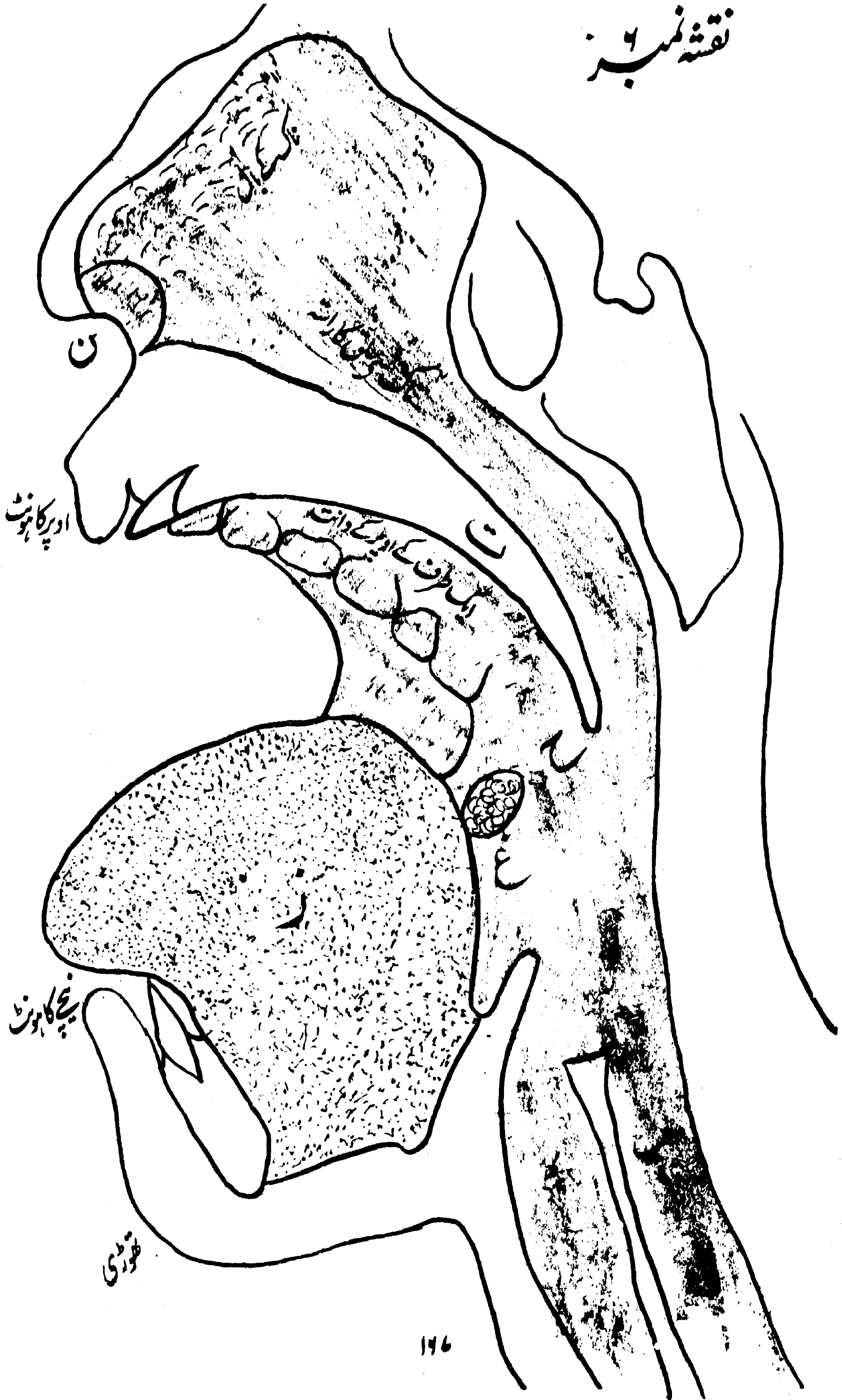
بمبئی میں نقائص کی تعداد بہار کے مقابلہ میں قریب قریب دُگنی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی میں زیادہ تر شہری باشندے ہیں جن کی نظر بلند عمارتوں کی وجہ سے محدود ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص قوم کے لوگ زیادہ ہیں یعنی پارسی جن کے سر کی ہڈی کی ساخت ایسی ہے کہ اُس سے اُن کی آنکھ کے ڈھیلے پر مستقل اثر پڑا ہوا ہے اور اُن میں آنکھوں کی کمزوری بہت عام ہے جس کی مثال یورپ میں جرمنی کی قوم میں ملتی ہے۔ وہ لوگ بھی آنکھوں کے عیوب کے لیے بدنام ہیں۔ یہ عیوب قدرتاً اُن میں پائے جاتے ہیں۔ اس وقت اور عیوب کا ذکر نہیں ہے۔

طبّی معائنہ کی غایت

۱۲۔ طبّی معائنہ کی غرض یہ ہے کہ باقاعدہ معائنہ ہوتا رہے اور بینائی کی کیفیت کی جانچ کی جایا کرے اُن اسباب کو معلوم کیا جائے جن سے بینائی پر بُرا اثر ہوتا ہے اور اُن کو جہاں تک ممکن ہو دور کیا جائے جس وقت کہ ابھی اعضا میں اصلاح کی قابلیت ہے اور جہاں ضرورت ہو وہاں عینک اور دوا اور علاج تجویز کیے جائیں۔ یورپ اور امریکہ میں تو اس معائنہ کی وجہ سے میز کی شکل اور اونچائی اور کتابوں میں حرفوں کی جسامت پر غور کر کے مناسب حال ترمیمیں کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ بچپن میں چھوٹے حرفوں کا اثر بُرا پڑتا ہے۔

چیچک کا اثر بینائی پر

۱۳۔ طبّی معائنہ کا ایک اور نتیجہ قابل ذکر ہے۔ سمجھدار لوگوں کو تو چیچک کے ٹیکہ کی اہمیت معلوم ہے۔ اُن کے بچوں پر چیچک کا کوئی اثر نہیں دکھائی دے سکتا مدارس میں ایسے بچے نہیں آتے جو چیچک سے مر چکے ہیں اور نہ ایسے آتے ہیں جن کی دونوں آنکھیں چیچک کی وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ ان میں چند تو سڑکوں پر اندھے بھیک منگوں کی گروہ میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ مگر ایسے بچے موجود ہیں جن کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے یہ کانے ہو گئے ہیں۔ اور بینائی کی کیفیت کی جانچ سے معلوم ہوا کہ اکثروں کی بینائی جو پہلے اچھی تھی چیچک کے اثر سے دفعتاً خراب ہو گئی ہے۔ تعصب و ناسمجھی کی وجہ سے اِن بچوں کو ٹیکہ سے نجات مل گئی ہے۔


نقشہ نمبر ۶
ن
اوپر کا ہونٹ
ایک طرف کے اوپر کے دانت
ت
ع
نیچے کا ہونٹ
ٹھوڑی

حضرات - عرض کر چکا ہوں کہ نظر کی خرابی سب سے عام خرابی نشوو نما کے زمانہ میں نہیں ہے۔ مدارس کے طلبا میں سب سے عام خرابی حلق کے غدود کی ہوتی ہے - بہار میں ۲۰ فی صدی اور علاقہ بمبئی میں ۵۰ فی صدی طلبا اس میں مبتلا پائے گئے ہیں - غدود کا بڑھنا بذاتہ کوئی مرض نہیں ہے - مگر یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جسم میں کوئی خراب مادہ داخل ہو رہا ہے -

حلق پر چھ راستے آکر ملتے ہیں - ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۶ - یہ شکل منھ کے اندر کی ہے - ایک طرف کا حصہ نکال دیا گیا ہے - ز - زبان ہے - ح حلق - اوپر کے دانت دکھائی دے رہے ہیں - ن - ناک ہے - اور ت تالو - پ نلی ہے جو پیٹ کو جاتی ہے اور بھ نلی ہے جو پھیپھڑے تک جاتی ہے جس کو نرخرا کہتے ہیں - پہلا راستہ تو منھ کے ذریعہ سے آیا ہے - دوسرا ناک کے ذریعہ سے - اس کا علم تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ منھ میں پانی لے کر کھانسنے کی کوشش کیجیے کہ پانی ناک کے راستہ سے نکل پڑے گا - پیٹ کا راستہ اور پھیپھڑے کا راستہ یہ چاروں اس حلق پر آکر ملجاتے ہیں - اور یہاں سے دو اور چھوٹی چھوٹی نالیاں کانوں کی طرف جاتی ہیں - جو نقشہ میں نہیں دکھائی جاسکتی ہیں - بہر حال ان کا احساس اس طرح ہو سکتا ہے کہ ناک اور منھ زور سے بند کر کے پھونکیے - کان فوراً بھرے معلوم ہونگے - اس کی وجہ یہ ہے کہ کان کے راستوں میں ہوا ابھر جاتی ہے - اس طرح یہ چھ راستے اس حلق پر آکر ملتے ہیں ایسے مقام کی اہمیت ظاہر ہے - یہاں کی اہمیت کا خیال کر کے اس مقام پر محافظ اور دربان اور پولس رکھنا ضروری ہے اور یہ غدود ہی کی غایت یہی ہے - جسم میں اور کئی مقامات پر اس طرح کے محافظ موجود ہیں - آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے جب پنسل بناتے بناتے اپنی انگلی کاٹ لیتے ہیں تو کبھی کبھی ان کی بغل میں گلٹی ہو جاتی ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ زہریلا مادہ زخم کی راہ سے خون میں چلنا شروع ہوتا ہے اور قلب کی طرف رُخ کرتا ہے - راستہ میں غدود جو محافظت کے واسطے ہوتے ہیں دشمن سے لڑنے کی فکر کرتے ہیں - اس کوشش میں وہ پھول جاتے ہیں اور اپنی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں - گلٹی بڑھجاتی ہے - اس طرح غدود ران میں ہوتے ہیں اور جب طاعون کا زمانہ ہوتا ہے تو چوہے کے جسم پر کے پسّو جن میں زہریلا مادہ ہوتا ہے پیر پر کاٹتے ہیں زہر خون کے ذریعہ سے قلب کی طرف چڑھتا ہے - ان کے محافظ چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھول جاتے ہیں - ران میں گلٹی نکل آتی ہے - بالکل اسی طرح یہ گلٹی یا غدود حلق کے اندر محافظ کا کام کرتے ہیں -

بیرونی ہوا کی کثافتیں

۱۵ - بیرونی ہوا سانس کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوتی ہے اور یہ ہوا کبھی صاف نہیں ہوتی - ہوا کی کثافت کا تو مشاہدہ بآسانی ہو سکتا ہے

کمرے کو ہر طرف سے بند کر کے اندھیرا گپ کر دیجیے اور صرف ایک سوراخ یا دراز کھلی رکھیے جس میں سے دو ب کی شعاع لکیر یا چادر کی صورت میں اندر آس کے۔ تو اس شعاع میں بہت سے ذرہ اڑتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ ذرہ اس وقت بھی موجود ہیں اور ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ مگر جب تک ایک خاص کیفیت کمرے میں نہ پیدا کر دی جائے نہیں دکھائی دیتے۔ یہ بہت نازک اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ نازک اس وجہ سے کہ ذرا سی پھونک سے اُن میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور چھوٹے اس وجہ سے عام طور پر دکھائی نہیں دیتے۔ دوسرے قسم کی کثافت وہ ہے جس کو آپ سونگھ سکتے ہیں۔ صبح سویرے باہر سے ایسے کمرے میں داخل ہوئے جس میں رات بھر چار پانچ آدمی سوئے ہوں۔ تمام کھڑکیاں اور کواڑ بند رکھے گئے ہوں اور رات بھر دو ایک لیمپ بھی جلا ہو۔ پہلی بات جس کا احساس ہوگا وہ کمرے کے گندی ہوا کی بدبو ہوگی۔

ہوا میں مرض کے کیڑے

۱۶۔ ان کثافتوں کے علاوہ اور کثافتیں بھی ہوا میں موجود ہیں۔ جن کو ڈاکٹر بیماری کے کیڑوں سے موسوم کرتے ہیں جس کو ہم اس وقت زہر کہیں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انفلوئنیزا کی وبا میں پہلے حلق میں خراش ہوا کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیماری کا زہر جو ہوا میں پھیلا ہوا تھا حلق میں داخل ہو کر محافظوں کو اپنے فرض کے ادا کرنے کا خیال دلا دیا کرتا تھا۔ جس آدمی کو انفلوئنیزا ہوتا تھا وہ کھانس کر اور چھینک کر ہوا کو اس زہر سے بھر دیتا تھا۔ بمبئی کے ایک بڑے دفتر میں جہاں سو محرر تھے، صدر محرر ایک روز انفلوئنیزا میں مبتلا ہو کر آیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر کھانسا چھینکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا کمرہ زہر سے بھر گیا۔ اسی ہوا کو ننو آدمیوں نے اپنے جسم میں سانس کے ذریعہ سے پہونچایا اور کوئی ۵، ۷ آدمی دوسرے روز انفلوئنیزا میں مبتلا ہو گئے اور ہر شخص نے اوسطاً چار آدمی کو اپنے خاندان میں گھر پر جا کر اسی طرح انفلوئنیزا کا زہر پہنچا دیا اور آناً فاناً تین سو آدمی انفلوئنیزا میں مبتلا ہو گئے۔ اسی طرح ایک آدمی بمبئی سے کلکتہ ریل میں جا رہا تھا۔ اُس کے ڈبے میں کوئی بیس آدمی تھے۔ اُس کو بیماری تھی اُس نے کھانس کر اور چھینک کر ڈبہ کی ہوا کو خراب کر دیا۔ باقی لوگوں نے بھی اسی ہوا سے سانس لیا۔ کوئی تو راستہ میں اٹارسی پر اُتر گیا کوئی جبلپور میں۔ کوئی الہ آباد اور کوئی بنارس۔ کوئی گیا۔ اور کوئی آسنسول اور وہ آدمی خود کلکتہ چلا گیا۔ یعنی راستہ میں اوروں کے ذریعہ سے اُس نے ہر جگہ انفلوئنیزا پھیلا دیا اور خود کلکتہ بیماری کو لے گیا۔ اسی طرح انفلوئنیزا کی بیماری بہت جلد ملک میں دوڑ گئی تھی۔ ماحصل کہنے کا یہ ہے کہ ہوا جس سے ہم سانس لیتے ہیں اس میں بیماریوں کے زہر بھی ہوا

ہوا کرتے ہیں۔ اور جب ہوا میں اتنی کثافتیں ہیں تو پھر زندہ رہنا وبال جان ہی ہے۔

بیرونی ہوا کی سردی

۱۷۔ پھر ملاحظہ کیجیے کہ باہر کی ہوا ہمیشہ سرد ہوتی ہے۔ اُس کی سردمہری دیکھیے کہ گرمی میں بھی زکام پیدا کر دیتی ہے۔ ناک تو ایک بہت لمبا عضو ہے۔ جو سامنے سے لے کر حلق تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اندر بہت خون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو اپنی ناک اندر سے سُرخ نظر آئے گی۔ اپنی ناک تو آپ اندر سے خود دیکھ نہ سکیں گے جب تک کہ آئینہ میں نہ دیکھیے مگر دوسروں کے نتھنوں کے اندر دیکھ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ اندر سے بہت سُرخ ہے۔ خون کا مشاہدہ بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اتفاقاً یا دیدہ و دانستہ اگر ہلکا سا گھونسا بھی ناک میں لگ جائے تو بہت خون جاری ہوتا ہے۔ خون میں گرمی ہوتی ہے۔ جب ٹھنڈی ہوا ناک کے اندر سے گذرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ گرم بھٹی میں سے گذر رہی ہے۔ سرد ہوا خون سے ملتی ہے۔ بہت سے خون سے ملتی ہے۔ بہت سے گرم خون سے ملتی ہے اور حلق تک پہنچتے پہنچتے خود گرم ہو جاتی ہے۔ اس طرح ٹھنڈی ہوا گرم ہو کر پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے اور ناک کے اندر بہت سے بال ہوتے ہیں۔ یہ کثافتوں کو روک لیتے ہیں۔ لہٰذا ناک سے سانس لینے میں بہت سے فوائد ہوتے ہیں۔ اور زندگی پھر وبالِ جان نہیں رہتی۔

موتھ سے سانس لینا

۱۸۔ مگر موتھ سے سانس لینے میں یہ فوائد نہیں ہیں۔ کثیف ہوا پھیپھڑوں ٹھنڈی ٹھنڈی جاتی ہے حلق کے محافظ اُن کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دشمن سے لڑنے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں اور پھول جاتے ہیں اور مدرسوں میں طلباء کی عام طور یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ موتھ سے سانس لیتے ہیں اور ناک سے سانس لینے کی برکت وفضیلت سے محروم رہا کرتے ہیں۔ ان کی عادت اس طرح کی پڑ جاتی ہے۔ اور اس سے غدود بڑھ جاتے ہیں۔

دانت اور مسوڑے

۱۹۔ زہریلا مادہ دانتوں اور مسوڑوں سے بھی حلق تک آیا کرتا ہے۔ غذا کے ذرّے دانتوں کے بیچ میں اور مسوڑوں کے کنارے رہجایا کرتے ہیں۔ اگر رات کو بغیر موتھ دھوئے ہوئے بچے سو رہیں تو چند گھنٹوں میں یہ ذرّے سڑ جاتے ہیں۔ جس طرح آٹے میں خمیر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان ذرّوں سے ایک قسم کا تیزاب بن جاتا ہے جو دانت پر بُرا اثر پیدا کرتا ہے اور رفتہ رفتہ کھوکھل پیدا کر دیتا ہے جس کو دانت میں کیڑا لگ جانا کہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ اثر صرف اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ دانت

پر ذرا سی سیاہی آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض چیزوں کے ذرے مسوڑوں کے کنارے پر جونے کی طرح جم جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مسوڑوں کو اپنی جگہ کھسکا دیتے ہیں اور اس طرح درازیں بن جاتی ہیں جن میں اور ذرّے سڑ کر پیپ پیدا کر دیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو یہ مرض ہوتا ہے مگر اس مرض میں طرّہ یہ ہے کہ جس کے مسوڑوں میں پیپ ہوتی ہے اُس کو خود اس کی بدبو نہیں معلوم ہوتی مگر آپ نے اپنے احباب کو دیکھا ہوگا جن کے مونھ سے بدبو آیا کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہی پیپ ہے۔ اب آپ خیال کیجیے کہ دانت کے کیڑوں کا مادہ اور مسوڑوں کی پیپ کا پیٹ کے اندر جانا کتنا آسان کام ہے۔ یہ مادّے جاتے ہیں اور ہمارے محافظ کو اُن کی روک تھام کرنی پڑتی ہے۔

یہ مرض شمالی سندھ میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ جہاں پر ۹۵ فی صدی مسلمان ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ پان بالکل نہیں کھاتے۔ بہار سے مقابلہ کیجیے جہاں پان بکثرت کھایا جاتا ہے یہاں پر یہ مرض بہت عام ہے۔ پان کا چونا دانتوں اور مسوڑوں کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اور جیسا پہلے ذکر آیا یا آسانی جم کر مسوڑوں کو کھسکا دیتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کے دانت دنیا بھر میں سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ مگر صرف ۲۰ برس کی عمر تک۔ ۴۰ برس کی عمر تک تو دنیا بھر کے دانتوں سے بُرے ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ پان کی زیادتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ اثرات چند دن میں نہیں ہوتے ہیں بلکہ رفتہ رفتہ مونھ کی صفائی نہ کرنے سے ہو جاتے ہیں۔

دانت صاف کرنے کا طریقہ

۲۰۔ آپ شاید یہ سوال کریں کہ دانت اور مونھ کے صاف کرنے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ مسواک بہت اچھی چیز ہے اگر اس کا استعمال ذرا تمیز سے کیا جائے۔ جن لوگوں کا جی چاہے بُرش استعمال کریں۔ مگر بُرش میں یہ خیال رکھیں کہ اچھے قسم کا قیمتی بُرش ہو اور امریکہ کا ایک بُرش "پروفیلیکٹک" اس کام کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس کے بال ترچھے اور نابرابر کٹے ہوتے ہیں۔ جو دانتوں کی درازوں کے لیے بہت موزوں ثابت ہوئے۔

آپ کا جی چاہے تو بازار کے قیمتی منجن اور دانت صاف کرنے کی مختلف دوائیں استعمال کریں۔ اُن میں اکثر مفید چیزیں ہوتی ہیں۔ مگر سب سے اچھا منجن تو معمولی نمک ہے جو ایک نہایت ارزاں چیز ہے۔

مسواک بھی تو برش ہی ہے۔ اور اسکو چبانے سے جو عرق نکلتا ہے وہ مسوڑوں اور دانتوں
کے لیے نہایت مفید دوا ہے۔ نیم کی پتیاں تو اکثر جوش دیکر زخموں کے دھونے کے لیے
استعمال کی جاتی ہیں۔ مسواک میں کچھ خرچ نہیں ہے اور اس سے روز آپ کو نیا برش اور تازہ دوا مل جائیگی
نیا برش (مسواک) جس کو آپ اپنے ہی کارخانہ (مونہہ) میں بنا لیتے ہیں اور تازہ دوا (عرق) جو آپ اپنے
ہی شفاخانہ (مونہہ) میں تیار کر لیتے ہیں۔

مگر حضرات خواہ آپ یورپین چیز پسند کریں یا ہندوستانی۔ ان چیزوں کا استعمال صحیح طریقہ
پر ہونا چاہیے۔ عام طور سے یہ چیزیں دائیں طرف سے بائیں طرف کو یا بائیں سے دائیں کو گھسی جاتی ہیں
جس سے دانت کا ابھرا ہوا حصہ تو چکنا ہو جاتا ہے مگر دانتوں کے بیچ میں اور پشت پر جن کو صاف کرنا
بہت ضروری ہے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بھی ہاتھ چلانا چاہیے۔

غدود کے پھولنے کا نتیجہ

۲۱- میں اپنے اصل مضمون سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ غدود یعنی محافظوں
کا ذکر ہو رہا تھا میں نے بیان کیا ہے کہ غدود پر زہریلا اثر دو وجہوں سے پڑا
کرتا ہے۔ اوّل مونھ سے سانس لینے سے اور دوم دانت اور مسوڑوں کی صفائی
نہ کرنے سے جن میں کیڑا اور مسوڑوں میں پیپ کا پڑ جانا شامل ہیں۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ غدود کے بڑھ جانے
کا کیا نتیجہ ہوگا۔ کان کے راستوں میں ورم ہو جائے گا اور یہ دو نالیاں بند ہو جائیں گی۔ جس سے سماعت پر
اثر پڑے گا اور رطوبت ریم کی شکل میں کان سے بہنے لگے گی۔ پھیپھڑوں کے راستے میں رکاوٹ پڑ جائیگی۔
اور پھیپھڑے کی بیماریاں ہو جائیں گی۔ پہلے تو ہوا کم کم اندر جائے گی اور پھیپھڑے اچھی طرح نہ پھیلیں گے۔
ان کو کافی غذا نہ ملے گی۔ اور پھر جب پسلیاں سخت ہو جائیں گی پھر تو ہمیشہ کے لیے پھیپھڑوں کا پھیلنا
رکا رہے گا۔ ان پھیپھڑوں پر دق وسل کا اثر آسانی ہو جاتا ہے جب زہر خون میں پہنچ جاتا ہے تو قلب
اور جوڑوں پر اثر پڑا کرتا ہے۔ اور پیپ کے ہر وقت نکلنے سے ہاضمہ کا خراب ہو جانا تو معمولی بات
ہے۔ یہ سب اثرات رفتہ رفتہ ہوتے ہیں۔

جن نتائج کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کا پورا ثبوت طبّی معائنہ سے مل جاتا ہے۔ اور یہ نتائج تجربہ
کرکے نکالے گئے ہیں۔

نتائج اور مثالیں

۲۲- مدارس کے طلبا کی صحت کا معائنہ آپ برابر کرتے رہیں تو معلوم ہوگا
کہ یہ بیانات بالکل صحیح ہیں اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان امراض کا علاج
شروع کی احتیاطوں سے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ معمولی باتوں کی بے پرواہی سے انسان کے جسم پر

مستقل اثر پڑتا ہے۔ مدرسوں میں جن لڑکوں کے غدود عرصہ تک بڑھے ہوئے ہیں اُن کے جسم میں امراض متعلقہ بھی پائے جاتے ہیں یعنی کان پھیپھڑوں قلب اور جوڑوں وغیرہ کے امراض۔ چند مثالوں سے اس بات کی تشریح ہو جائے گی۔

ایک طالب علم اکثر کھانسی و نزلہ میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ ہمیشہ سے وہ موہنہ کھول کر سانس لینے کا عادی تھا۔ اُس کو صلاح دی گئی کہ موہنہ بند کرکے سانس لیا کرے۔ چونکہ وہ مختلف کھیلوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس مشق سے رفتہ رفتہ اُس کے غدود چھوٹے ہو گئے اور پھر اُس کو کھانسی زکام کبھی نہیں ہوا۔ اگر یہی عادت قائم رہتی تو پھیپھڑوں پر ہمیشہ کے لیے بُرا اثر پڑ جاتا۔

ایک مدرسہ قصبہ میں واقع تھا۔ وہاں چھوٹے بچوں کے سینہ کی پیمایش سے معلوم ہوا کہ اُن لوگوں کا سینہ خوب پھیلتا ہے۔ سینے کے ناپ کا لینا ایک معمولی اور غیر ضروری کام سمجھا جاتا ہے اور واقعی محض ناپ لینے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہ غرض تو ہوتی نہیں کہ درزی کی دوکان کھولی جائے۔ بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ سینے کی پیمائش دو وقتوں میں کرکے دونوں کا فرق دیکھا جائے۔ یعنی ایک تو اس وقت جب کہ سانس اندر ہو اور دوسرے جب سانس باہر نکل گئی ہو۔ ان دونوں کے فرق سے سینہ کے پھیلنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اس مدرسہ کا معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہاں تمام طلبا کھیل کود میں شریک ہوا کرتے تھے۔ استاد اور ہیڈ ماسٹر خود کھیلوں میں شرکت کرکے تندرستی کی طرف توجہ کرتے تھے۔ اور اسی ضلع میں دوسرا مدرسہ تھا جہاں بڑی عمر کے طلبا کے سینوں میں زیادہ گنجائش نہیں پائی گئی۔ یہاں ورزش کی طرف سے بہت زیادہ بے توجہی برتی جاتی تھی۔ ورزش کے فوائد تو ظاہر ہیں۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے اس قسم کے اشغال کو رائج کیا جائے۔

دانت کی طرف سے بے توجہی کی مثال بھی سُن لیجیے۔ ایک بچہ کے والد جو بیرسٹر تھے کچہری کا ہرج کرکے معائنہ کے وقت خود تشریف لائے۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے کی تندرستی کا بہت خیال رکھا کرتے ہیں۔ کھانا اچھے قسم کا زود ہضم دیتے ہیں۔ اور بچے کی ورزش کا خیال ہر طرح سے رکھتے ہیں۔ دماغی کام بھی اتنا نہیں کرنے دیتے جس سے وہ تھک جائے۔ اور پھر بھی اُس بچے کی تندرستی روز بروز خراب ہی ہوتی جاتی تھی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اُس بچہ کے سب دانت کیڑے کے شکار ہوئے تھے اور پیپ تو مسوڑوں میں خوب بھر رہی تھی۔ کتنی ہی اچھی غذا کیوں نہ ملے مگر بیکار تھا۔ جب کہ چبانے کی مشین پیشہ پر سے اتری ہوئی تھی۔ اور طرہ یہ تھا کہ بچہ کے والد کو کبھی

دانت کی صفائی کی طرف توجہ بھی نہ ہوئی - اور ہوتی کیوں - بیچارے خود ہی دس بارہ برس سے عرصہ سے مصنوعی دانتوں کا استعمال کر رہے تھے -

میرا مطلب اس مثال کے بیان کرنے کا یہ ہے کہ آپ کو اس بات کی اہمیت کا احساس ہو جائے کہ اس کام کو مفید بنانے کے لیے والدین اور اُستادوں کی جماعت اور مدد کی بھی بہت ضرورت ہے۔

طبی معائنہ کی غایت

۲۳ - بار بار وقفہ دیکر طبی معائنہ کی غرض یہی ہے کہ تندرستی کا حال معلوم ہوتا رہے اور یہ تحقیقات ہوتی رہے کہ کن وجوہ سے اور کیونکر زندگی کے اُس زمانہ میں جب کہ اعضا ملائم اصلاح پذیر ہیں مختلف قسم کے اثر جسم پر ہونے لگتے ہیں جن کا نتیجہ استقلال پکڑنے کے بعد بہت برا ہوتا ہے اور کن صورتوں سے اِن باتوں کی اصلاح ہو سکتی ہے - اس کام کا نتیجہ چند سال میں لوگوں کی واہ واہ کے لیے جادو کا اثر نہیں دکھا سکتا یہ تو صدیوں کا کام ہے - آج کل کے طلبا جب بڑے ہوں گے اور خود والدین بن جائیں گے تو اُس وقت آیندہ نسل کو زیادہ فائدہ پہونچے گا - کیونکہ وہ خود سیکھ کر جائیں گے اور مفید معلومات سے اپنے بچوں کو فائدہ پہنچائیں گے - برسوں کی سخت محنت کے بعد امریکہ اور انگلستان میں دانت صاف کرنے کی قاعدے مقرر ہو سکے ہیں - اور اب اِن ممالک کے لوگوں کے دانت پہلے سے بہت اچھے ہو رہے ہیں - اسی طرح اور عیوب کے دور کرنے کی تدابیر کی جا سکتی ہیں جن کا اچھا اثر آیندہ ظاہر ہو گا - اور یہ کام زیادہ اچھی طرح ایسے مدرسوں میں جہاں دارالاقامت ہوں اُستادوں کے ذریعہ سے اور بھی خوش اسلوبی کے ساتھ ہو سکتا ہے - ذیل کی مثال سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اُستاد بغیر دارالاقامت کے بھی ایک حد تک تندرستی کے اصول کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں - ایک مدرسہ میں طلبا کے ناخن بہت گندے اور بڑے بڑے تھے - ناخنوں کی طرف سے بے توجہی تو ایک معمولی بات ہے مگر اس مدرسہ میں یہ بات خاص طور پر بہت ترقی پر تھی - اگر گندگی کے بھی درجہ قائم کرنے کی ضرورت ہو تو سمجھ لیجیے کہ ناخن کی میل سڑک کے کیچڑ سے زیادہ گندی ہوتی ہے - کیونکہ سڑک کی کیچڑ کو تو دھوپ اور ہوا لگتی رہتی ہے - اور اگر آپ انگلیوں سے کھانا کھاتے ہیں تب تو اس سے اِنکار ہو نہیں سکتا کہ کھانے کے ساتھ سڑک کے میل سے بھی زیادہ گندگی پیٹ میں جاتی ہے - صرف یہی نہیں مختلف بیماریاں اس گندگی سے پھیلتی ہیں - اس مدرسہ میں ایسی گندگی کی زیادتی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ یہ ریلوے کا مدرسہ تھا اِس لیے زیادہ تعداد طلباء کی بڑھئی اور لوہار پیشہ وغیرہ کے گھروں کی تھی - وہاں یہ ہدایت کی گئی کہ سیچر کو سہ پہر کے وقت جب چھٹی کے چند منٹ رہ جائیں سب طلبا سے کہا جائے کہ

وہ اپنا ہاتھ پٹ میز پر رکھدیں اُستاد ایک چکر لگا کر یہ دیکھ لے کہ کتنے طلباء کے ناخن بڑے اور گندے ہیں اور پھر اُن کو مطلع کر دے کہ یہ تمہارے ناخنوں کا معائنہ ہوا ہے اور ہر سنیچر کو اسی طرح معائنہ ہوگا۔ ہر شخص اپنے گندے ناخن کو چھپانا چاہتا ہے اس ترکیب سے چند ہفتہ میں ہر ایک کے ناخن صاف ہوگئے اور پھر یہ عیب اُس مدرسہ سے بالکل دور ہوگیا۔

علاج

۲۴- اِن عیوب اور اِن کے اثر کا بیان سن کر آپ شاید اب بھی یہ سوال کر بیٹھیں کہ آخر اِن امراض کے لیے نسخہ کیا ہوگا۔ میں تو یہی سمجھا رہا ہوں کہ اِن امراض کا علاج جادو کے نسخوں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ کام اُسی قدر طب سے تعلق رکھتا ہے جس قدر تعلیم و تربیت سے۔ اور اسی بنا کر یہ ذیل کا نسخہ بہت کارگر ثابت ہوگا۔ یہ رائے مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب پی ایچ ڈی بجنوری کی ہے جو سرکار عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال بالقابہا کے تعلیمی مشیر تھے۔

"ہر دارالعلوم میں ایک شعبہ حفظانِ صحت کا ہونا چاہیے جس کی غرض یہ ہوگی کہ ہر طالبعلم کا طبی معائنہ داخلہ کے وقت ہو اور جب تک وہ وہاں رہے وقتاً فوقتاً وقت مقررہ پر معائنہ ہوتا رہے اور اس کے نتائج کو قلمبند کیا جایا کرے۔ اور جہاں علاج کی ضرورت ہو وہاں اس کا انتظام بھی کیا جائے ہر طالب علم کو جسمانی ورزش کی تعلیم بھی دیجائے۔ اور اُس کو حفظانِ صحت کے اصول سے بہرہ ور کیا جائے۔ بہت سے ایسے عیوب ہیں جن کا انسداد شروع میں توجہ کرنے سے ہوسکتا ہے۔ ایسے معائنہ سے متعدی امراض کا پتہ بھی چلتا رہے گا جس سے طلباء کی صحت عامّہ پر بہت اچھا اثر پڑے گا"۔

سیڈلر کمیشن کی رائے بجنسہ یہی رہی ہے۔ اُنہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ڈائرکٹر حفظانِ صحت دارالعلوم کا ایک اعلیٰ رُکن ہونا چاہیے۔

ناکامیابی کے وجوہ اور کامیابی کی صورت

۲۵- یہ کام کئی جگہ شروع ہوا مگر کچھ ایسا کامیاب نہ ہوسکا۔ کامیابی تو سال دو سال میں معلوم ہو نہیں سکتی۔ مگر ناکامیابی کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱- خرچ کا متحمل نہ ہوسکنا

۲- مناسب ڈاکٹروں کی کمیابی

۳- لوگوں کی عام بے توجہی اور لاعلمی

اس میں نمبر ۲ و ۳ کے متعلق کافی کہا جاچکا ہے۔ ڈاکٹر عام طور سے اسپتالوں یا میونسپلٹیوں وغیرہ میں کام کرتے ہیں اُن کو اگر یہ کام تھوڑے معاوضہ پر دیا جائے تو زیادہ توجہ کی امید نہیں

رکھی جا سکتی۔ یہ تو تعلیمی کام ہے اور اس کے لیے ایسا ڈاکٹر ہونا چاہیے جو تعلیمی امور میں دلچسپی لیتا ہو۔ اور صرف اس کام کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ تیسرا امر ایسا ہے جس کے دور کرنے کے لیے وہ تعلیم ہی کام دیگی۔ ممکن ہے اس کام کو رائج کرنے کے لیے کسی قسم کے قانون کے بنانے کی ضرورت پڑ جائے مگر ایسے اہم کام میں اس بات کا انتظار کرنا کہ لوگوں کے بے توجہی کم ہو جائے اور لاعلمی جاتی رہے عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ تعلیم بالغان اور لکچر وغیرہ سے اس کی اہمیت بتائی جا سکتی ہے ایک وہ وقت تھا جب کہ خود تعلیم کے خلاف مذہبی فتاوے جاری ہوئے۔ خدا بھلا کرے مرحوم سر سید احمد خاں کا جنہوں نے موجودہ مسلم یونیورسٹی قائم کر کے اس لامذہبی کو دور کیا۔

خرچ کی صورت

۲۶ - اب رہی اول الذکر مشکل۔ بیشک یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے مگر اس کام کے بارے میں اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے ہر دارالعلوم میں ایک شعبہ تواریخ کا ہے۔ ایک شعبہ ریاضی کا ہے اور سائنس کے کئی شعبے ہیں اور ان شعبوں سے صرف معدودے چند طلبا ر فائدہ اُٹھاتے ہیں یہ حساب کیجیے کہ فی کس کتنا خرچ پڑتا ہے تو معلوم ہو گا کہ اچھی خاصی رقم ہر شخص کے لیے صرف ہو جاتی ہے۔ اور پھر بھی یہ سوال نہیں اُٹھتا کہ ان شعبوں کے اخراجات کس آمدنی سے نکلتے ہیں۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ ان شعبوں پر فضول خرچی ہو رہی ہے اور یہ بے کار ہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ حفظان صحت کے شعبہ کی اہمیت بتادوں ایسے شعبہ کے لیے جس سے سب طلبا ر فائدہ اُٹھائیں گے الگ آمدنی کی مد قائم کرنا مناسب نہ ہو گا۔ بہر حال اگر مجبوراً ایسا کرنا پڑے تو یہ خیال کر لیجیے کہ اس شعبہ کا خرچ اور شعبوں سے بہت کم ہو گا۔ کیونکہ نہ تو پروفیسر نہ ریڈر نہ لکچرار نہ ڈیمانسٹریٹر کی ضرورت ہو گی بلکہ ایک قابل ڈاکٹر اور ایک محرر مددگار سے سب کام نکل سکے گا۔

دارالعلوم میں حفظانِ صحت

۲۸ - اعلیٰ تعلیم گاہوں میں فی کس عہ ماہوار فیس لیجیے اور فرض کیجیے کہ تعلیم گاہ میں بارہ سو طلبا ہیں۔ یہ لوگ سال میں دس ماہ فیس دیتے ہیں۔ کل رقم سالانہ ۱۲۰۰۰ کی جمع ہو جائے گی۔ یعنی ماہوار ایک ہزار ہو گا۔ اور یہ رقم اس کام کے لیے مع علاج معالجہ کے کافی ہو گی۔ فی طالب علم عہ سالانہ اس کام کے لیے کوئی ایسی رقم نہیں ہے جو کام کی اہمیت کے لحاظ سے زیادہ کہی جا سکے۔ مگر یہ تو اعلیٰ تعلیم گاہوں کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ یعنی اس وقت کے لیے جب انسان کی عادتیں بن چکی ہیں اور اعضا میں سختی آ گئی ہے۔ لہذا اگر روپیہ کی کمی ہو تو یہ کام ایسے درجوں کے لیے نہ شروع کیا جائے۔

سب سے اچھا زمانہ تو ابتدائی تعلیم کا زمانہ ہے مگر اس زمانہ کے لیے بھی یہ کام فی الحال مفید ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ ابتدائی کے زمانہ کے آخر میں بہت سے طلبا چھٹ جاتے ہیں اور طلبا خود اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے ہیں کہ اس کام سے کوئی فائدہ حاصل کر سکیں۔ لہٰذا اس درجہ پر کام کو شروع کرنے میں روپیہ ضائع جائے گا۔

مدارس وسطی (سکنڈری اسکولز) میں حفظان صحت

۲۹۔ اس کام کے لیے سکنڈری اسکول (مدارس وسطی) سب سے موزوں ہیں۔ کیونکہ یہاں طلبا، کچھ عرصہ تک رہتے ہیں اور خود اس قدر سمجھدار ہو جاتے ہیں کہ مختلف ہدایتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ سب سے اچھا یہ ہوگا کہ ٹریننگ کالجوں میں اُن اُستادوں کو اس کام کی اہمیت کی تعلیم دی جائے جو وہاں تعلیم کا کام سیکھنے کے لیے آتے ہیں تاکہ جب وہ مفصلات میں جائیں تو جہاں اور جب اُن کو موقعہ ملے اس کام کو جاری کرنے میں مدد دے سکیں اور بڑے شہر کے اُن سکنڈری مدارس کو شامل کر لیا جائے جو اسی ضلع میں قرب وجوار میں ہوں جہاں دارالاقامت موجود ہوں۔ اس محدود طریقہ سے کام کرنے میں سب سے زیادہ فائدہ ہوگا اور تھوڑی سی رقم سے کام چل جائے گا۔ ورنہ اگر اسی تھوڑی سی رقم کو تمام صوبہ کے مدارس میں تقسیم کر دیا جائے تو ہر ایک کے حصہ میں بہت قلیل رقم آئے گی اور فائدہ بہت کم ہوگا۔ گویا تو تعلیم کے ایسے اہم شعبوں کے لیے اور روپیہ بجٹ میں منظور ہونا چاہیے ورنہ تھوڑی سی رقم صرف ٹریننگ کالجوں اور قریب کے سکنڈری مدارس پر صرف کی جائے۔ بہر حال اگر ساری رقم فیس ہی سے وصول کرنا ہو تو اُس کی صورت حسب ذیل ہوگی۔

گرمی کی تعطیل اتوار اور اور تعطیلات نکال کر سال میں صرف دو سو دن کام کے مدارس میں ملتے ہیں۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایک دن میں مدرسہ کے اوقات میں ایک ڈاکٹر اوسطاً پچیس [۲۵] طلبا، کا معائنہ کر سکتا ہے۔ اس طرح ایک ڈاکٹر سال میں پانچ ہزار طلبا، کو سنبھال سکے گا۔ ورنہ کم سے کم چار ہزار تو آسانی سے دیکھ بھال سکتا ہے۔ اگر ہر ایک سے آٹھ آنہ ماہوار لیا جائے تو دس ماہ میں پانچ روپیہ کی قلیل رقم ہر شخص کو دینا ہوگی۔ جس کی میزان بیس ہزار روپیہ ہوگی۔ اور ماہوار ایک ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپیہ آمدنی ہو سکے گی۔ اور یہ رقم اس کام کے لیے مع علاج معالجہ کے کافی ہے۔

یہ آمدنی کا ایک پہلو دکھایا گیا ہے۔ اب شروع ہی سے اگر کمزور بچوں کو مقوی غذائیں کھلانے کی تجویز کر دی جائے تو یہ کام کے شروع کرنے کا بالکل غلط طریقہ ہو جائے گا۔ یہ بات تو آخر میں اپنے وقت سے آئے گی ایسی تجویز سے دیوالہ تو نکل ہی جائے گا۔ عوام بھی بھڑک جائیں گے اور اُن کا

بھڑکتا بالکل بجا ہوگا۔

سکنڈری مدارس میں میری اس تجویز کو عملی صورت میں لانے کے تفصیلی حالات آپ انڈین میڈیکل گزٹ فروری ۱۹۲۳ء ملاحظہ کریں۔ اُس میں میں نے پوری طرح اس مضمون کو بیان کیا ہے اس وقت اُس کا بیان آپ لوگوں کی سمع خراشی کرنا ہوگا۔

خاتمہ

۳۰۔ حضرات ہندوستان میں روشنی اور ہوا کی زیادتی ہے جن پر ابھی کارخانوں کے دھوئیں کا اثر نہیں پڑا ہے جس کے لیے کچھ خرچ نہیں کرنا ہوتا اور افسوس ہے کہ اِن قدرتی انعامات سے لوگ متمتع نہیں ہوتے جس کی وجہ جہالت ہے نہ کہ غریبی۔ تندرستی ہزار نعمت ہے تندرستی سے مراد امراض سے آزادی کے ہیں۔ اور جب انسان کا جسم امراض سے بری ہے تو پھر وہ اپنا کام بھی اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اور جب اپنا کام اچھی طرح کر سکتا ہے تو اُس کو اور نعمتوں کے خریدنے کا مقدور ہو سکتا ہے اور وہ خود خوش رہ سکتا ہے اور اپنے اہل و عیال کو خوش رکھ سکتا ہے۔ آرام اور آسایش کے اُس سامان کو مہیا کر سکتا ہے جن سے وہ تندرستی کو قائم رکھ سکتا ہے اگر اُس کو یہ علم ہو کہ کس طرح اِن نعمتوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ جگہ اور موقعہ کی کمی نہیں ہے۔ روپیہ کی کمی نہیں ہے۔ مگر انتظام اور علم کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید بی ایس سی، ایم بی بی ایس،
سابق اسکول میڈیکل آفیسر بہارواڑیسہ،
میڈیکل انسپکٹر آف اسکولز صوبہ سندھ،
علاقہ بمبئی

لیکچر نمبر (۱۱)

اسکول کے بچوں کا طبّی معائنہ

ڈاکٹر محمد فیاض خاں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مدارس میں ڈاکٹر کی ضرورت

تحصیل علم جیسا کچھ ضروری امر ہے۔ ہر بالغ النظر پر بخوبی روشن ہے۔ لیکن ہر پھول کے ساتھ کانٹا لگا ہوا ہے۔ تحصیل علم بھی خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ یہ خطرات بعض اوقات صحت کے لیے ہوتے ہیں اور بعض اوقات جان کے لیے۔ ڈنمارک، سویڈن اور دیگر مغربی ممالک کے اطبائے خصوصی نے بعد تحقیقات معلوم کیا ہے کہ اسکول اور کالجوں کے جو تحصیل علم کے گھر ہیں مخصوص امراض ہوتے ہیں جو نہ صرف قریب نظری (مائی اوپیا) وغیرہ مشتمل ہیں بلکہ ایسے امراض پر بھی جو اعضائے رئیسہ کے افعال میں فتور ہو جانے سے واقع ہوتے اور ان امراض کا باعث جسمانی اور دماغی کثرت کار کا بیجا بار اور دیگر منافی صحت امور ہوتے ہیں اس لیے یہ بجا طور پر مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے ارباب حل وعقد جو بچوں کی ایک بڑی تعداد کو والدین اور سرپرستوں کی نگرانی سے علٰحدہ کرکے تعلیم کے لیے ایک جگہ جمع کرتے ہیں اُن امور کا خیال رکھیں گے جن سے تعلیم کے زمانہ میں بچے کی صحت کو نقصان نہ پہونچے۔

کلاس روم میں ہوا کی آمد برآمد۔ صفائی۔ روشنی۔ کھیلنے کی جگہ۔ پیشاب خانوں اور پاخانوں کی حالت ایسی چیزیں ہیں کہ اُن کی خرابی صحت کی خرابی کا باعث ہو سکتی ہے اور ان چیزوں کا مناسب حالت میں رکھنا اسکول اور کالج کے حکام کا فرض ہے۔ بچوں سے اُن کی عقل وطاقت کے مطابق کام نہ لینا اور بیجا بار ڈالنا

اُن کی صحت کو بگاڑ دیگا۔

اسکول میں ایک بچہ اگر کسی مرض متعدی میں مبتلا ہے تو دوسرے بچوں کی صحت خطرہ میں پڑجائیگی جس کی اخلاقی ذمہ داری اسکول کے حکام پر ہے۔ اس لیے ان تمام امور سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے ڈاکٹر کا تقرر ضروری ہے۔

مدارس یورپ میں ڈاکٹر کا تقرر

ملک جرمنی میں جس نے تحصیل علم میں بڑی جد وجہد کی ہے ۱۸۳۳ء میں ہی اس امر پر رد وقدح شروع ہوگئی تھی اور ڈاکٹر لورنسر نے اپنی کتاب "اسکولوں میں صحت کی حفاظت" میں اسکولوں کے حفظانِ صحت کی بابت کافی بحث کی ہے۔ لیکن اسکول ڈاکٹر کا باقاعدہ تقرر جرمنی میں ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ اسی اثنا میں فرانس، بلجیم اور ہنگری نے بھی اپنے اسکولوں میں اس کام کا انتظام کرلیا۔ جنگِ عظیم سے پہلے انگلستان میں اسکولوں میں طبی معائنہ کی اسکیم ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھی تھی۔ مگر جنگِ عظیم نے اس کو تکمیل تک پہونچا دیا۔ ۱۹۰۸ء میں پارلیمنٹ کے قانون کی رو سے بچوں کا طبی معائنہ وہاں شروع ہوا تھا۔ اور مقررہ اوقات پر یہ معائنہ کیا جاتا تھا اور نئی نسل کی حالت صحت کی یادداشت رکھی جاتی تھی۔ کارخانوں کے مزدوروں کا طبی معائنہ اس سے بہت پہلے سے رائج تھا۔ مزدوروں کے زمرہ میں بچے اور جوان دونوں شامل تھے۔ جنگ عظیم میں ایک تیسرے گروہ کے طبی معائنہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ کثیر رنگروٹوں کا معائنہ ہونے لگا جو زیادہ تر نوجوان اور درمیانی عمر کے آدمیوں پر مشتمل تھا اتنی کثیر تعداد کے طبی معائنہ سے یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہوگئی کہ قوم کے جسمانی نقائص کی ابتدا بچپن میں ہوتی ہے۔

امریکن فوج میں بھرتی ہونے والوں میں سے پچیس فی صدی ایسے پائے گئے جو گھر سے باہر کسی کام کرنے کے ناقابل تھے۔ دوسری پچیس فی صدی ایسے دریافت ہوئے جو محض ہلکا کام کرسکنے کے قابل تھے۔ ان پچاس فی صدی رنگروٹوں کے نقائص اور امراض کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بچپن کے زمانے میں اس کا آغاز ہوا ہے۔ اس لیے اگر بچپن ہی سے صحت کی درستی کا خیال رکھا جائیگا تو گویا بنیاد مضبوط ہوجائے گی اور آیندہ چل کر قوم تندرست جوانوں کا مجموعہ ہوگی۔

مدارس ہندوستان میں معائنہ کی اسکیم

ہندوستان میں جنگ عظیم سے پہلے اسکولوں اور طلبہ کے طبی معائنہ کی طرف توجہ مبذول کی گئی تھی۔ مگر جنگ کے باعث یہ اسکیم معرض التوا میں آگئی۔

قوم و ملک کا مستقبل

الغرض قوم و ملک کا مستقبل بچے کی صحت، مکمل نشو ونما اور صحیح تعلیم پر

منحصر ہے جس سے وہ کارآمد شہری بن سکے۔ بچہ قوم کی امانت ہے اور یہ ننھی سی ہستی عظیم الشان اور دوررس امور کا منبع ہے۔ آج کا بچہ کل کا ارسطو، افلاطون سکندر اور محمد فاتح اور خدا جانے کیا کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ آیندہ کی تمام ترقیوں کا انحصار اس کے جسم پر ہے اگر وہ تندرست ہے تو قوم کی بنیاد مضبوط ہے لیکن جسم اگر ناقص یا بیمار رہے تو قوم کی بنیاد گویا ریت پر قائم کی گئی ہے۔ قوم کے بچے غفلت سے مریض اور مریض آگے بڑھکر قوم کے بیمار نوجوان بنیں گے اور قومی ناقابلیت ہر قسم کی تکالیف۔ بے ضرور اخراجات۔ اقتصادی بے چینی اور بیکاری کا باعث ہونگے۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اگر بچے کی تندرستی کا بھی خیال رکھا جائے گا تو وہ کشمکش حیات کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے گا۔ اور قوم ان تمام متذکرہ بالا خرابیوں سے بچی رہے گی۔ بچہ کی صحت و تندرستی کے قیام اور حصول کے لیے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ بیکار نہیں جاتا۔ بلکہ عمدہ نتائج پیدا کرتا ہے۔ قوم و ملک کا مقصود محض یہ نہ ہونا چاہیے کہ ہنرمند اور عالم پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کی صحت کی طرف سے غافل رہے بلکہ ایسے انسان بنائے جن کی نشو و نما کامل ہو جن کا جسم اور دماغ صحیح ہو۔ جو کام کرنے کے قابل ہوں اور آیندہ نسل کے تندرست والدین بن سکیں۔

ہندوستان کے طلباء کی دردناک حالت

موجودہ حالت نہایت دردناک ہے۔ ہم اکثر ایسی خبریں سنتے رہتے ہیں اور ایسے واقعات دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک نوجوان یونیورسٹی کے اعلیٰ قانونی امتحان میں اول درجہ پر پاس ہوتا ہے لیکن چھ مہینے کے اندر اندر راہی ملک بقا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے صاحب ایم۔ اے میں فسٹ آتے ہیں لیکن صحت ایسی بگاڑ لیتے ہیں کہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ علم کے لحاظ سے فاضل اجل ہیں لیکن صحت کے لحاظ سے ادنیٰ ترین قلی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا یہ قابل افسوس امر نہیں ہے کہ ہمارا بچہ جوان ہو کر علم کے لحاظ سے قابل قانون داں ہو۔ ہزاروں روپیہ کماتا ہو لیکن صحت اس درجہ بگڑی ہوئی ہو کہ مونگ کی دال چپاتی اور یا برنج کے سوائے کچھ ہضم نہ کر سکتا ہو اور مدت العمر اطبا کا زیر مشق رہے۔ ایک دوسرا نوجوان علم کے لحاظ سے سلطنت کی وزارت کا بار اٹھا سکتا ہو مگر دائم المریض ہونے کی وجہ سے کام نہ کر سکتا ہو۔ ایسی دردناک مثالیں کیوں نظر آتی ہیں؟ محض اس لیے کہ دوران تعلیم میں بچوں اور نوجوانوں کو حفظان صحت کے اصولوں پر نہیں چلایا جاتا۔ ابتدائی حالت میں مرض کی تشخیص نہیں کرائی جاتی اور بروقت مناسب علاج نہیں کرایا جاتا۔ ایک

سال کا نقصان گوارا نہیں کیا جاتا مگر نادانستہ صحت کا زوال اور جان کا نقصان قبول کر لیا جاتا ہے یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ ان امور کی طرف توجہ دلانے والے یعنی ڈاکٹر کا تقرر اسکولوں اور کالجوں میں باقاعدگی سے نہیں کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں بہت سے ہونہار بچے اِس کمی کی وجہ سے موت کی بھینٹ چڑھتے رہتے ہیں اور قوم، ملک اور والدین کے ہزاروں ارمان دفن ہو جاتے ہیں۔ اِس کمی کی وجہ سے بہت سے بچے عمر بھر کے لیے اپنی صحت بگاڑ لیتے ہیں۔

ابتدائی جماعتوں میں تو تندرست بچے نظر بھی آتے ہیں لیکن جوں جوں اوپر کی کلاسوں میں جائیے، کمزوری اور انحطاط کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ کالج میں پہونچکر بعض طلبا ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ کسی طویل مرض سے چھٹکارا پا کر آئے ہیں۔ نہ چہروں پر ترو تازگی ہے نہ جوانی کی چستی و چالاکی۔ ممکن ہے ظاہر بیں نظر کو وہ بھلے چنگے دکھائی دیتے ہوں لیکن ایک طبیب کی نگاہ سے دیکھیے اور ممکن ہو سکے تو ذرا گہری تفتیش کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ قبض۔ ضعفِ ہضم۔ اختلاجِ قلب۔ دمہ بے خوابی۔ بواسیر اور قلۃ الدم کتنوں کو پریشان کیے ہوئے ہے اور تعلیم کے دن کسی نہ کسی طرح پورے کر رہے ہیں۔ ان حالتوں کو دیکھتے ہوئے کیا ضروری نہیں ہے کہ ہر درس گاہ میں بچوں کی صحت و تندرستی کے قیام کے لیے ڈاکٹر کا تقرر عمل میں آئے۔

بچہ کی جسمانی صحت کے لیے مفصلۂ ذیل سات چیزیں اشد ضروری ہیں۔

بچہ کی صحت کے لیے ضروری امور

(۱) تازہ ہوا (۲) غذا (۳) ورزش (۴) گرمی سردی سے حفظان یعنی معتدل جسمانی حرارت (۵) صفائی (۶) آرام (۷) زندگی کی باقاعدہ عادات۔

اگر بچہ کو یہ امور میسّر ہونگے تو اس کی جسمانی اور دماغی نشو و نما پورے طور سے ہوگی۔ اور جوان ہونے پر اس کی جسمانی حالت امراض کا مقابلہ اور کشمکشِ حیات کے لیے کافی طاقتور ہوگی۔ اس لیے تعلیم کے زمانہ میں وہ امور جو بچے کی نشو و نما کے لیے ضروری ہیں مدِ نظر رہنے چاہئیں

زمانۂ تعلیم میں صحت کا قیام

اگر آپ قوم کے بچوں کو تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ تندرست اور تنومند دیکھنے کے متمنی ہیں تو ان امور سبعہ کی روشنی میں ہر تعلیم گاہ میں کم سے کم مفصلہ ذیل امور پر عمل کرائیے۔

(۱) مقررہ اوقات پر ہر بچہ کا طبّی معائنہ اور ناقص اور مریض بچوں کی نگرانی۔

(۲) بچہ اگر غذا کی کمی کی وجہ سے کمزور ہو تو اس کی تلافی۔

(۳) ہر بچے کو جس کے جوئیں ہوں پاک وصاف کرایا جائے۔ میلے بچوں کے لیے غسل خانوں کا انتظام۔

(۴) ہر بیمار اور ناقص بچے کا علاج قابل اطبا سے کرانا۔

(۵) ہر بچہ کی تعلیم ہوادار کمروں یا بالکل کھلے میدان میں ہو۔

(۶) ہر بچہ سے مناسب حال ورزش باقاعدگی سے کرائی جائے۔

(۷) اسکول کا گردوپیش منافی صحت امور سے بری ہو تعلیم اس طرح دی جائے کہ بچہ کی صحت اور نشوونما پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔

(۸) خلقتاً ناتواں اور بیکار ناقص الخلقت اور بیمار بچوں کے لیے علٰحدہ اسکولوں کا انتظام مثلاً اندھوں۔ بہروں۔ مرگی کے مریضوں دماغی نقائص والے بچوں کے اسکول۔ سل و دق کے مریض بچوں کا صحت بخش مقامات (یعنی سینی ٹوریم) میں تعلیم کا مناسب انتظام۔

اسکول ڈاکٹر کے فرائض

بیسویں صدی میں ڈاکٹر کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ الاحتماء افضل من الدواء کو پیش نظر رکھتے ہوئے حفظِ ماتقدم کا خیال رکھے۔ علاج کو دوسرے درجہ پر سمجھے۔

چھوٹے بچوں کے داخلہ کے وقت بعد معائنہ اسکول کا ڈاکٹر یہ رائے دیتا ہے کہ آیا بچے کی جسمانی اور دماغی نشوونما اس درجہ پر ہے کہ اسکول کی پابندی اور تعلیم کا بار بلا اپنی صحت کو نقصان پہونچائے اُٹھا سکے گا۔

تعلیم شروع کرانے کے لیے جرمنی میں بچہ کی عمر کم از کم چھ سال مقرر ہے لیکن بہت سے بچے اس عمر میں بھی بلحاظ جسمانی اور دماغی حالت کے اس قابل نہیں ہوتے کہ تعلیم سے کچھ فائدہ اُٹھا سکیں اس لیے ایسے بچوں کا داخلہ ایک سال یا دو سال کے لیے روک دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے جن کی نشوونما تعلیم کے لیے کافی نہیں ہے اور اس لیے تعلیم شروع کرنے کے ناقابل ہیں۔ اپنی صحت کے نقصان سے بچ جاتے ہیں اور استاد فضول دردسری سے۔

پروفیسر مانٹی ساری کے طریقہ تعلیم میں جس کا یورپ میں عام رواج ہوتا جاتا ہے اور جس کی صدائے بازگشت مشرق تک بھی پہنچ گئی ہے آٹھ سال کی عمر تک بچوں کو معمولی اسکولوں میں داخل نہیں کرایا جاتا بلکہ کتابوں کی بجائے کھیلوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے اور بچے کو ایسے مشغلوں میں معروف رکھا جاتا ہے جس سے اس کے حواس خمسہ ظاہری کی نشو و نما فطرت کے قانون کے مطابق ہوتی رہے اور ورزش جسمانی کے ذریعہ بدن کی قوتیں پختہ ہوں کھیل ہی کھیل میں لکھنے اور نقشے بنانے کی تعلیم جاری کرا دی جاتی ہے۔ حروف کی شکلیں بنانے کی مشق اور پہچان ہو جاتی ہے اور کھیل ہی کے ذریعہ ابتدائی حساب سکھا دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بعد معائنہ یہ معلوم کرتا ہے کہ بچہ کسی مرض میں مبتلا تو نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ والدین اپنے بچے کو تندرست سمجھتے ہوں لیکن اس میں کوئی ایسا نقص یا مرض موجود ہو جس کا پہلے شک شبہ بھی نہیں کیا گیا مثلاً اکثر والدین کو اپنے بچہ کی قریب نظری (دمائی ادیا) کا علم نہیں ہوتا کیونکہ معمولی کاروبار میں بچہ کی طرف سے کوئی ایسی فروگذاشت نہیں ہوتی جس کو قریب نظری کی طرف منسوب کیا جائے۔ ڈاکٹر ایسے مریض بچہ کے داخلہ کے خلاف بھی اپنی رائے دیتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے بچوں کی صحت کو خطرہ ہو یا تعلیم کے بار سے خود اس بچہ کے مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ جن بچوں کو باوجود مرض داخلہ کی اجازت دی جاتی ہے ان کے مرض کی نگرانی کی جاتی ہے اور والدین کو اس کے متعلق اطلاع دی جاتی ہے تاکہ اگر کسی دوسرے طبیب یا ڈاکٹر سے اس کا علاج کرانا چاہیں تو ہر وقت علاج کرا سکیں۔ بچہ کی صحت کے مطابق اُستادوں کو ہدایات دی جاتی ہیں کہ دوران تعلیم میں فلاں بچہ کے متعلق فلاں امور کا لحاظ رکھیں اگر بچہ کی سماعت اور بصارت کم ہے تو قریب کی بنچوں پر بٹھایا جائے اگر معمولی ورزش کے ناقابل ہے تو اس کے متعلق ہدایات دیجاتی ہیں۔ بیماری کا بہانہ کرنے والے بچوں کو بعد معائنہ اسکول بھیجا جاتا ہے۔ اور ہر بچہ کی صحت کو دورانِ تعلیم میں زیرِ نظر رکھتا ہے بورڈنگ ہاؤسوں میں بچوں کے رہنے کی جگہ اور کھیلنے کے میدان۔ پڑھنے کے اوقات بچوں کی غذا۔ غرضکہ ہر بات کو حفظانِ صحت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور مناسب ہدایات ہیڈ ماسٹر کے ذریعہ کرتا رہتا ہے۔ امراض متعدی کے انسداد کو ملحوظ رکھتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے مختلف امراض سے بچنے کے لیے عام ہدایات جاری کرتا ہے اور لکچروں کے ذریعہ حفظانِ صحت کے عام قواعد بتاتا ہے۔ یہ مختصر سا خاکہ ہے جو اسکول ڈاکٹر کے فرائض کو بتاتا ہے۔ اب ذرا تفصیل سے میں اس کو بیان کرتا ہوں تاکہ اس کام کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

مکمل طبّی معائنہ

اسکول میں مکمل طبّی معائنہ عموماً چار دفعہ کیا جاتا ہے۔ اول داخلہ کے وقت دوسرا اسکول کے تیسرے سال میں۔ تیسرا چھٹے سال میں اور چوتھا آٹھویں سال میں اسکول چھوڑنے کے وقت۔

داخلہ کے وقت کے طبّی معائنہ کے نتائج یادداشت صحت (ہیلتھ کارڈ) میں درج ہوتے ہیں جو ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں مقفل رہتی ہے اور ڈاکٹر اور ہیڈ ماسٹر کے سوائے کسی تیسرے شخص کو بلا اسکول کمیٹی کی منظوری کے نہیں دکھائی جاتی۔ ہر بچّہ کا امتحان ہیڈ ماسٹر یا کلاس ٹیچر کی موجودگی میں علٰحدہ علٰحدہ کیا جاتا ہے اگر والد یا سرپرست بھی معائنہ کے وقت موجود رہیں تو زیادہ مناسب ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اول تو بچّہ ڈرتا نہیں دوسرے گزشتہ امراض کے متعلق بیش قیمت معلومات مل جاتی ہیں ورنہ بصورت دیگر ان معلومات کے لیے سوالات بھیجنے پڑتے ہیں جن کے صحیح جوابات سے صحیح نتیجہ پر پہونچنے میں اور آیندہ طبّی معائنہ میں قیمتی امداد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر والد یا سرپرست معائنہ کے وقت موجود ہونگے تو بچّہ کے متعلقہ زبانی ہدایات کا تحریری کی نسبت ان پر زیادہ اثر ہوگا۔

والدین سے دریافت طلب امور

طبّی معائنہ سے پہلے والدین سے جو امور دریافت کیے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

بچّہ کا نام ولدیت سکونت تاریخ پیدایش سرپرست کا نام معہ پتہ

(۱) بچّہ کو پہلے کیا کیا امراض ہو چکے ہیں اور کس عمر میں۔

(۲) کیا گزشتہ امراض یا کسی حادثہ کے بعد کچھ بُرے اثرات باقی رہ گئے ہیں اگر رہ گئے ہیں تو اُن کی تشریح مثلاً ثقل سماعت، مکروڑ کا خم وغیرہ۔

(۳) کیا بچّہ خرّاٹے سے سوتا ہے یا خاموشی سے۔ کیا سونے کے وقت منہ کھلا رہتا ہے یا بند۔

(۴) کیا کوئی خاص نقائص یا بُری عادات بچّہ میں معلوم ہوئی ہیں۔

(۵) کیا مفصلہ ذیل نقائص یا امراض میں سے کوئی موجود ہے۔

بات بات پر رو پڑنا۔ ڈرپوک ہونا۔ پیشاب کے متعلق کوئی تکلیف۔ قریب نظری دمائی یا

ثقل سماعت ۔صحیح الفاظ ادا نہ کر سکتا ۔لکنت ۔ام الصبیان کے دورے کوئی دیگر مرض دورے کے طور پر ۔فتق ۔ مرگی ۔ دل اور ششش کا کوئی مرض ضعف ہضم وغیرہ ۔

(۶) بچہ کس عمر میں بولنے لگا تھا ۔کس عمر میں چلنا سیکھ گیا تھا ۔

(۷) کتنے بھائی بہن ہیں اُن کی حالت صحت ۔

(۸) کتنے ان میں سے مر گئے اور کس مرض میں ۔

(۹) کیا خاندان میں کوئی موروثی مرض ہے ۔مثلاً سل و دق ۔کمزوریِ اعصاب ۔

(۱۰) بچہ خوش مزاج ہے ۔ ضدی ہے ۔ یا خاموشی پسند ہے ۔

(۱۱) کیا بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے ۔

ابتدائی طبی معائنہ کے وقت ہر بچہ کی یادداشت صحت تیار کی جاتی ہے جو مفصلۂ ذیل امور پر مشتمل ہوتی ہے ۔

یادداشت

بچہ کا نام عرف مع ولدیت	
عمر	
داخلہ سے پہلے کیا کیا امراض ہو چکے ہیں خاندانی حالات متعلقہ مرض	
لباس اور پاپوش	
قد وزن	
پرورش جسمانی	
صفائی	بدن
	سر
دانت	
ناک اور حلق	
آنکھ کے بیرونی امراض	

بصارت	داہنی / بائیں
کان کی بیماری	
سماعت	
گفتگو	
دماغی حالت	

دل اور دوران خون

شش (پھیپھڑے)

سینہ کی پیمائش

سل و دق

نظام عصبی

ہڈیوں کا خمدار ہو جانا (Rickets)

کبڑا پن یا دیگر اعضائے ظاہر کا نقص

متعدی امراض

جلدی امراض

دیگر امراض - پیشاب کے متعلق - فتق وغیرہ

زمانہ تعلیم کے لیے ہدایتیں

والدین کو ہدایت

اول بار

دوسری بار

داخلہ سے پہلے کے امراض کے ذیل میں خسرہ۔ چیچک سُرخ بخار (scarlet fever) خناق وبائی (Diptheria) موتیا سیتلا یا جدری کاذب (Chicken pox) وجع المفاصل۔ سل و دق۔ موروثی آتشک۔ محرقہ بطن (ٹائیفائڈ) کنپھیڑ (Mumps) کوئی حادثہ عمل جراحی کا اندراج ہونا چاہیے لباس اور پاپوش کو تین درجوں میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

۱۔ عمدہ
۲۔ متوسط
۳۔ خراب

پرورش جسمانی کو چار درجوں

۱۔ اعلیٰ
۲۔ طبعی
۳۔ کمتر از طبعی
۴۔ خراب

صفائی کے تین درجے

۱۔ صاف
۲۔ لیکھیں (جوؤں کے انڈے)
۳۔ جوئیں۔

جسم کے بھی تین درجے

۱۔ صاف
۲۔ میلا
۳۔ جوئیں

دانت کو تین درجوں میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

۱۔ تندرست
۲۔ ۴ دانتوں سے کم خراب
۳۔ ۴ سے زیادہ خراب

دماغی حالت کو پانچ درجوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ اعلیٰ
۲۔ طبعی
۳۔ کند
۴۔ کمزور
۵۔ فاترالعقل

آنکھ کے بیرونی امراض میں یا سمنی یا سلاق۔ بھینگا پن۔ آشوب چشم۔ پھولا درج کرنا چاہیے خاندانی امراض متعلقہ مرض میں۔ والدین بھائی بہن کے امراض کے متعلق اندراج ہونا چاہیے۔ آیا خاندان میں سل و دق۔ وجع المفاصل۔ مرگی۔ شراب خوری۔ دیوانگی وغیرہ میں سے کوئی موجود۔

چھوٹے بچوں کی نظر اور سماعت کا امتحان داخلہ سے پہلے یا داخلہ کے عین بعد نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ایسے امتحان کے نتائج ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔ داخلہ کے چھ مہینے یا برس دن کے بعد نظر وسماعت کا ملاحظہ ہونا چاہیے۔ دانتوں کی طرف بھی خاص توجہ چاہیے جو دانت ناقص ہوں ان کے متعلق معالج دندان (ڈنٹسٹ) سے مشورہ کیا جائے۔ والدین کو ہدایت کی جائے کہ اپنے بچے کے دانتوں کو صاف رکھیں۔

مغربی ممالک میں بچوں کے وزن اور پیمایش کی اوسط بلحاظ عمر نکال لی گئی ہے مگر ہندوستان میں ابھی تک اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ البتہ ہندوستان کے یورپین اسکولوں میں کسی حد تک اس کے متعلق کام ہوا ہے اب اگر ایک ہی عمر کے بچوں کی پیمائش اور وزن مقررہ اوقات میں باقاعدہ لیے جائیں گے تو ہمارے ہاں بھی اس کے متعلق ایک اوسط معلوم ہو جائے گا کہ بچے کی نشوونما کس عمر میں کتنی ہونی چاہیے۔

یادداشت نگرانی صحت یادداشت صحت کے علاوہ ہر اُس بچے کی "یادداشت نگرانی صحت" (Following-up card) بھی تیار ہونی چاہیے جس کو کسی نقص یا مرض کی وجہ سے علاج کی ضرورت ہو یا کمی غذا کی وجہ سے کمزور ہو۔ یا جس بچہ کو خاص طور سے زیر نظر رکھنا ہو ایسے بچہ کو سرسری معائنہ کے وقت اور دیگر اوقات میں دیکھتے رہنا چاہیے۔ اگر مرض۔ نقص۔ یا کمزوری رفع ہو جائے تو "یادداشت نگرانی صحت" پر اس کے متعلق اندراج کر دیا جائے اور اس کو "یادداشت صحت" کے ساتھ نتھی کر دیا جائے ورنہ ہر معائنہ کے وقت اس کے متعلق یہ لکھنا

چاہیے کہ کس حالت میں ہے اور والدین کو اطلاع دینی چاہیے۔

تیسرے اور چھٹے سال میں پھر ہر بچہ کا مکمل طبّی معائنہ کیا جائے۔ ابتدائی معائنہ کے وقت جن نقائص یا امراض کا اندراج موجود ہے اس کے متعلق خاص طور سے ذکر کیا جائے کہ اب کیا حالت ہے۔ کیا بدستور قائم ہیں یا ان میں کچھ کمی یا زیادتی ہو گئی ہے اور اس امر کی اطلاع ہیڈ ماسٹر کو بھیجی جائے جو بچہ کے والدین کو اطلاع دیدے۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے اور بچے کے اسکول چھوڑنے کے وقت ایک اور مکمل طبّی معائنہ کیا جائے جس میں بچہ کی صحت پر تبصرہ ہو یعنی پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک بچہ کی صحت کیسی رہی۔ اگر کوئی خاص نمایاں مرض ہوا ہو تو اس کا اندراج اس طرح بچّے کی صحت کی پوری یادداشت رکھنے سے والدین کو بچہ کو آئندہ مناسب حال پیشہ اختیار کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور اسی کی بنا پر اسکول ڈاکٹر بھی اگر اس سے دریافت کیا جائے بچہ کے آئندہ پیشہ کے متعلق مشورہ دے سکتا ہے۔ اُن بچوں کی یادداشت صحت پر جو ہر طرح حالت طبعی میں ہوں اور معمولی پیشے اپنی صحت کو نقصان پہونچائے بغیر کر سکتے ہوں۔ حرف الف (ا) لکھدیا جائے جن بچوں کا کسی خاص جسمانی حالتوں مثلاً دل پھیپھڑے آنکھ وغیرہ کے باعث خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہو۔ حرف ب لکھدیا جائے۔

سرسری طبّی معائنہ

ان چار مکمل طبّی معائنوں کے علاوہ ہر تیسرے مہینے تمام بچوں کا ایک سرسری معائنہ ہونا چاہیے۔ اور جن بچوں کی یادداشت نگرانی صحت بھی ہوئی ہے ان کو خاص طور سے دیکھنا چاہیے اور ان بچوں کا بھی مکمل معائنہ طبّی کیا جائے جس کے متعلق کلاس ٹیچروں یا ہیڈ ماسٹر کو کسی بیماری کا شبہ ہو اور وہ خاص طور سے ان کا معائنہ کرانا چاہتے ہوں۔

معلمین کے لیے دریافت امراض کی ہدایات

اُستادوں کو چونکہ بچوں کے دیکھتے رہنے کا زیادہ موقعہ ملتا ہے اس لیے ان کی رہنمائی کی غرض سے چند ہدایات جاری کی جائیں تاکہ وہ معمولی نقائص اور امراض کو آسانی سے معلوم کر سکیں اور بغرض معائنہ ڈاکٹر کو اطلاع دے سکیں۔ ہدایات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نقص نظر کا شبہ ہو سکتا ہے اگر

(۱) بچہ کسی پچھلی قطار میں بیٹھا ہوا بلیک بورڈ کا لکھا ہوا نہ پڑھ سکے۔
(۲) گھنٹے یا کلاک کا وقت تھوڑے فاصلے سے نہ بتا سکے۔
(۳) لکھتے وقت کاغذ کی باریک لکیروں کے ساتھ ساتھ نہ لکھ سکے۔
(۴) پڑھتے وقت باریک حروف چھوڑ جائے۔
(۵) پڑھتے وقت ہمیشہ کتاب کو آنکھ سے ایک فٹ سے کم فاصلہ پر رکھے۔
(۶) شکایت کرے کہ حروف ایک دوسرے میں گھسے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔
(۷) پڑھنے کے بعد آنکھوں کی تھکن یا سر درد کی شکایت کرے۔

ب ۔ حسب ذیل باتیں ثقل سماعت کا شبہ پیدا کرتی ہیں۔ اگر
(۱) بچہ منہ سے سانس لیتا ہو۔
(۲) کان بہتا ہو۔
(۳) سوالات کا جواب معمولی آواز سے نہ دے سکے بظاہر بے وقوف سا نظر آئے اگرچہ در اصل ذہین ہو۔

ج ۔ اگر آنکھوں سے پانی بہتا ہو۔ پپوٹوں کے کنارے متورم ہوں۔ یا میل بہت آتی ہو تو ڈاکٹر کو دکھائیں۔

د ۔ کان کے درد کی بچہ شکایت کرے تو ڈاکٹر کو دکھائیں۔

س ۔ مسوڑے کا دنبل ہو تو ڈاکٹر کو توجہ دلائیں۔

س ۔ گلے بڑھے ہوئے (ورم لوزتین) اور ایڈی نائڈ کا شبہ ہو سکتا ہے اگر
(۱) بچہ کھاتے وقت آواز سے سانس لیتا ہو یا خراٹے سے سوتا ہو۔
(۲) منہ کھول کر سانس لیتا ہو۔
(۳) اکثر ناک سے رطوبت جاری رہتی ہو۔
(۴) زکام ہوتے ہی بہرا ہو جاتا ہو۔

ص ۔ اگر بچہ دبلا ہوتا جائے اور کھانسی کی بھی شکایت کرے تو اس کو فوراً ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے ضرور نہیں کہ یہ علامات سل و دق کا ہی پیش خیمہ ہوں بلکہ دیگر امراض میں بھی ہو سکتی ہیں۔

ط ۔ امراض دل کا شبہ ہو سکتا ہے اگر۔
(۱) بچہ ہمیشہ پیلا رہتا ہو۔

(۲) تھوڑا سا بھاگنے دوڑنے یا ذرا سا زور کا کام کرنے سے دل دھڑکنے لگتا ہو اور سانس پھول جاتا ہو۔

(۳) چہرہ نیلگوں ہو۔

ع ۔ وجع المفاصل کا شبہ ہو سکتا ہے اگر

(۱) بار بار ورم حلق ہوتا ہو۔

(۲) جوڑوں میں درد رہتا ہو۔

حسب ذیل امراض میں بچوں کو کھلے میدان میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا جائے۔

(۱) ہنس یعنی قلتہ الدم کے مریض بچے۔

(۲) جو بچے نازک ہوں یا جن کی پرورش ٹھیک نہو۔

(۳) جن بچوں کی بابت یہ معلوم ہوا ہو کہ ان کو کسی قسم کا سلّ (Tubercle) مرض ہو چکا ہے۔ لیکن اب اچھے ہیں۔

(۴) ایسے بچوں کے لیے جو سل و دق کے مریض ہوں علٰحدہ صحت بخش مقامات میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

(۵) جن بچوں کی صحت پر اسکول کے کمروں میں تعلیم پانا خراب اثر ڈال رہا ہو۔

ورزش جسمانی ہر بچہ سے اس کی جسمانی حالت کے موافق ورزش کرانا نہایت ضروری ہے اس لیے کرکٹ ۔ فٹ بال ۔ ہاکی ۔ ٹے نس ۔ کبڈّی وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

بغرض قیام صحت کبھی کبھی بچوں کو (excursion یعنی سفر بغرض صحت) بھیجا جائے جو طلبا اکس کرشن پر جائیں ان کا معائنہ روانگی سے پہلے اور واپسی کے بعد ہونا چاہیے۔ روانگی کے وقت جو ملاحظہ کیا جائے اس میں وزن ۔ جسامت قابلیت سفر ۔ دل کی حالت پر خاص توجہ کی جائے واپسی پر یہ دیکھا جائے کہ آیا وزن چستی ۔ جسمانی قوت میں کوئی اصلاح ہوئی ہے یا نہیں۔

تیرنا سیکھنے کے حوضوں میں جانے سے پہلے معائنہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کوئی جلدی یا متعدی مرض تو نہیں ہے جس کی وجہ سے دوسرے بچوں کی صحت خطرہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تیرنا بچے کے مناسب حال ہے یا نہیں۔

متعدی امراض کا انسداد

اگر کسی بچہ کو کوئی مرض متعدی مثلاً خسرہ ۔ چیچک ۔ ہیضہ ۔ کالی کھانسی ۔ سرخ بخار ۔ کنپھیڑ

(Mumps) موتیا سیتلا یا جدری کا ذب چیکن پاکس جرمن میزل۔ محرقہ لطبی (ٹائیفائڈ) خناق وبائی (ڈفتھیریا) وغیرہ ہو جائے تو باقی بچوں سے اس کو فوراً علٰحدہ کر دیا جائے۔ تاکہ مرض دوسرے بچوں میں نہ پھیلے۔ جن درس گاہوں میں شفاخانہ کا انتظام ہو وہاں ایسے بچوں کا علاج دوسرے مریضوں سے علٰحدہ کمروں میں رکھکر کیا جائے جو بچے کسی مرض میں بیمار ہو کر گھر چلے جائیں ان کے والدین اور سرپرستوں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ہیڈ ماسٹر کو اس کے مرض کے متعلق اطلاع دیں اور متذکرہ بالا متعدی امراض میں سے اگر کسی مرض میں مبتلا ہو گیا ہو تو لکھیں اور ہیڈ ماسٹر اس کی اطلاع اسکول ڈاکٹر کو دیں۔

جس جماعت میں کوئی واردات مرض متعدی کی ہو جائے اسکول ڈاکٹر کو لازم ہے کہ اس جماعت کو خصوصیت سے زیر نظر رکھے تاکہ کسی دوسرے بچہ میں اگر مرض کے آثار معلوم ہوں تو اس کو ہر وقت باقی بچوں سے علٰحدہ کیا جاسکے اگر مسلسل کئی وارداتیں اسکول میں متعدی مرض کی ہو جائیں تو ڈاکٹر اسکول کے بند کرنے کی رائے دے سکتا ہے۔ وہ کمرہ جس میں مرض متعدی کی واردات ہوئی ہو کافی طور سے ڈس انفکٹ کرایا جائے اور تمام اُن امور پر (جن کا ذکر باعث طوالت ہے) عمل پیرا ہونا چاہیے جو مرض کو پھیلنے سے روک سکیں۔ اگر کوئی مرض متعدی اسکول کے قریب کی بستی میں پھیلا ہوا ہو یا کسی ایسے مرض کے پھیل جانے کا موسم ہو تو اس کی روک تھام کی کارروائی کی جائے۔ حفظ ماتقدم کے متعلق ہدایات جاری کی جائیں۔

سل ودق کے متعلق خصوصیت سے توجہ ہونی چاہیے۔ اگر کوئی بچہ اس مرض میں مبتلا پایا جائے تو اس کو فوراً اسکول سے علٰحدہ کر دیا جائے کیونکہ ایسی حالت میں معمولی اسکولوں میں تعلیم جاری رکھنا خود اس بچہ کے لیے بھی مضر ہے اور دوسرے بچوں کے لیے بھی جن کے ساتھ وہ پڑھتا ہے خطرہ کا باعث ہے۔ اگر کوئی ملازم اسکول سل ودق میں مریض ہو جائے تو اس کو بھی رخصت دیکر اسکول سے علٰحدہ کر دیا جائے۔

اسکول کی عمارت کا ملاحظہ

اسکول ڈاکٹر کے فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسکول کی عمارت اور اس کے گرد وپیش کا ملاحظہ حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے کرتا رہے اس بات کا اطمینان کرے کہ اسکول کے تمام کمروں میں روشنی۔ ہوا کی آمد برآمد اور پینے کے پانی کا ٹھیک انتظام ہے۔ پیشاب خانے اور پاخانے صاف رہتے ہیں۔ اسکول کے صحن سے پانی کا نکاس بخوبی ہو سکتا ہے (ڈرینیج ٹھیک ہے) کمرے نمدار تو نہیں ہیں گرمی کے موسم میں کمرے زیادہ تپتے تو نہیں ہیں۔ سردی میں بہت زیادہ ٹھنڈے تو نہیں رہتے اور یہ کہ کمروں میں مناسب تعداد سے زیادہ طلبا تو نہیں پڑھتے ان امور کے متعلق تمام نقائص کی اطلاع افسر متعلقہ اسکول کو دیجائے۔ اس قسم کا ملاحظہ سال میں دو دفعہ کافی ہے۔

حفظ صحت کے متعلق والدین کو ہدایات

بچوں کے والدین کو مفصلہ ذیل ہدایات بھیجی جائیں تاکہ طبی معائنہ سے ان کو بد گمانی نہ ہو اور خود بھی اپنے بچوں کے حفظ صحت کا خیال رکھ سکیں۔

اسکول کے اربابِ حل و عقد نے یہ انتظام کیا ہے کہ طلبا کا طبی معائنہ بزمانہ تعلیم ڈاکٹر سے کرا دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ وہ امراض جو والدین کو اپنے بچوں میں معلوم نہیں ہو سکے طبی معائنہ سے معلوم ہو جائیں اور بروقت علاج کیا جا سکے۔ بعض امراض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسکول کے دوسرے بچوں کے لیے خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں لہٰذا ان کا انسداد ہو سکے۔ والدین کو اس بات کا اختیار ہے کہ مرض کی اطلاع پانے پر حسب طبیب یا ڈاکٹر سے چاہیں بغرض علاج رجوع کریں مگر یہ نہ ہونا چاہیے کہ بچہ اسکول میں پڑھتا ہے اور کسی مرض میں مبتلا رہے لیکن اس کی اطلاع والدین کو نہ ہو سکے۔

حفظانِ صحت کی پابندی ہر بچہ پر لازمی ہے اگر ان قواعد کی طرف سے غفلت کی جائے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تندرست بچے بھی بیمار ہو جائیں گے انسانی زندگی اور تندرستی کے لیے تازہ ہوا۔ پاک و صاف پانی اور سورج کی روشنی نہایت ضروری ہیں۔ ہندوستان اگرچہ مفلس ملک ہے لیکن ان امور میں خداوند کریم کی عطایا سے بہرہ ور ہے۔ تازہ ہوا کی آمد کے لیے کمروں کی کھڑکیاں کھلی رہنی چاہئیں۔ خصوصاً ان کمروں کی جن میں بچے سوتے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں سے بچانے کے لیے بچوں کو کافی اور مناسب لباس پہنائے رکھنا چاہیے۔ لیکن بہت زیادہ کپڑے پہنانا بھی مناسب نہیں۔ سورج کی روشنی ہر مکان میں آنی چاہیے مثل مشہور ہے کہ جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی وہاں ڈاکٹر پہنچتا ہے۔ پانی پاک و صاف ہونا چاہیے گرمی اور برسات میں اس امر کی جانب خصوصیت سے توجہ رہے۔ برسات کے موسم میں اگر جوش دیکر اور ٹھنڈا کر کے پانی پلایا جائے تو بہتر ہے۔

غذا۔ بچوں کا کھانا عمدہ اور سادہ ہونا چاہیے تکلفات کی ضرورت نہیں۔ کھانا ہمیشہ اوقات معینہ پر دیا جائے۔ شام کا کھانا بچوں کو جلد کھلا دینا چاہیے اور ہلکا ہونا چاہیے۔ کھانا خوب پکا ہوا اور تازہ دینا چاہیے۔ کھانا اعتدال سے کھلائیں اور بچہ کی عمر کے مطابق دن میں کئی بار کھلائیں۔ کھانے سے عین پہلے یا عین پیچھے پانی نہ پلائیں۔ کھانا کھاتے ہوئے تھوڑا سا پانی پلا دیں پھر دو تین گھنٹہ بعد پانی پلا دیں۔ کھانے کے وقت زیادہ پانی پینے سے معدہ کی ہاضم رطوبت پتلی ہو کر بدہضمی ہو جاتی ہے۔ بہت سرد پانی بھی ہاضمہ کو بگاڑتا ہے۔ برف کا بہت ٹھنڈا پانی بھی ٹھیک نہیں تازہ پانی مناسب ہے۔ مٹھائی۔ لڈو پیڑا وغیرہ زیادہ کھلانے سے بھی ہضم خراب ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد تھوڑا آرام کرانا چاہیے۔ کھانے کے فوراً بعد دماغی یا جسمانی کام شروع نہ کرایا جائے

ورنہ ہاضمہ میں فتور آجائیگا۔ کسی سخت جسمانی یا دماغی محنت کے بعد فوراً کھانا نہ دینا چاہیے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد فوراً بچہ کا سو جانا منافی صحت ہے۔ کھانے اور سونے میں دو تین گھنٹہ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ اور اس کی احتیاط خصوصیت سے موسم گرما اور برسات میں رہنی چاہیے۔ کھانے کی چیزیں مکھیوں سے محفوظ رہیں کیونکہ مکھیوں کے ذریعہ بہت سے خطرناک امراض پھیلتے ہیں۔ ہر روز ایک ہی قسم کا کھانا نہ دیا جائے بلکہ تبدیل کرتے رہیں۔ بچوں کے کھانے کا بخوبی انتظام کریں ورنہ بچے بازار کی کچی پکی چیزیں کھا کر اپنا ہاضمہ خراب کریں گے جس سے صحت بگڑ جائے گی۔

دانت ۔ صحت وقوت اور پورے طور سے کمانے کی قابلیت کا انحصار بہت کچھ دانتوں کی حالت پر ہے۔ دانتوں کو کیڑا لگا ہوا ہو تو صحت بگڑ جاتی ہے۔ نہ صرف بدہضمی پیدا ہو کر بلکہ آہستہ آہستہ خراب دانتوں سے زہریلا مادہ جسم میں جذب ہو کر ایک مضبوط آدمی دانتوں کی صفائی کی طرف سے غفلت کر کے کمزور ہو جاتا ہے اور کسب معاش کے قابل ہو جاتا ہے دودھ کے دانتوں کی صفائی کی عموماً پروا نہیں کی جاتی لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ دودھ کا دانت خراب ہو کر مستقل دانت کو جو برابر میں نکلتا ہے نقصان پہنچاتا ہے۔ دانت عموماً نامناسب غذا سے یا غذا کے ذرات کے دانتوں کی درزوں میں چمٹے رہنے سے خراب ہوتے ہیں۔ مناسب برش یا مسواک سے دانتوں کو صاف کرتے رہنا دانتوں اور صحت کے قیام کے لیے بڑی حد تک کارآمد ہے۔ ہر بچہ کا برش اور مسواک علیحدہ ہو۔ سخت نہ ہوں کہ مسوڑوں کو چھیل دیں۔ دانتوں کی صفائی کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے۔ گندے دانت مختلف امراض پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ دانت صبح وشام صاف کئے جائیں۔ نہ صرف سامنے کی طرف سے بلکہ پیچھے کی طرف سے بھی اور نیز درزوں میں سے بھی۔ سونے سے پہلے دانتوں کو صاف کرنا ضروری ہے۔ نمازی بچے وضو کرنے کے وقت اگر مسواک کر لیا کریں تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ بچہ بستر پر لیٹا ہوا بسکٹ مٹھائی یا کوئی اور کھانے کی چیز نہ کھاتا رہے اور بلا دانت صاف کیے ویسے ہی نہ سو جائے۔ خوب چبائے بغیر کوئی غذا نگلی نہ جائے۔ اگر غذا بلا چبائے نگل لی جائے گی تو دانتوں کو کم کام کرنا پڑے گا اور اس طرح دانتوں سے مناسب کام نہ لینا بھی ان کو خراب کر دیگا۔ بلا چبایا ہوا کھانا معدہ پر بیجا بار ڈال کر ہاضمہ کو بگاڑنے کا باعث ہوگا اور صحت خراب ہو جائے گی۔

لباس ۔ لباس موسم کے مناسب اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ کم از کم ہر ہفتہ لباس اور چادر میں تبدیلی ہونی چاہئیں۔ موسم گرما میں اس سے بھی جلد تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میلے کپڑوں میں جوئیں ہو جاتی ہیں اور جوؤں کے ذریعہ بعض خطرناک امراض پھیلتے ہیں۔ جن بچوں کے کپڑوں میں جوئیں ہو جائیں ان کو گرم پانی سے غسل دیا جائے اور کپڑے پانی میں جوش دیئے جائیں تاکہ جوئیں مر جائیں۔ بستر کے کپڑے بھی ہفتہ وار

پاپوش ۔ جوتوں کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے ۔ ایسے جوتے جو گرمی اور سردی سے پاؤں کو محفوظ نہ رکھ سکیں اور جن میں پانی اور نمی کا اثر ہو سکے مضر صحت ہیں ۔ تنگ جوتے جو پاؤں کو دبائیں ٹھیک نہیں ہیں ۔

سونا اور بیدار ہونا ۔ بچوں کو رات کے وقت جلدی سونا اور صبح سویرے اُٹھنا چاہیے ، بعد مغرب دعوتوں اور کھیل تماشوں سے چھوٹے بچوں کو بچانا چاہیے ۔

آنکھیں اور نظر ۔ ناقص نظر بچے کی تعلیمی ترقی میں حائج ہوتی ہے اور آئندہ مشاغل زندگی میں ۔ اس لیے والدین کو خیال رکھنا چاہیے کہ بچے گھر میں کم روشنی میں لکھنا پڑھنا سینا پرونا یا کوئی اور دیدہ ریزی کا کام نہ کریں ۔ راتوں کو دیر تک نہ پڑھیں ۔ اگر بچہ اکثر درد سر کی شکایت کرے تو نظر کا معائنہ کرائیں ۔ اگر نظر ناقص ہو اور عینک کی ضرورت ہو تو اس کا انتظام کرنا چاہیے ورنہ نظر کے دن بدن خراب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ بہتر ہو کہ عینک کے ماہر خصوصی سے عینک کا نسخہ لیا جائے ۔

بھینگا پن ۔ نظر ناقص ہوتی ہے تو بھینگے پن کا اندیشہ رہتا ہے ۔ نظر کی خرابی کے ساتھ اگر بھینگا پن بھی ہو تو مناسب عینک سے عموماً اس کی اصلاح ہو جاتی ہے ۔ اگر بروقت طبی مشورے سے اصلاح نہ کرائی جائے گی تو ممکن ہے عمل جراحی کی ضرورت پڑے ۔ بھینگی آنکھ کا ضرور علاج کرانا چاہیے ۔ غفلت سے کلی یا جزوی طور سے آنکھ کے اندھا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے ۔

آشوب چشم ۔ عموماً نادرستی صحت ، صفائی کی کمی یا آنکھ پر بیجا زور پڑنے سے پیدا ہوتی ہے ممکن ہے عینک کی ضرورت ہو اور نظر کے نقص کے سبب آشوب چشم ہوتا ہو بعض دفعہ آنکھ کے پردۂ قرنیہ پر زخم ہو جاتا ہے جس سے آنکھ میں پھولا ہو جاتا ہے یا اندھے ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ اس لیے آشوب چشم کا پوری توجہ سے علاج کرانا چاہیے ۔ بعض اوقات ایک وقت کئی بچوں کو ایک ہی خاندان میں آشوب چشم ہو جاتا ہے ۔ چونکہ یہ مرض متعدی ہے اس لیے اگر ایک بچہ کو آشوب چشم ہو جائے تو دوسرے بچوں کو بچانا چاہیے ایک ہی تولیہ سے بیمار اور تندرست بچہ کا منہ نہ پوچھیں ایک ہی بستر پر تندرست اور بیمار کو نہ سلائیں ۔

منہ سے سانس لینا ۔ گلا بڑھ جانا (ورم لوزتین) اور ایڈینائڈ

بچوں کو سکھانا چاہیے کہ سانس لینے کا طریق کیا ہے ۔ منہ کھانے پینے کے لیے ہے اور ناک سانس لینے کے لیے ۔ بچوں کو بتلانا چاہیے کہ وہ ناک سے سانس لیں اور منہ کو بند رکھیں ۔ ناک کے راستے کو رطوبت سے صاف رکھنے کے لیے ہر بچہ کے پاس ایک رومال رہنا چاہیے جو بچے اپنا منہ بند کرکے سانس نہ لے سکیں ان کو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے ۔ بعض بچوں میں بار بار زکام ہونے سے ناک کے پچھلے سوراخوں کے قریب ابھار سے پیدا ہو جاتے ہیں اُن کو ایڈی نائڈ کہتے ہیں ۔ ساتھ ہی گلے بڑھ جاتے ہیں ایڈی نائڈ

کی موجودگی کے باعث بچوں سے ٹھیک طور سے سانس نہیں لیا جاتا اس سے بڑے خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں - امراض سینہ پیدا ہو جاتے ہیں سینہ پوری طرح نشو ونما نہیں پاتا اور آئندہ چل کر سل و دق آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے - بچہ عموماً بہرہ ہو جاتا ہے یا اس کا کان بہنے لگتا ہے - سبق یاد کرنے میں سست ہو جاتا ہے - ہاضمہ بگڑ جاتا ہے - بچہ کی صحت بگڑ جاتی ہے - اس لیے ایڈی نائڈز اور گلوں (ٹانسلائٹس) کا جلدی علاج کرائیں - جو بچے ناک سے سانس لیتے ہیں - اُن کے ان امراض سے محفوظ رہنے کا زیادہ امکان ہے اس لیے خیال رکھیے کہ آپ کے بچے ناک سے سانس لیا کریں اور منہ بند رکھا کریں -

کان بہنا - کان بہنا خطرہ سے خالی نہیں بعض اوقات اس سے دماغی سوزش ہو جاتی ہے - جو نہایت خطرناک ہے - جتنا جلد اس کا علاج کیا جائے اتنا ہی آسانی ہو سکتا ہے - کان بہنے کے علاج میں غفلت نہ برتی جائے -

داد - جن بچوں کے سر پہ داد ہوں - ان کو اسکول نہ جانا چاہیے - کیونکہ دوسرے بچوں کو اس مرض کے ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے - جن بچوں کے سر میں داد ہوتے ہیں ان کی تعلیم کا بہت ہرج ہوتا ہے اس لیے توجہ سے علاج کرایا جائے -

جسمانی صفائی

گندگی (میلا پن) بیماری پیدا کرتی ہے - اس لیے بچوں کو صاف ستھرا رکھنا چاہیے - ہر روز پانی اور صابون سے غسل کرانا ضروری سمجھیں - کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے جائیں ناخن بڑھنے نہ پائیں - بڑھے ہوئے ناخنوں کے نیچے میل جمع ہو جاتی ہے جس میں مختلف امراض کے جراثیم ہوتے ہیں جو خطرناک امراض پیدا کر سکتے ہیں اور انسان کی صحت اور بعض اوقات جان کو نقصان پہنچاتے ہیں -

بال

بال صاف رہنے چاہئیں تاکہ جوئیں نہ ہو جائیں - جوئیں زخم پیدا کر دیتی ہیں جن سے غدود بڑھ جاتے ہیں اور بچوں کو تکلیف ہوتی ہے - چھوٹے اور صاف بال لمبے اور نا صاف بالوں سے بہتر ہیں - لڑکوں کے چھوٹے بالوں میں لڑکیوں کے لمبے بالوں کی نسبت جوئیں کم ہوتی ہیں -

خارش

اس مرض کا ایک چھوٹا سا کیڑا ہوتا ہے - مریض اور مریض کی مستعملہ اشیاء کے ذریعہ یہ مرض

پھیلتا ہے۔ عموماً انگلیوں کی گھائیوں اور کلائیوں میں اول اول یہ مرض شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتا ہے۔ جو بچّہ بار بار کھجلاتا ہو اور اس کے ان حصوں میں زخم ہوگئے ہوں اُس کو غالباً خارش ہے۔ اس حالت میں بچہ کو اسکول نہ بھیجنا چاہیے ورنہ دوسرے بچوں میں یہ مرض پھیل جائے گا۔ گھر میں بھی احتیاط رکھنی چاہیے ورنہ ماں باپ اور گھر کے دوسرے بچوں کو خارش ہو جائے گی۔ اس مرض کا علاج توجہ سے کرائیں۔

تمباکو

تمباکو کا رواج سگرٹ نوشی کی شکل میں بڑھتا جاتا ہے والدین کو چاہیے کہ تمباکو پینے اور پان کے ساتھ کھانے سے بچوں کو روکیں۔ تمباکو کا استعمال مضر صحت عادت ہے۔ دیر یا سویر اس کا مضر اثر ضرور پڑتا ہے تمباکو میں نکوٹین اور نکوٹین میں دو جوھر پائے جاتے ہیں اور دونوں سم قاتل ہیں۔ تمباکو کا خراب اثر دل۔ دماغ۔ پھیپھڑے۔ معدہ اور آنکھ پر خصوصیت سے پڑتا ہے۔ اس کے استعمال سے۔ سر درد۔ بے خوابی ضعف معدہ۔ ضعف بصارت۔ کھانسی وغیرہ امراض ہو جاتے ہیں۔ ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ دھڑکن ہو جاتی ہے ٹوبیکو ہارٹ مشہور ہے۔ تمباکو نوشی سے ہوشیار اور ذہین بچے کند ذہن ہو جاتے ہیں۔ اس کا کثرت استعمال غضب ڈھاتا ہے۔ رعشہ۔ دیوانگی۔ فالج اور سرطان لب پیدا ہو جاتے ہیں۔ تمباکو بچّہ کی جسمانی اور دماغی نشوو نما پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔

گذشتہ سال کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم سگرٹ نوشی کے عادی تھے۔ امتحان کے قریب جو کچھ پڑھتے تھے بھول جاتے تھے۔ حیران تھے کہ کیا کیا جائے۔ ادھر امتحان کا قرب اُدھر حافظہ کی یہ حالت! آخر یہی سمجھ میں آیا کہ حافظہ کی یہ خرابی سگرٹ نوشی کی وجہ سے ہے سگرٹ پھینک دیا اور ترک سگرٹ نوشی کا عہد کر لیا لیکن چونکہ تمباکو کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک دم چھوڑ دینے سے پستی۔ ناتوانی اور ضعف کے آثار پیدا ہو گئے۔ پڑھنا درکنار اب چارپائی سے اُٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ رفع ضعف کے لیے چاء پینی شروع کی تو نیند اُڑ گئی۔ بے خوابی کی وجہ سے دماغ پریشان ہو گیا۔ اس حالت اضطرار میں راقم الحروف پہنچ گیا۔ اور تسلّی و دلاسا دیا۔ مختلف تدابیر کیں۔ بدقت امتحان میں شریک ہونے کے قابل ہوئے اور غنیمت ہے کہ پاس ہو گئے۔

(ماخوذ از اسکول ڈاکٹرز ان جرمنی۔ لندن کونٹی کونسل کی ہدایات ہائی جین اینڈ پبلک ہیلتھ انڈین میڈیکل گزٹ ۱۹۲۲ء وغیرہ وغیرہ)

لیکچر نمبر (۱۲)

کم لاگت کے اسکول

مرتبہ

خانصاحب سید مقبول شاہ صاحب آئی ای ایس انسپکٹر ورنیکولر

ایجوکیشن پنجاب۔ مقام لاہور

آج کل یہ شکایت اکثر سننے میں آتی ہے کہ ہمارے ملک میں افسرانِ تعلیم کو شاندار اور نمائشی عمارتوں کا اتنا شوق ہے کہ ملک کا بہت سا روپیہ جو خاص تعلیم کے کام میں مفید ثابت ہوتا ہے محض عمارات پر خرچ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ زمانہ قدیم میں جب ہندوستان میں بڑے بڑے علامہ۔ فلسفی۔ مہندس۔ منجم وغیرہ وغیرہ پیدا ہوئے تھے اس وقت بڑی سے بڑی تعلیم گاہوں کے لیے بھی شاندار عمارات کی بالکل ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی آج کل مدرسوں کی عمارتیں ایسی شاندار نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے ملک میں رائج ہو رہی ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں پنجاب کے ایک ضلع کے ایک یورپین ڈپٹی کمشنر صاحب نے ایک ورنیکلر مڈل اسکول کی عمارت کے متعلق جو کہ ایک معمولی عمارت ہے یوں لکھا ہے کہ یہ ایک ایسی عالی شان عمارت ہے کہ انگلستان کے بہت سے سکنڈری مدارس کے لیے باعثِ رشک ہوگی۔ یہ خیال کسی حد تک درست ہے۔ مثلاً پنجاب کے بعض گورنمنٹ ہائی اسکولوں پر دو دو لاکھ کے قریب خرچ آیا ہے۔ حالانکہ ان میں صرف کوئی پانچ یا چھ سو لڑکے تعلیم پاتے ہیں اور ایک نارمل اسکول کی لاگت کا اسٹیمیٹ جس میں ایک سو بیس لڑکوں کی گنجائش رکھی گئی تھی ایک لاکھ چوراسی ہزار کا تھا۔ اور کئی ایک ورنیکلر مڈل اسکولوں پر پچیس پچیس تیس تیس ہزار خرچ آیا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک

ایسی عمارت کا ہونا تقریباً ہر حالت میں لازمی ہے جس میں تعلیم اور حفظان صحت کی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ کیونکہ مکان مدرسہ کا مدعا نہ صرف یہ ہی کہ طلبا اپنی مشاغل علمی میں پوری توجہ سے مصروف رہ سکیں بلکہ اور بھی بہت سے اغراض ہیں مثلاً چونکہ طلبا کو روزانہ کئی گھنٹوں تک کمروں میں جمع ہو کر مسلسل دماغی کام کرنا پڑتا ہی۔ اس لیے اس بات کی احتیاط لازمی ہے کہ اُس سے اُن کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے۔ دوئم یہ کہ اس طرح حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی میں روزانہ عملی ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ سوئم۔ مکان مدرسہ اُس علاقہ کے لیے جس کے طلبا وہاں پڑھتے ہیں ایک موزوں عمارت کا نمونہ ہونا چاہیے۔ اور وہ عمارت ایسی ہو کہ از خود بھی تعلیم کا مدعا پورا کرے اور طلبار کے دلوں میں وہ اثرات پیدا کرے جو آئندہ زندگی میں ان کے لیے مفید ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہندوستان کے زمانہ قدیم میں اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں زمانۂ حال میں ایک پُر فضا کھلی جگہ میں درختوں کے نیچے طلبا کو تعلیم دینا بہت مفید سمجھا گیا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امریکہ میں سردیوں کے لیے طلبا کی پوشش کا خاص انتظام کیا جاتا ہے اور یہ کہ ہندوستان میں آبادی اب پہلے کی نسبت اسقدر بڑھ گئی ہے اور زراعت اتنی پھیل گئی ہے کہ ایسے موزوں مواقع جو گذشتہ زمانہ میں عام طور پر ہر جگہ ملتے تھے اب بہت نایاب ہیں۔ اگر دیہات میں کہیں کوئی ایسا موقعہ ہو بھی تو گاؤں کے لوگ اسپنے اور اپنے مال مویشی کے آرام کے لیے مخصوص کر لیتے ہیں اب طلبا کی تعداد بھی ہر جگہ بہت بڑھ گئی ہے اور گاؤں گاؤں میں مدرسے قائم ہو گئے ہیں۔ اس لیے مدرسہ کا اپنا مکان ہونا بہت ضروری ہے نیز ہندوستان کے اکثر علاقوں میں موسمی تبدیلیاں اتنی بڑی بڑی اور ایسی فوری ہوتی ہیں کہ ساری سال میں کھلے میدان میں یا درختوں کے نیچے مدرسہ رکھنا ناممکن ہے مثلاً کبھی تیز آندھیاں چلتی ہیں کبھی بارش ہو جاتی ہے کبھی سخت گرمی پڑتی ہے اور کبھی سخت سردی ہوتی ہی اور آج کل ایسی چھوٹی چھوٹی عمر کے طلبا مدرسوں میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کی صحت کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچوں کی عام صحت جیسی ہمارے بزرگوں کے زمانہ میں ہوتی تھی اب نہیں رہی ہیں ان سب حالات کو مدِنظر رکھ کر یہ ضروری ہے کہ مدرسہ کے لیے مکان اپنا ہی ہو خواہ وہ کیسا ہی سادہ اور مختصر کیوں نہ ہو۔ اور وہ مکان ایسا ہو کہ جس میں تعلیم اور حفظان صحت کی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ البتہ ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے تعمیرات کے خرچ میں بہت کچھ کمی کی جا سکتی ہی۔

مدرسہ کی تعمیر سے پہلے ذیل کے اصولوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

اول۔ موقعہ مناسب ہو۔ دیہاتی مدرسے گاؤں سے باہر بنائے جائیں اور اس متعفن حلقہ سے

کچھ فاصلہ پر ہوں جو ہماری مواضعات اور قصبات کے گرد اگرد اکثر پایا جاتا ہے۔ جہاں کھیتیوں کے لیے کھاد کا ذخیرہ رکھا جاتا ہے اور گاؤں والے وہیں رفع حاجت بھی کرتے ہیں۔ موقع حتی الوسع ایسا اونچا ہو کہ برسات کے دنوں میں مدرسہ نمدار نہ ہونے پائے۔ شارع عام کے گرد وغبار اور شور وغل سے بھی ہٹا ہوا ہو۔ زمین شورا اور دیمک والی نہ ہو۔ ورنہ بعد میں بہت دقت پیش آئے گی۔ جہاں ایک مدرسہ کئی گاؤں کے لیے مشترک ہو وہ ان سب کے مرکز میں واقع ہونا چاہیے کہیں ان میں سے ایک گاؤں کے اتنا نزدیک ہونا چاہیے کہ مدرسین اور طلبا کی ضروریات آسانی سے بہم ہو سکیں اور سامان مدرسہ کی بھی محافظت ہو سکے۔ پانی کے لیے چشمہ یا کنواں یا ندی نالہ اگر قریب ہو تو بہت بہتر ہے۔ لیکن گندے جوہڑ کے کنارے مدرسہ نہ بنایا جائے اور نہ ایسے کوئیں وغیرہ کے نزدیک جہاں گانوں کی عورتیں پانی بھرنے آتی ہوں۔ اگر سایہ دار درخت آس پاس ہوں تو نہایت اچھا ہے۔ بسا اوقات جماعتیں ان کے سایہ میں بٹھائی جا سکتی ہیں۔ وہاں بیٹھنا کمروں کے اندر بیٹھنے سے بہتر ہے۔ اس صورت میں بڑی تعداد کے لیے بھی ایک مختصر سا مکان کافی ہوگا۔ کل احاطہ مدرسہ پرائمری اسکول کے لیے دو کنال سے کم نہ ہو۔ اور مڈل اور ہائی اسکولوں کے لیے چھ سات ایکڑے سے کم نہ ہوں۔ تاکہ کھیل کے واسطے بھی کچھ میدان میسر ہو اور باغیچہ بھی لگایا جا سکے۔ شہروں اور قصبوں کے اندر کے پرائمری مدارس دو منزلے ہونے چاہئیں کیونکہ وہاں کافی زمین آسانی سے نہیں مل سکتی۔

دویم ۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کمرہ مدرسہ سردیوں میں سرد ہواؤں سے اور گرمیوں میں دھوپ کی تپش سے محفوظ رہے۔ چونکہ پرائمری اسکول میں پنکھے نہیں دئے جاتے اس لیے مدرسہ کا رُخ اس طرف ہونا چاہیے جس طرف سے گرمی اور برسات میں ہوا عام طور پر چلتی ہے۔ شمالی ہندوستان میں یعنی خط سرطان کے اوپر اور جنوبی رُخ کا مکان اکثر جگہ ان سب ضروریات کے لیے اچھا ہوگا۔ کیونکہ آفتاب ہمیشہ جنوب کی طرف رہتا ہے اور جنوبی برآمدہ اس کی تپش سے کمرہ کو بچائے گا۔ اور شمالی روشنی جو سب سے زیادہ مفید ہے۔ شمال کی طرف برآمدہ نہ ہونے سے بلا رکاوٹ اندر آئے گی اور گرمیوں میں چونکہ ہوا اکثر جنوب یا مشرق سے آتی ہے وہ دروازوں میں سے کمرے کے اندر بخوبی داخل ہو سکے گی۔ اور سردیوں میں شمال کی سخت سرد ہواؤں سے لڑکے محفوظ رہیں گے۔

سویم ۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ روشنی طلبا پر سامنے سے ہرگز نہ پڑے اور طرفین سے بھی ایک جیسی روشنی نہ آئے بلکہ زیادہ روشنی بائیں جانب سے کچھ اوپر سے آئے۔ اور کوئی

طالبِ علم روشنی کی جگہ سے چوبیس فٹ سے زیادہ دور نہ بیٹھے۔

چہارم۔ دروازے اور کھڑکیاں اس طرح لگائی جائیں کہ سب طلبا کو روشنی اور ہوا کا پورا پورا فائدہ ملے اس لیے کمرے کے سامنے کی دیوار میں دو دروازے دوسروں پر اور اُن کے بیچ میں ایک یا دو کھڑکیاں ہوں۔ اور پچھلی دیوار میں اتنی ہی کھڑکیاں عین ان کے سامنے ہونی چاہئیں۔ اور چھت کے قریب دیوار میں روشندان بھی دونوں طرف ہوں تاکہ ہوا کی آمد و رفت کمرے کے ہر حصہ میں رہے۔ کھڑکیاں فرش سے دو ڈھائی فٹ کی بلندی پر ہوں عرضی دیواروں میں اگر نیچے فرش کے قریب اور اُوپر چھت کے قریب چھوٹے چھوٹے گول سوراخ ہوں جس میں سے ہوا تو آجا سکے لیکن روشنی کی چمک نہ آئے تو مدرسہ کی لمبائی میں بھی ہوا کی رو جاری رہ سکتی ہے۔ دیہاتی مدرسوں میں کھڑکیوں اور دروازوں میں شیشوں کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ روشندانوں میں بھی شیشوں کی بجائے آہنی جالی بہتر ہے۔ تاکہ ہر وقت ہوا آجا سکے۔ کھڑکیوں کے اوپر شیشی والے فین لائٹ کی بجائے بھی اگر جالی ہو تو بہتر ہے اور کھڑکیوں اور روشندانوں کے اوپر جو چھجے ہوتے ہیں وہ ایسے ہونے چاہئیں کہ ایک رسی کے ذریعہ اندر سے ہی اُٹھائے بھی جا سکیں تاکہ ضرورت کے وقت زیادہ روشنی کیواسطے ان کو اٹھا لیا جا سکے۔ اور بارش کے وقت گرا دیا جا سکے۔ دیہات میں اور بچوں کے مدرسہ میں شیشے کی حفاظت بہت مشکل ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ شیشے ٹوٹ گئے ہیں اور مہینوں تک ان کی مرمت نہیں ہوئی پنجاب کے ایک ضلع میں بجائے کھڑکیوں کے جھلملی لگائی گئی ہے گو بجائے چھوٹے چھوٹے تختیوں کے اُن میں بڑے بڑے تین یا چار تختے ہیں۔ اس کا یہ فائدہ ہے کہ اول تو روشنی اور ہوا کی آمد میں حسب ضرورت کمی بیشی اور رُخ کی تبدیل بآسانی ہو سکتی ہے دوم یہ کہ عام کھڑکیوں میں اگر ان کے کواڑ اندر کی طرف دیوار سے باہر نکلے ہوئے ہوں تو اکثر لڑکوں کے اٹھتے ہوئی ضرب آتی ہے۔ جھلملی میں یہ خطرہ بالکل نہیں۔ سوم یہ کھڑکیوں کی نسبت زیادہ چوڑی ہو سکتی ہیں۔ چہارم اگر ان کو کھلا ہی چھوڑ دیا جائے تو بھی کتا وغیرہ یا انسان کھڑکی میں سے اندر نہیں گھس سکتا۔ فرش حتی الوسع پختہ ہونا چاہیے اور اگر کچا ہو تو مدرس کو چاہیے کہ لڑکوں کی امداد سے ہر مہینہ میں ایک دو دفعہ اس پر لپائی کر دیا کرے تاکہ گرد نہ اُٹھے جو صحت کے واسطے بہت مضر ہوتی ہے لڑکوں کو اپنے مدرسے کی اس قسم کی خدمت سے عار نہیں ہونا چاہیے۔

پنجم۔ لکڑی کے گھومنے والی یا ایزل والے بلیک بورڈ کی بجائے دیوارتی بلیک بورڈ سیمنٹ بہتر ہے۔ کیونکہ پہلی قسم کے جگہ بہت گھیرتے ہیں۔ اور اسی قدر طلبا کو بیٹھنے کے واسطے جگہ کم رہ جاتی ہے اور جلدی خراب بھی ہو جاتی ہیں، اور ٹوٹ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کئی ماہ تک جب تک کہ

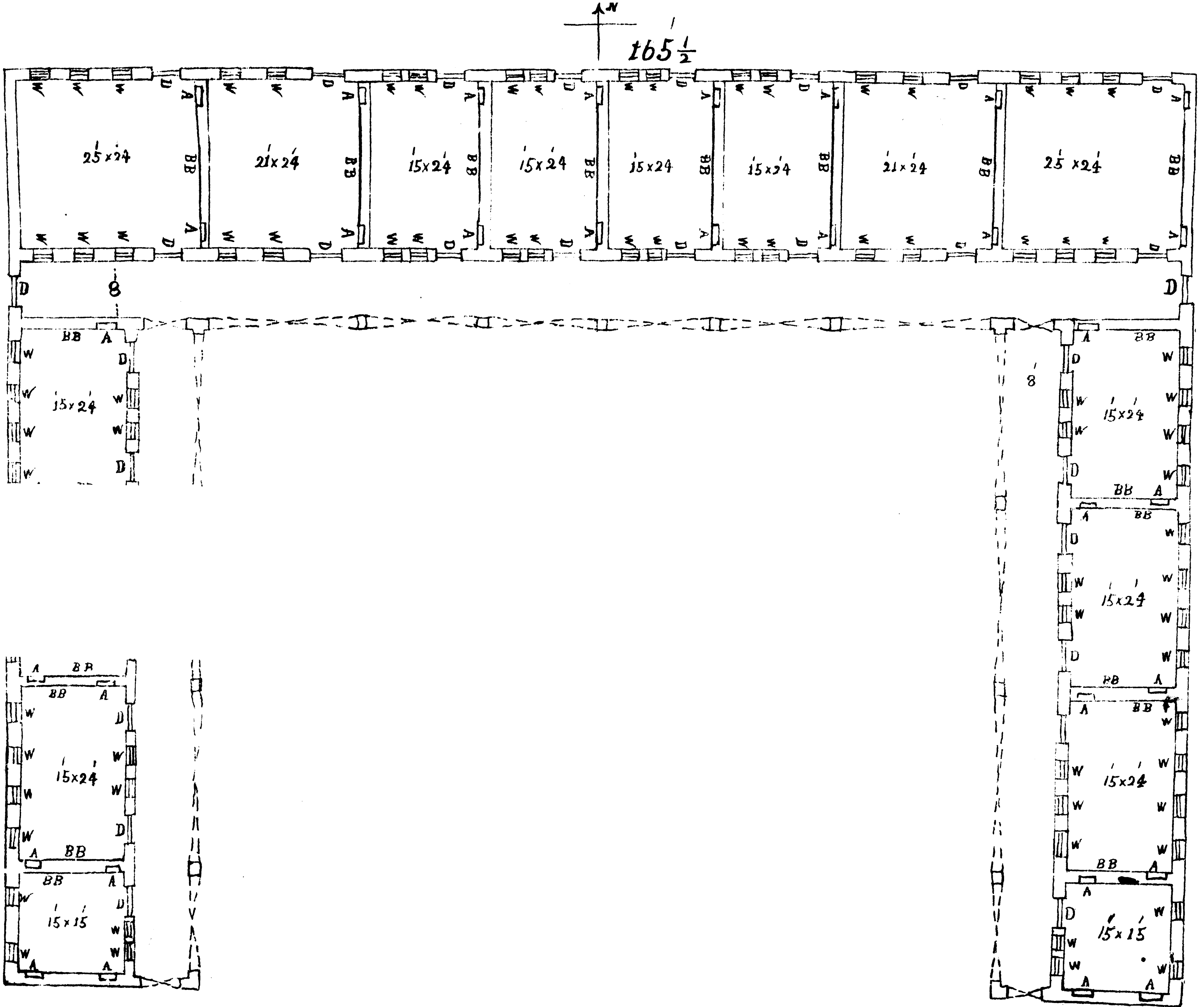
ڈسٹرکٹ بورڈ سے منظوری حاصل کر کے نیا تختہ سیاہ مہیا نہ کیا جائے مدرسہ اس نہایت ضروری چیز سے محروم رہتا ہے۔ بلیک بورڈ خواہ سیمنٹ کا ہو خواہ آہنی چادر ہو خواہ لکڑی کا ہو کمرے کی عرضی دیوار کے وسط میں ذرا بائیں طرف فرش سے کوئی تین فٹ کی بلندی پر ہونا چاہیے۔ اور دس فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا ہو۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ الماری سے لیکر دیوار کے بائیں انجام تک لمبا ہو تاکہ مدرس اگر چاہے تو ایک ہی وقت اس پر کئی قسم کا کام کر سکے۔ اگر دونوں چھوٹے دیواروں میں آمنے سامنے اس قسم کا بلیک بورڈ ہو تو اور بھی بہتر ہے تاکہ آدھی لڑکے ایک طرف منہ رکھیں اور آدھی دوسری طرف۔ اس ترتیب سے یہ فائدہ ہے کہ لڑکوں کی تعلیم میں کم ہرج واقع ہوتا ہے بلیک بورڈ کی دائیں جانب دیوار کے اندر بنی ہوئی ایک الماری بھی ہونی چاہیے تاکہ ان میں رجسٹر اور کتابیں وغیرہ رکھ سکے۔ اور علٰحدہ صندوق کی ضرورت نہ رہے۔ کہ اُس سے جگہ رُکتی ہے اور خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ایک آدھ الماری بلا کواڑ بھی ایک چھوٹی دیوار میں ہو۔ تو لڑکوں کے بستے وغیرہ رکھنے کے کام آئے گی۔ برآمدہ میں بھی دیواری بلیک بورڈ کا ہونا ضروری ہے تاکہ اگر کوئی جماعت وہاں بیٹھی ہو تو ان کے کام آوے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ برآمدہ کے اندرونی دیوار کی کل پیشانی پر سیمنٹ کا بلیک بورڈ تین چار فیٹ چوڑا لگا ہوا ہو۔ کمرہ جماعت اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ اس میں چالیس یا پچاس لڑکے بآسانی بیٹھ سکیں۔ کم از کم بحساب آٹھ مربع فیٹ فی طالعلم سب سے موزوں کمرہ ۱۵ × ۲۴ یا ۱۵ × ۳۵ فیٹ کا ہوتا ہے لیکن کمرے کی جس قدر چوڑائی کم ہوگی اسی قدر اس پر لاگت بھی کم آئے گی۔ گو بارہ فیٹ سے کم چوڑائی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ برآمدہ کی چھت اگر سلامیدار ہو تو بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں دھوپ اور بارش کا بچاؤ زیادہ ہوتا ہے برآمدہ پر اگر عشق پیچاں وغیرہ کی بیل چڑھائی جائے تو برآمدہ ٹھنڈا رہے گا اور مدرسہ زیادہ خوشنما معلوم ہوگا۔ کمرے کی اندرونی بلندی ۱۱ فیٹ سے کبھی کم نہیں ہونی چاہیے۔ پانی کے لیے کوٹھری کا ہونا بھی ضروری ہے جس کے درمیان ایک پتلا سا چوبی پردہ ہو تاکہ نصف ہندوؤں کے لیے اور نصف مسلمانوں کے لیے الگ الگ ہو جاوے۔ ان پانی کی کوٹھریوں میں اوپر کی طرف کھونٹیاں بھی ہونی چاہئیں کیونکہ دیہات میں لڑکے اکثر کچھ کھانا ہمراہ لاتے ہیں اور اگر ایسا انتظام نہ کیا جاوے تو کتے وغیرہ اُٹھالے جاتے ہیں۔ سامان کی کوٹھری کی ضرورت نہیں۔ البتہ مدرس کے لیے ایک کوٹھری ساتھ ہونی چاہیے جس میں مدرسے کا زائد سامان بھی رکھا جا سکے۔ مدرس کے لیے مدرسہ میں رہائش کا انتظام کرنا اکثر ضروری ہے۔

مدرس کے لیے مدرسہ میں رہائش کا انتظام کرنا اکثر حالتوں میں ضروری ہے۔ کیونکہ آج کل مدرس عام طور پر نوجوان اور مجرد ہوتے ہیں۔ اور گاؤں کے لوگ نہیں چاہتے کہ ایسے اجنبی گاؤں کی آبادی کے اندر رہیں۔ نیز مدرسے کی حفاظت کے لیے بھی یہ اچھا ہے کہ مدرس مدرسہ ہی میں رہائش رکھے اس لیے نمونہ کے نقشے میں مدرس کی کوٹھری بھی دکھائی گئی ہے۔ اور اس میں مدرسہ کا زائد سامان بھی رکھا جا سکتا ہے احاطہ مدرسہ میں سایہ دار درختوں کا ہونا بھی بہت مفید ہے۔ کیونکہ سال کے اکثر حصہ میں جماعتیں درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر اچھی طرح کام کر سکتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں سب سے مفید یہ ہو کہ ایک قطار سایہ دار درختوں کی احاطہ کی جنوبی حد پر ہو۔ اور ایک شرقی حد پر تاکہ گرمیوں میں مدرسہ کے وقت اُن کا سایہ احاطہ کے اندر پڑے۔ دیوار احاطہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ خواہ گز بھر اونچی کچی ہی کیوں نہ ہو۔ یا کانٹوں کی باڑ ہو۔ تاکہ مویشی وغیرہ احاطہ کے اندر نہ آئیں۔ اور درختوں اور باغیچہ کی حفاظت ہو سکے ان سب ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر تعمیر کے خرچ میں کفایت حسب ذیل ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ پرائمری مدارس میں حاضری ایک نہ ایک قسم کے ڈبل شفٹ سے ہو یعنی آدھے لڑکے ایک وقت میں آئیں۔ اور آدھے دوسرے وقت۔ اس طریقہ سے وہی مکان وہی سامان اور وہی عملہ تقریباً دگنی تعداد کے لیے کافی ہو گا۔ مثلاً اگر مکان مدرسہ میں ۸۰ لڑکوں کی گنجائش ہو تو اس طریقہ سے کوئی ڈیڑھ سو لڑکا اُس مکان میں تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ صرف اُس صورت میں برتا جا سکتا ہے۔ کہ لڑکے دور سے نہ آتے ہوں۔ دوم یہ کہ مدرسہ کی اندرونی بلندی بجائے پندرہ سولہ فٹ ہونے کے صرف گیارہ فٹ رکھی جائے۔ کیونکہ حفظانِ صحت کے قوانین کے بموجب جس کمرے کی اندرونی سطح ۶۰۰ مربع فٹ تک ہو۔ اُس کے لیے گیارہ فٹ کی اندرونی بلندی کافی ہے۔ سوم یہ کہ کمرہ ایک ہی ہو۔ اور زائد تعداد کے لیے اُس کے ساتھ برآمدے ایسے ریزرو کئے جائیں جیسا کہ پنجاب میں ضلع شیخوپورہ میں اب رواج ہے۔ یہ برآمدے کمرے کے مقابلہ میں بہت کم لاگت سے بنتے ہیں۔ اور ان کا رُخ دھوپ اور ہوا کے لحاظ سے بہت موزوں ہے اُن کی ساخت بھی ایسی ہے کہ خرچ بہت کم آتا ہے۔ چہارم یہ کہ کمرے کے کونے اور دیواروں کے وہ حصے جن پر شہتیر رکھے جائیں وہ تو نیچے سے اوپر تک پوری موٹائی کے ہوں۔ اور باقی دیوار پتلی ہو۔ اور زمین سے ڈھائی تین فٹ اوپر اوپر سوراخ دار ہو تاکہ اُن میں سے روشنی اور ہوا آ سکے۔ لیکن پرندے داخل نہ ہو سکیں۔ اس صورت میں کھڑکیوں کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہے گی۔ پنجم یہ کہ دو ڈھائی فٹ اوپر اور دو ڈھائی فٹ نیچے دیوار میں

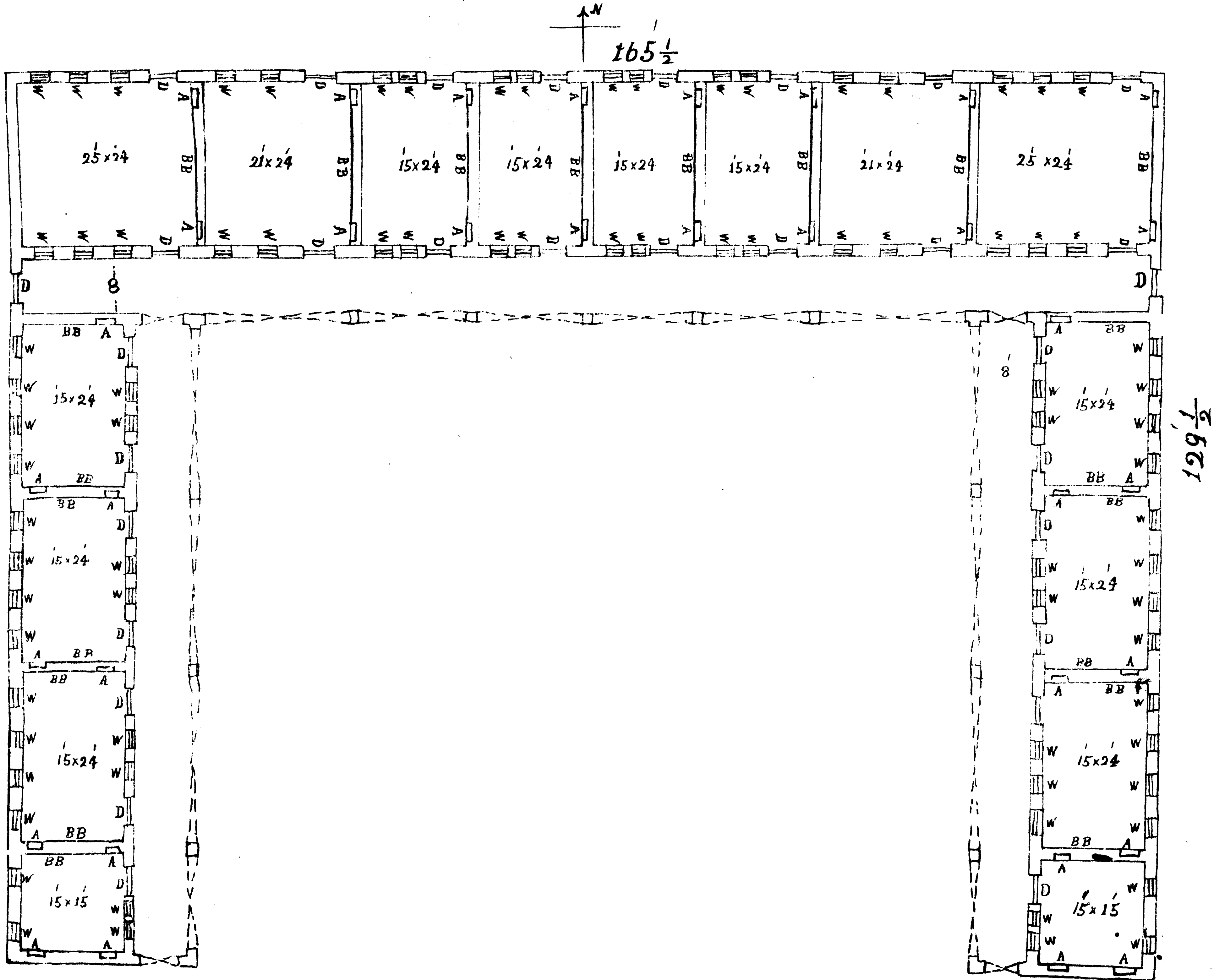
میں پختہ ہوں اور باقی کچے۔ ششم یہ کہ کمرے کا عرض کم رکھ کر دیہاتی لکڑی کی چھت ڈالی جائے۔ اور مکان کچا بنایا جائے۔ خواہ چھت چپٹی ہو۔ خواہ سلامی دار۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ کمرہ اتنا تنگ نہ ہو جائے کہ تعلیم کے کام کے لیے موزوں نہ رہے۔ اس قسم کے مکان گاؤں کے لوگ خود بنا سکتے ہیں پنجاب میں کئی اضلاع میں ایسے مکان یا تو لوگوں نے مفت بنا دیے ہیں۔ یا ڈسٹرکٹ بورڈ سے دو چار سو روپیہ معاوضہ لے کر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ کچے مکان آخر کار پکے سے زیادہ مہنگے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ مرمت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن میں نے خود انیسے ضلاع میں جہاں بارش بکثرت ہوتی ہے، ایسے کچے مکان دیکھے ہیں جو ساٹھ ستر سال کے عرصہ سے قائم ہیں۔ ان کی پائداری کا بھید یہ ہے کہ مالک مکان بارش سے پہلے چھت اور پرنالوں کی حفاظت کا معمولی انتظام کر لیتے ہیں۔ اور اگر چھت کہیں سے ٹپکنے لگے تو فی الفور اُس کی مرمت کر لیتے ہیں۔ اس سے مکان گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ نیز یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کا مکان بھی تقریباً اس قسم کا ہو جیسا کہ گاؤں میں لوگوں کے اپنے گھر ہوتے ہیں۔ گو اُن سے کچھ بہتر ہونا ضروری ہے۔ اگر مدرس لوگ ایسے مکانوں کی ضروری حفاظت کا خیال رکھیں۔ تو وہ پکے مکانوں سے کم دیرپا نہ ہونگے۔ صوبہ پنجاب میں آجکل ایک کمرہ والے سینڈرڈ ڈیلین کے پرائمری اسکول پر تقریباً دو ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن بعض اضلاع میں بارہ سو روپیہ کے لگ بھگ لاگت آئی ہے۔ پنجاب میں اب سکنڈری مدارس کے متعلق یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ہال کمرہ نہ بنایا جائے۔ کیونکہ فی الواقع اُس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اُس پر کئی کمروں جتنی لاگت آتی ہے ایک اور فیصلہ یہ ہوا ہے کہ ورنیکلر مڈل اسکولوں میں جہاں اختیاری انگریزی کا رواج ہو۔ ڈیوئل ڈسک مہیا کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس ایسے مڈل اسکولوں میں بھی بڑے بڑے کمروں کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ لڑکے انگریزی کا کام بھی فرش پر بیٹھ کر کرتے ہیں اور اس طرح جگہ کم رُکتی ہے ہائی اسکول کے لیے بھی چند ایک کمرے بڑے ہونے چاہئیں۔ باقی سب چھوٹے یعنی ۱۵ × ۲۴ کے جس میں چالیس چالیس طلبا بیٹھ سکیں۔ اِس سے خرچ میں بہت کفایت ہوگی۔

دو نقشے ایک پرائمری مدرسہ کے اور ایک نقشہ ہائی اسکول کا شامل ہذا ہے۔ ایک نقشہ پرائمری اسکول کا ایسا ہے جس میں کمرے کا عرض ۱۵ فٹ ہے اور مدرس کی کوٹھری اور پانی کی دو کوٹھریاں بھی ہیں۔ دوسرے میں صرف کمرہ اور برآمدہ ہے دوسری صورت میں پانی گھڑونچیوں پر برآمدہ کے سروں پر رکھا جا سکتا ہے ایک سرے پر ہندوؤں کے لیے اور دوسرے پر مسلمانوں کے لیے۔ ہائی اسکول کے نقشے میں ہال نہیں دکھایا گیا ہے کہ ہال کی دراصل ضرورت نہیں ہوتی اور اگر کسی جگہ ضرورت سمجھی بھی جائے

تو درمیان بھی دکھایا جا سکتا ہے یا دو بڑے کمرے بیچ میں رکھ کر ان کی درمیانی دیوار کی بجائے ایک چوبی پردا بنایا جا سکتا ہے جو ضرورت کے وقت ہٹایا جا سکے۔ اس کی سب سے کفایت والی ترکیب یہ ہے کہ عمودی تختے اوپر سے اور نیچے سے درزوں میں پھنسا کر کھڑے کر دیے جائیں تاکہ جب ضرورت ہو ان تختیوں کو نکال کر دو کمروں کا ایک ہال بنا دیا جائے۔ ۲۴-۲۱ والے کمرے میں چالیس طلبہ ڈیول ڈسکون پر بٹھائے جا سکتے ہیں اور ان کے سامنے سات فٹ عرض اور ۲۴ فٹ لمبائی کی کھلی جگہ مدرس کے لیے اور آنے جانے کے لیے خالی رہے گی اور ڈسکون کی قطاروں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ جگہ آنے جانے کے لیے چھوٹی رہیگی ۲۴ × ۱۵ فٹ والے کمرے میں چالیس طلبا فرش پر بیٹھ سکتے ہیں اور تیس ڈول ڈ سکوں پر۔ پس عام طور پر ایک ورنیکلر مڈل اسکول کے لیے آٹھ کمرے ۲۴ × ۱۵ کے کافی ہونگے۔ جن پر دس ہزار کے لگ بھگ لاگت آئیگی۔ انگلو میڈیکل مڈل اسکول کے لیے بھی آٹھ ہی کمرے کافی ہونگے لیکن ان میں سے دو یا تین یا زیادہ سے زیادہ چار ۲۴ × ۲۱ کے ہونے چاہئیں۔ ہائی اسکول کے لیے عموماً دس کمرے کافی ہونگے جن میں سے چار یا چھ ۲۴ × ۲۱ کے ہوں۔ اور اگر ڈرائنگ روم علیحدہ بنانا ہو تو اس کے لیے ۲۴ × ۲۵ کا کمرہ اچھا ہوگا اور جو کمرے سائنس کی تعلیم کے لیے بنائے جائیں۔ ان میں سے بھی ایک ۲۵ × ۲۴ کا ہونا چاہیے تاکہ اس کی پچھلی دیواروں میں سائنس کے سامان کے لیے خانے اور الماریاں رکھی جائیں اور پیچھے کی طرف چند فٹ چوڑی جگہ خالی چھوڑی جائے۔ اگر سائنس کے لیے دو کمرے ہوں یعنی ایک معمولی تعلیم کے لیے اور دوسرا عملی کام کے لیے تو وہ متصل ہونی چاہیے اور ان کے بیچ میں دروازہ ہونا چاہیے لیکن دوسرا کمرہ ۲۴ × ۲۱ کا کافی ہوگا۔ اگر کل کمرے ایک ہی قطار میں شرقاً غرباً بنائے جا سکیں جن کا برآمدہ جنوب کی طرف ہو تو بہت بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں شمالی روشنی بلا روک ٹوک سب کمروں میں آئے گی اور جنوب کی طرف برآمدہ مدرسہ کو آفتاب کی تپش سے بچائے گا اور گرمیوں اور برسات میں جنوبی ہوا اسی طرح اندر آئے گی۔ لیکن اگر اتنی جگہ میسر نہ ہو سکے تو اور کمرے دائیں بائیں پہلوؤں میں بنائے جا سکتے ہیں جیسا کہ نقشے میں دکھایا گیا ہے۔ اور ان کے سروں پر دفتر وغیرہ کے لیے کمرے بن سکتے ہیں۔ اگر شرقاً غرباً دیواروں میں نیچے فرش کے قرب اور اوپر چھت کے قرب گول چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوں تو شرقاً غرباً بھی ہوا کی رو جاری رہ سکتی ہے جو بہت مفید ہوگی۔ اگر مدرسہ جنوبی رُخ کا نہ بن سکے تو کمروں کو آفتاب کی تپش سے بچانے کے لیے اُس طرف جدھر سے آفتاب کی تپش آتی ہو دیوار سے کم از کم پندرہ فٹ کے فاصلہ پر سیدھے درختوں کی ایک قطار لگانی چاہیے۔ ان سے گرمی رک جائیگی۔ اس نقشے میں جو ترتیب کمروں کی رکھی گئی ہے اس میں حسب ضرورت تبدیلی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اس طرح کہ بڑے کمرے بیچ میں آئیں اور چھوٹے انکے دائیں بائیں ہوں۔



N
165 1/2
25' x 24'
21' x 24'
15' x 24'
15' x 24'
15' x 24'
15' x 24'
21' x 24'
25' x 24'
8'
8'
15' x 24'
15' x 24'
15' x 24'
15' x 24'
15' x 24'
15' x 15'
15' x 15'
129 1/2


N
165 1/2'
129 1/2'
25'x24'
21'x24'
15'x24'
15'x24'
15'x24'
15'x24'
21'x24'
25'x24'
15'x24'
15'x24'
15'x24'
15'x15'
15'x24'
15'x24'
15'x24'
15'x15'
8
8'

لکچر نمبر ۱۳

اسکول کے لڑکوں کی سبق آموز سیاحت

مرتبہ

سید قایم حسین صاحب بی اے اسسٹنٹ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول

تعلیم کے لحاظ سے ہندوستان جس قدر یورپ و ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے پیچھے ہے وہ ہم سب پر بخوبی عیاں ہے۔ تعلیم ہی کی وجہ سے وہ نسبتاً زیادہ مہذب۔ تربیت یافتہ اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ تعلیم نے اُن کے دلوں کو اس قدر قوی اور اُن کے دماغوں کو اس قدر روشن کر دیا ہے کہ وہ ہر شے کی ماہیت کو معلوم کر کے اپنی روزمرہ زندگی میں اُس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ان ممالک کے ماہرین تعلیم ہمیشہ غور وخوض کرتے رہتے ہیں کہ کس طرح پر اُن کی قوم کے بچے اصلی اور سچی تعلیم حاصل کر کے اپنے لئے اور اپنے ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہوں ان لوگوں کی ترقی و کامیابی اور فروغ کا راز اسی بات میں ہے کہ وہ قدرت کے مشاہدات نہایت غور کی نظر سے کرتے ہیں۔ اور اُن کے متعلق مختلف تجربے عمل میں لاکر مفید نتائج حاصل کرتے ہیں۔ ان کے مشاہدات۔ غور وفکر کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان ممالک میں آئے دن کوئی نہ کوئی جدید مفید طریقۂ تعلیم نکلتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسکول جرنیز یا اسکول اکسکرشنز کے ذریعہ سے بہت کچھ تعلیم جنگلوں پہاڑوں کھیتوں اور دریاؤں کے کنارہ پر دیجاتی ہے۔

ہندوستانی مدارس کی تعلیم کا طریقہ بہت کچھ انگلستان کے طریقۂ تعلیم سے ملتا جلتا ہے۔ گو یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہم تعلیم۔ تربیت وتہذیب کے لحاظ سے انگلستان کے لوگوں سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن ان تاریخی واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قومیں جو آج دنیا میں انتہائی عروج پر ہیں کسی زمانہ میں ایسی ہی جاہل

اور غیر مہذب تھیں جیسی کہ اب بھی ہندوستان کی بعض پرانی قومیں ہیں ہمیں مایوس نہ ہونا چاہئیے۔ اور ہمت و استقلال کے ساتھ کوشش کرنی چاہئے۔ اور کسی نئی بات کو محض اس خیال سے نہ چھوڑ دینا چاہئیے کہ اس کو ہم نہ کر سکینگے۔

اس لکچر میں اسکول جرنیز یا اسکول اکسکرشنز کی نسبت مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں اسکول اکسکرشنز کی ابتدا ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ چند سال تک نہایت سرگرمی سے اس پر تجربے ہوتے رہے۔ آخر ماہرین تعلیم نے اس کے عمدہ نتائج کو مفید سمجھکر اس کے رائج کرنے کی کوشش کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کی تعلیمی بورڈ نے اکسکرشنز (سیاحت) کو عام اسکول کے نصاب تعلیم میں داخل کر دیا ہے۔ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی اس کا رواج عام ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملک آسٹریا کے ایک شہر میں انسپکٹر تعلیم ایک اسکول کے معائنہ کے لئے گئے۔ سب کمروں کو لڑکوں سے خالی پایا۔ معلوم ہوا کہ کل طلبا اپنے اساتذہ کے ہمراہ اکسکرشن پر چلے گئے۔ اور کل کلاسوں کے درس کا انتظام اسی جگہ کیا گیا ہے۔ عام طور پر ہندوستانی مدارس میں اسکول اکسکرشن اسکول کے انضباط اوقات میں داخل نہیں۔ لیکن ہر صوبہ میں ایسے مدارس پائے جائیں گے جہاں اساتذہ اپنے طلبا کو ایک یا دو روز کی تعطیل میں یا ہر دیہات یا کسی تاریخی مقام پر لے جاتے ہیں لیکن اُن کی غرض ایسے چھوٹے سے سفر سے محض یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اسکول کے مسلسل کام سے آرام پائیں۔ اور تفریح حاصل کر کے دماغ کو تر و تازہ کریں۔ اور طلبا بھی اپنی تعطیل زیادہ دلچسپی۔ تفریح اور آزادی میں گذاریں۔ ہندوستان کی تعلیمی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ امر ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اکسکرشن کو نصاب تعلیم میں داخل کر کے اس کے زائد اخراجات اور اہتمام کے متعلق ذمہ داری بڑھائی جاوے۔ لیکن اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جائیگا کہ اسکول اکسکرشنز اس قدر مفید ہیں کہ ان کے اخراجات اور ان کی تکلیف انتظام و اہتمام ان فوائد کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

اس لکچر میں اسکول اکسکرشن کے تین بڑے فوائد پر مختصراً کچھ عرض کرنا کافی ہوگا۔ یہ فوائد تین حصوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اول جسمانی۔ دویم تعلیمی۔ سویم اخلاقی۔

جسمانی فائدے ہندوستان کے تمام شہروں میں اسکول و بورڈنگ ہوس کی عمارتیں اکثر یا تو آبادی کے اندر ہوتی ہیں یا اس کے باہر قریب ہی کسی سمت میں واقع ہوتی ہیں۔ نسبتاً اس زمانہ میں شہروں کو صاف اور غلاظت سے پاک رکھنے کی کوشش سرگرمی سے کی جاتی ہے۔ تاہم گنجان آبادی لوگوں کی زیادتی اور مختلف پیشہ وروں کے کاروبار کی وجہ سے اُن کی آب و ہوا ایسی اچھی نہیں ہوتی جیسی کہ بیرونی مقامات و دیہات کی ہوتی ہے پس طلبا اسکول بھی ایسی آب و ہوا کے اثر سے مبرا نہیں رہ سکتے۔ اُن کے قوی اور عادات پر بھی اُس کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ باتیں آیندہ زندگی میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اگر اسکول کے اوقات میں اور اسکول کیطرف سے باقاعدہ طور پر ہفتہ وار یا پندرہویں دن اکسکرشن کا انتظام ہو۔ تو مذکورہ بالا خرابیوں کے اثر کا بہت سا

حصّہ زایل ہوتا رہے گا۔ طلباء کو صاف ہوا اور کھلی جگہ میں رہنے کے موقعے ملیں گے۔ اس کا اثر اُن کی صحت اور جسمانی حالت سے نمایاں طور پر ظاہر ہوگا۔ اُن کے جسمانی وزن میں اضافہ ہوگا۔ چہروں سے بشاشت اور عمدہ صحت کی علامتیں ظاہر ہونگی۔ عقلمندوں کا مقولہ ہے۔ جس کی صحت اچھی اُس کی دماغی قوت بھی اچھی ہوتی ہے۔ پس اگر اسکول ہی میں طلباء کو روزانہ ورزش اور کھیل کود کے علاوہ اکسکرشن پر جانے کا عادی بنایا جاوے۔ تو وہ آیندہ زندگی میں بھی اُس کے عادی رہیں گے۔ اور کاروبار کی زیادتی اور دیگر مشاغل کے انہماک سے دماغ و جسم کو آرام دینے اور اُس کو تروتازہ کرنے کے لئے یہ عادت اُن کو بہت مفید ثابت ہوگی۔ ایسے اشخاص کی صحت اور دماغی قوت اخیر وقت تک ٹھیک رہتی ہے۔ جن اشخاص کو انگلستان کے مدارس اور وہاں کے طلباء کو دیکھنے کے موقعے ملے ہیں وہ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہاں کے بچے نسبتاً زیادہ چست و چالاک ہوتے ہیں۔ اور پانچ سات میل کا سفر اُن کے لئے معمولی بات ہے برعکس اس کے ہمارے مدارس کے طلباء میں شاید پندرہ بیس فی صدی ایسے ہوں گے جن پر اس پانچ سات میل کے سفر کا کچھ زیادہ اثر نہ ہو۔ تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب کسی موقع پر طلباء کو کسی اکسکرشن میں پانچ سات میل پیدل چلنے کا اتفاق ہوا ہے تو وہ واپسی پر تکان کا بے حد اثر محسوس کرتے ہیں۔ یہ حالت اُن کی محض اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ ایسی مہمات پر جانے اور پیدل چلنے کے عادی نہیں۔

تعلیمی فائدے اسکول اکسکرشن کا دوسرا فائدہ تعلیمی فائدہ ہے۔ ہندوستانی مدارس میں عام طور پر اساتذہ کا طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے متعلق بچوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں تو وہ یا تو محض اپنے بیان و گفتگو کے ذریعہ سے وہ بات ان کے ذہن نشین کرتے ہیں یا کوئی تصویر یا نقشہ دکھا کر اُنھیں سمجھاتے ہیں لیکن اگر ہمارے مدارس میں اسکول اکسکرشنز کا رواج ہو جائے۔ تو بچوں کو بہت سی اشیاء بجنسہ ان کی اصلی حالت میں مشاہدہ کرنے کے موقعے ملیں گے۔ اور جو بات چشم دید ہوگی وہ عرصہ دراز تک یاد رہے گی۔ قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بادشاہ اور امراء اپنے بچوں کی تعلیم کو تکمیل کے درجہ تک پہونچانے کے لئے یہ امر ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن کو اپنے ملک میں اور دوسرے ملکوں میں سیر و سفر کے لئے بھیجیں۔ جہاں اُن کو خود اپنی آنکھوں سے بہت سی چیزوں کے دیکھنے اور بہت سی باتوں کے سمجھنے کے موقعے ملیں۔ اور ایسے تجربے حاصل ہوں جو آیندہ زندگی میں بلکہ اُن کے لئے مفید ہوں۔ ایک عقلمند کا قول ہے کہ تعلیم کی تکمیل محض کتابوں سے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی حقیقت تک پہونچنے اور اُس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم قدرت کے مختلف مناظر کا خود مشاہدہ کریں۔ اور اُس کے تغیر و تبدل پر غور کریں۔ جو روزمرہ قدرت میں واقع ہوتے رہتے ہیں۔ پس بچوں کی تعلیم کو مضبوط اور عمدہ بنیاد پر اٹھانے اور اعلیٰ درجہ تک پہونچانے کے لئے ضروری ہے کہ اُنھیں ایسے موقعے دئے جائیں کہ وہ چیزوں کو اپنی آنکھ سے

دیکھیں اور جو باتیں اساتذہ انھیں سمجھائیں وہ اصلی حالت میں طلباء کے روبرو ہوں۔ یہ بات ایک حد تک انھیں اسکول اکسکرشنز میں حاصل ہو سکتی ہے۔

کلاس کے کمرہ میں طلباء اور اُستاد کا درمیانی تعلق عجیب قسم کا تعلق ہے۔ وہاں بچّوں کے دلوں میں اُستاد کا خوف اور ایک قسم کی ہیبت ہوتی ہے۔ اُن کے دلوں میں یہ خیال بھی ایک حد تک موجود رہتا ہے۔ کہ اُستاد زیادہ سخت و بے رحم ہیں اور اُن کی آزادی میں مخل ہیں۔ اِدھر اساتذہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ کام ٹھیک اور درست ہو۔ اور اس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ جائز سختی کرنی پڑتی ہے۔ غرض کلاس کے اندر اُن کے تعلقات آزادانہ اور دوستانہ نہیں ہو سکتے۔ برخلاف اس کے اسکول اکسکرشنز میں حالت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جنگل میں باہم گھومتے پھرتے۔ میدان میں کھیلتے کودتے۔ مختلف مشاہدات کرتے۔ کھانا کھاتے یا ناشتہ کرتے ہوئے طلباء اور اساتذہ ہر دو اپنے درمیان ایک قسم کی آزادی محسوس کرتے ہیں۔ اساتذہ کو اس جگہ مثل بڑے بھائیوں یا بڑے دوستوں کے سمجھا جاتا ہے۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار زیادہ آزادی کے ساتھ کیا جاتا ہے بلکہ کسی کسی موقعہ پر ہنسی یا مذاق بھی ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو اعتبار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس اعتبار کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اسکول واپس آتے پر نہ صرف ہوشیار لڑکے ہی اپنے کام سے اُستاد کی مزید خوشنودی چاہتے ہیں بلکہ وہ طلباء بھی جو اپنے کام میں کمزور۔ برے اور لاپرواہ ہیں محنت اور تندہی سے اپنے سبق تیار کر کے اس دوستانہ تعلق اور اعتبار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کے درمیان اکسکرشن میں پیدا ہوا تھا۔ پس جب طلباء کے دلوں میں اس قسم کا خیال پیدا ہو جائے تو اُن کے تعلیمی نتائج ہمیشہ قابل اطمینان ہونگے۔ اساتذہ کو دو چار ہی دن میں اس طرح پر اسکول سے باہر رہنے میں اپنے طلباء کی عادات اور چال چلن کے متعلق وہ وہ باتیں معلوم ہو جائیں گی جو انھیں کلاس کے کمرہ میں مہینوں کے غور و مشاہدہ سے معلوم ہوتیں۔ ان مشاہدات سے اساتذہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اپنے طلباء میں سے اُن عادات کو دور کرنے کی کوشش کریں جن کو وہ اُن کے لئے ضرر رساں سمجھتے ہیں اور ان خوبیوں کے نشوونما میں ساعی ہوں جو وہ اُن میں موجود پاتے ہیں۔

گو کہ طلباء روزمرہ اسکول کی جماعتوں میں جمع ہو کر تعلیم پاتے اور آپس میں ایک دوسرے سے موانست و اتحاد پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان میں اسکول کے اندر اپنے کمروں میں رہکر وہ یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی جو باہر کھیل کے میدان میں ظہور میں آتی ہے جبکہ اُن کا مقابلہ کسی مخالف اسکول کے طلباء سے ہو۔ اگر اسکول کے طلباء اکسکرشنز پر اکثر جاتے رہیں تو اُن کے یکجہتی کے مادہ میں اور زیادہ ترقی ہوگی اور ہر جماعت متفقہ کوشش کریگی کہ ان کا کام اور اُن کی اکسکرشن اسکول کی دوسری جماعتوں سے زیادہ بڑھ چڑھکر نتیجہ خیز ہو۔ یہ بات بھی عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ جب کسی اسکول کے طلباء کو کسی غیر جگہ جانے کا موقعہ ہوتا ہے تو ان میں زیادہ یکجہتی پیدا ہو جاتی ہے اور اس

یکجہتی کی وجہ سے وہ سب ملکر پوری کوشش سے اس کام کو انجام دیتے ہیں جس کے لئے انھیں وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

ہندوستان کے سب بڑے شہروں میں تعلیم کا چرچا کافی طور پر ہے۔ لیکن دیہات میں یہ حالت نہیں ہے وہاں مدارس کافی تعداد میں نہیں۔ بہتسے دیہاتی طلباء کو کسی دوسرے گاؤں یا قصبہ میں جو فاصلہ پر ہوتا ہے روزانہ مدرسہ جانے کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ ان وجوہات سے لوگوں کی دلچسپی اور توجہ اس حد تک تعلیم کی طرف نہیں ہوتی جتنی کہ ہونی چاہئے۔ اگر شہری اسکولوں کے طلبا کی اکسکرشنز وقتاً فوقتاً دیہات میں کسی رئیس کے یہاں یا اُس کے علاقہ میں جاتی رہیں تو اُسے ایک قسم کی دلچسپی طلباء اور ان کے مشاہدات علمی کے ساتھ پیدا ہو جائے گی۔ طلباء کے بیرونجات میں گھومنے پھرنے اور مختلف مشاہدات کرنے اور عمدہ نتائج اخذ کرنے کا بہت اچھا اثر اُس کے دل پر ہوگا۔ اور یہ ممکن ہے کہ وہ ان باتوں سے متاثر ہو کر تعلیمی معاملات کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے۔ اور اس طرح پر حامیانِ تعلیم کے گروہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہو جائے۔ اسکی دلچسپی سے اُس کے علاقہ میں تعلیم کی طرف دلچسپی پیدا ہو جائیگی۔

چونکہ اسکول اکسکرشنز میں ایک خاص تعلیمی مقصد مدنظر ہوگا۔ اس سے اسکول کے میوزیم کو بہت ترقی حاصل ہوگی۔ اگر اسکول میں پہلے ہی سے کوئی میوزیم نہیں ہے تو اسکول اکسکرشنز سے اُس کی بنیاد پڑ جائیگی۔ اس میوزیم کی ترقی اور رونق کے باعث خود وہاں کے طلباء اور اساتذہ ہونگے۔ وہ اپنی اکسکرشنز کی مختلف ڈرائنگ۔ نقشہ جات تاریخی۔ تجربات نیچر سٹڈی۔ نقشہ جات متعلق جغرافیہ۔ دریا یا سمندر کے کنارہ سے سیپ اور مختلف رنگ کے پتھر وغیرہ وغیرہ جمع کرکے اپنے میوزیم کو اُن سے آراستہ کرسکتے ہیں۔ اور اس عمل سے ان میں ایک خاص قابلیت چیزوں کے انتخاب اور جمع کرنے کی پیدا ہو جائیگی۔

اسکول اکسکرشنز کو کبھی کبھی کارخانجات اور فیکٹریوں میں بھی لے جانے کا انتظام کیا جاوے۔ جن طلباء کو خاص خاص پیشوں کی طرف میلان ہے اُن کے لئے وہاں کے کاروبار کا دیکھنا اور مختلف مشاہدات کرنا بہت مفید ہوگا اور طلباء کے میلان طبعی کو اپنے خاص پیشہ کی طرف استحکام حاصل ہوگا۔ اساتذہ کو بھی ابتدائی اصول سائنس سکھانے اور تجربات دکھلانے کے عمدہ موقعے کارخانجات اور فیکٹریوں میں ملینگے۔

اخلاقی فائدے تیسرا فائدہ اسکول اکسکرشنز کا اخلاقی فائدہ ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں بہت سی آسانیاں علمی مشاغل۔ عمدہ سوسائٹی اور دیگر مفید مسائل کے متعلق حاصل ہوسکتی ہیں۔ لیکن اُسی قدر خرابیوں کے سامان بھی وہاں موجود ہوتے ہیں۔ جن سے وہاں کے طلباء اسکول بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اگر شہری بچوں کی کافی نگہداشت نہ ہو تو آوارگی کا مادہ ان میں جلد ترقی پذیر ہو جاتا ہے جس کی

وجہ سے وہ شہر کی نہایت خراب سوسائٹی اور دیگر بُرے مشاغل میں پڑ جاتے ہیں۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ اگر اس کی پوری طرح سے نگہداشت نہ کی جائے تو وہ بُرائی کی طرف جلد مائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے طلبار کی تعلیمی و تفریحی مشاغل کا خاص اہتمام زیر نگرانی اساتذہ کیا جائے۔ ان مشاغل میں اسکول اکسکرشن کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہونا چاہئے۔ بچوں کا جس قدر وقت بیرونجات میں اکسکرشنز میں صرف ہوگا اتنے ہی عرصہ وہ شہری آفات اور اُن کے اثر سے بچے رہیں گے۔ اور ان کا وقت مفید مشاہدات مفید تحصیل اور مفید تفریح میں بھی صرف ہوگا۔ علاوہ بریں اس طریقہ سے ان میں ایک خاص احساس قدرتی منظروں کے مشاہدہ کرنے اور اُن سے مفید نتائج حاصل کرنے کا پیدا ہوتا رہیگا۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ آوارہ بچوں کو راہ راست پر لانے اور اُن کا چال چلن درست کرنے کا اچھا علاج یہ ہے کہ ان کو ایسے مشاغل میں مصروف رکھا جاوے جن میں جسمانی تفریح خوب ہو۔ ایسے لڑکوں کے لئے اکسکرشنز میں دو چار دن یا ہفتہ بھر بیرونجات میں ٹھہر کر مختلف کاموں اور مختلف تفریح میں مصروف رہنا بے حد مفید ہوگا۔ ایسے لڑکے درست ہو جانے پر نہایت مضبوط اور عمدہ چال چلن کے نکلتے ہیں۔ ان سے خود غرضی کا مادّہ دور ہو جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں خاص جوش انسانی بہتری کا پیدا ہو جاتا ہے۔ جھوٹ اور دیگر برائیوں سے متنفر ہو کر سچائی اور نیکی کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے طلبار کی زندگی کی اخیر میں بطور نمونہ تقلید کی جاتی ہے۔

اسکول کی تعلیم کے تمام مضامین کا درس اکسکرشن میں دیا جا سکتا ہے۔ یہ اساتذہ پر منحصر ہے کہ وہ پہلے ہی سے اپنے طلبار کی ضرورت کے موافق مقام وسبق کا انتظام کریں۔ اور اشیائے ضروری بہم پہونچالیں۔ ذیل میں مختصرًا اُن چند مضامین کا نام درج کیا جاتا ہے جن پر اکسکرشنز میں بہت اچھے سبق دئے جا سکتے ہیں۔

اول ڈرائنگ یہ سبق ابتدائی اور بڑی کلاسوں دونوں کو دیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کی ہدایت کے موافق طلبار خاکہ کھینچیں اور اگر دیگر سامان ڈرائنگ بھی ہمراہ ہو۔ تو اپنی اپنی ڈرائنگ کی تکمیل اسی موقعہ پر کریں۔ اور رنگ وغیرہ بھر کر تیار کریں۔ یہ ڈرائنگ کسی درخت۔ پھول۔ عمارت۔ نالہ۔ چھوٹی جھیل یا چھوٹی پہاڑی کا ہو سکتا ہے۔

دویم نیچر سٹڈی اس مضمون پر سبق کے لئے اساتذہ کو قدم قدم پر موقعے ملیں گے۔ باغ کے پودوں، پھولوں اور سبز ترکاریوں پر عمدہ قسم کے درس دئے جا سکتے ہیں۔ بڑی کلاسوں کے طلبار کے لئے قدرت کے مختلف منظروں کو مشاہدہ کرنا اور اُن کے اصولوں کو سمجھنا ایک بہت اچھا سبق ہوگا۔ اس میں دریا۔ پہاڑ۔ بادل صبح شام کے مختلف منظر شامل کئے جا سکتے ہیں۔

سویم جغرافیہ اس مضمون پر ابتدائی اور بڑی کلاسوں کے طلبار کو بہت سے مختلف درس اکسکرشن میں دئے جا سکتے ہیں۔ چاروں سمت دریا۔ پہاڑ۔ اُس کا منبع ودہانہ۔ اُس کے کنارے۔ سمت بہاؤ۔ بیسن۔ وادی دریا۔

معادن دریا۔ جھیل۔ طلوع و غروب آفتاب۔ زمین کا گول ہونا۔ اُفق۔ قوس قزح۔ آبشار۔ نہروں کا بنانا۔ اور اُن سے آبپاشی کرنا۔ دریاؤں میں کشتیوں اور جہازوں کا چلنا۔ اور دریاؤں کے پانی کے کیمیاوی اجزا کو معلوم کرنا۔ بادل۔ مانسون اور اُس کی سمت۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ جن پر اکسکرشنز میں بہت اچھے سبق مختلف موقعوں اور مختلف اوقات میں ہوسکتے ہیں۔ یہ سبق طلباء کے لئے نہ فقط زود فہم و سہل ہونگے بلکہ اُن کے اصولوں کو ذہن نشین کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔

چہارم تاریخ ہندوستان کے تقریباً ہر ضلع میں کوئی نہ کوئی قدیم یادگار پائی جاتی ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح پر ہندوستان کی تاریخ کے کسی واقعہ سے ہوتا ہے پس ایسے مقام پر اکسکرشن کو لے جاکر تاریخی سبق دینا بہت مفید ہوگا۔ ایسے مقامات کے تاریخی نقشے تیار کرنا نہ صرف طلباء کی ذاتی قابلیت کے لئے مفید ہوگا بلکہ اسکول میوزیم میں ان سے ایک اچھا اضافہ ہوگا۔ اگر ممکن ہوسکے تو دوسرے اضلاع کے تاریخی مقامات کو بھی اکسکرشنز لیجانا چاہیئے۔

اب مختصراً وہ چند طریقے بیان کئے جاتے ہیں جو اکسکرشنز کے انتظام و اہتمام میں مفید ثابت ہونگے۔

(۱) سب سے اول مشکل یہ ہوگی کہ ان اکسکرشنز کے اخراجات کہاں سے آئیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ذیل کی تدابیر مفید ثابت ہونگی۔

(ل) جہاں جہاں یہ بات قابل عمل ہوسکے فیس ماہواری کے ساتھ کچھ مناسب فیس ہر کلاس کے طلباء سے اکسکرشن کے لئے لی جائے۔ اس ضمن میں جملہ اساتذہ۔ ہیڈ ماسٹر و دیگر افسران اسکول کو چاہیئے کہ وہ ان اکسکرشنز کی اہمیت اور ضرورت کو طلباء کے ورثاء کے دلوں پر نقش کردیں اور یقین دلادیں کہ اُن سے محض تفریح جسمانی ہی مقصود نہیں بلکہ وہ تعلیمی اور اخلاقی پہلو سے بھی بہت مفید ہیں۔

(ب) جن اسکولوں میں بورڈنگ ہوس موجود ہیں اور طلباء کا جیب خرچ اسکول و بورڈنگ ہوس کے افسران کی معرفت تقسیم کیا جاتا ہے اس میں سے ہر مہینے کچھ مناسب رقم ہر طالب علم کے حساب میں اکسکرشن کے لئے علیحدہ کرلی جائے۔

(ج) ہر شہر و ہر قصبہ میں ایسے ہمدرد اشخاص موجود ہوتے ہیں۔ جن کو تعلیم سے خاص دلچسپی ہوتی ہے وہ ہر تعلیمی کام میں مالی امداد دیتے رہتے ہیں۔ اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

(د) یہ کوشش کی جائے کہ ان اکسکرشنز کے متعلق ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے جس میں جملہ اسٹاف و دیگر افسران اسکول شامل ہوں۔ اور اس ایسوسی ایشن کے ممبر وہ رؤسا خاص طور پر بنائے جائیں جن کے علاقہ میں وقتاً فوقتاً اکسکرشنز کو لیجانا مقصود ہو۔ ایسے رؤسا کی سرپرستی یا ممبری سے اس مالی مشکل کے حل

کرنے میں بہت امداد ملے گی۔ اس ایسوسی ایشن کے جملہ ممبران سے کچھ نہ کچھ ماہواری چندہ لیا جاوے اور اس کے سکریٹری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوں۔ ان چاروں تدبیروں پر عمل پیرا ہونے سے امید کی جاسکتی ہے کہ اس مالی مشکل کا مقابلہ کرنے میں پوری کامیابی حاصل ہوگی۔ علاوہ بریں جیسا کہ انگریزی مقولہ ہے

Where There is a will, There is a way اگر پوری طرح

سے اس بات کی طرف توجہ کی جائے گی۔ تو کامیابی ضرور حاصل ہوگی اس مالی وقت کا اُس وقت تک مقابلہ کرتے رہنا پڑے گا جب تک اکسکرشنز نصاب اسکول میں داخل نہ ہو جائیں اور گورنمنٹ ان کے لئے سالانہ گرانٹ منظور نہ کرے۔

(۲) روپیہ کی اس مشکل کو دور کرنے کے بعد امور ذیل کو مدنظر رکھا جائے۔

(ا) کسی اکسکرشن میں بیس پچیس یا تیس طلباء سے زیادہ ایک پارٹی میں شامل نہ کئے جائیں۔ اگر طلباء کی زیادہ تعداد ہوگی تو جس مقصد کے لئے اکسکرشن اختیار کی گئی ہے۔ وہ مفقود ہو جائیگا یعنی اول طلباء کی نگرانی میں مشکل ہوگی۔ دوم سبق دینے کے وقت سب کی طرف توجہ رکھنے میں وقت ہوگی۔ اس لئے پارٹی جس قدر کم ہو اُسی قدر آسانی نگرانی اور انفرادی توجہ میں ملیگی۔

(ب) ایسی پارٹی یا تو بلحاظ کلاس بنائی جائے یعنی کل کلاس لے لی جائے۔ یا مختلف جماعتوں میں سے طلباء منتخب کرکے بنائی جاسکتی ہے۔

(ج) چھوٹے لڑکوں کی پارٹی علیحدہ ہو اور بڑوں کی علیحدہ (د) اساتذہ کی تعداد ہر پارٹی کے ہمراہ دو یا تین ہو

(۳) **اوقات و فاصلہ** (ا) چھوٹے بچوں کی پارٹی کو پیدل دو تین میل سے زیادہ نہ لے جانا چاہئے ہفتہ کے آخر دن نصف دن کے لئے باہر لے جائیں۔ یہ عمل ہر ہفتہ کیا جاسکتا ہے یا پندرہویں دن۔ اور سبق ڈرائنگ نیچر سٹڈی یا جغرافیہ پر دئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی دور مقام پر جو ان اسباق کے لئے موزوں ہو سواری پر جانے کا بند وبست کیا گیا ہو۔ تو ایک یا دو پورے دن کا انتظام کیا جائے۔

(ب) بڑے لڑکوں کی پارٹی کے لئے بھی مذکورہ بالا ہدایت کارآمد ہوگی۔ لیکن ان کے سبق میں ریاضی اور تاریخ کا اور اضافہ کیا جاوے۔

(ج) موسم سرما کل اور موسم گرما کا ابتدائی حصہ اکسکرشنز کے لئے بہت موزوں ہے۔ ان موسموں میں نیچر سٹڈی ڈرائنگ۔ تاریخ ریاضی وجغرافیہ کی تعلیم کے عمدہ موقعے اساتذہ کو ملیں گے۔ موسم برسات دور کی اکسکرشن کے لئے موزوں نہیں لیکن موٹری دور کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس میں جغرافیہ کے ابتدائی درسوں کے لئے بہت اچھے موقعے ملیں گے۔ دریا۔ جھیل۔ جزیرے کس طرح بنتے ہیں۔ معاون دریا۔ آبشار وبین کسے کہتے ہیں

اس موسم میں یہ سب باتیں بہت اچھی طرح پر سکھائی جاسکتی ہیں۔

(۳) اگر ضرورت محسوس ہو اور کئی تاریخی مقامات کو دیکھنا ہو اور اُن کے متعلق تاریخی نقشوں کے خاکے کھینچنے یا تیار کرنے ہوں تو زیادہ وقت دیا جانا چاہئے۔ لیکن یہ بات مدنظر رہنی چاہئے کہ اکسکرشن کو ذریعہ تعلیم بنانا مقصود ہے۔ کسی طرح پر وہ باعث تکلیف نہو جائے۔

(۴) طلباء کو اکسکرشن پر لے جانے سے پیشتر ان کے اور موسم کے متعلق ڈاکٹر کی رائے ضرور لے لینا چاہئے اور ممکن ہوسکے تو ایک چھوٹا ڈاکٹر یا کمپونڈر معہ ادویات ضروری اُن کے ہمراہ بھیجنے کا انتظام کیا جائے۔

(۵) اساتذہ متعلقہ پہلے ہی سے مقام اکسکرشن کا فیصلہ کریں۔ اور جو جو سامان رہائش۔ خوراک اور درس کے لئے ضروری ہو، اُس کا بندوبست کیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی اسکول میں اکسکرشنز کا رواج عرصہ سے ہے۔ لیکن اب تک اُس کا منشاء و مقصد سوائے تفریح کے اور کچھ نہ تھا۔ عالی جناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ایما سے تین اکسکرشنز ظہور وارڈ بورڈنگ ہوس کے طلباء کی گئیں۔ ان میں علاوہ تفریح کے ڈرائنگ نیچر اسٹڈی اور جغرافیہ پر سبق دے جانے کا انتظام کیا گیا۔ یہ سبق بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوئے۔ ان کے متعلق تین فوٹو اور طلباء کی ڈرائنگ کانفرنس کی نمائش میں موجود ہیں۔

طلباء کو اکسکرشن پر لیجا کر مختلف درس دینا ایک بہت مفید طریقہ ہے۔ ہر اسکول کے اساتذہ افسران اس طریقۂ تعلیم کی طرف توجہ فرمائیں اور طلباء کو اکسکرشنز پر لیجا کر اُن مضامین کے درس کے متعلق مختلف تجربے کریں جن کی تعلیم اسکول میں ہوتی ہے۔ اور مفید ثابت ہونے پر جیسا کہ یقین ہے کہ ضرور ایسا ہوگا۔ اپنے اپنے اسکولوں میں اسے باقاعدہ جاری کریں۔ جب مدارس میں اس کا رواج عام طور پر ہو جائیگا۔ تو اس کا نصاب تعلیم میں داخل کیا جانا اور گورنمنٹ سے گرانٹ کا حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہ ہوگا۔

لکچر نمبر ۱۴

بوائے اسکاؤٹنگ کی اہمیت
تعلیمی اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے

مرتبہ

سید آل علی صاحب نقوی بی اے۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس مراد آباد

جناب صدر انجمن بزرگان قوم و معزز حاضرین و برادران!

جس محرک نے مجھکو اس امر پر آمادہ کیا ہے کہ میں اس کانفرنس میں باوجود اپنی بے بضاعتی کے اسکاؤٹنگ جیسے اہم مسئلہ پر آپ صاحبان کے روبرو اظہار خیالات کروں یہ ہے کہ سابق مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کا ایک عقیدت کیش فرزند اور مسلمانوں کی درماندہ قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے جس کا ماضی نہایت شاندار اور مستقبل امید افزا ہے میرے نزدیک یہ بہت اہم اور ضروری ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی کے معزز ارکین بھی اس عالمگیر تعلیمی تحریک کی جانب منضبط طریقہ سے مستقل طور پر توجہ منعطف فرمائیں۔ تاکہ ہماری قوم کے بچے بھی اپنے مذہبی و قومی خصائص کو اختیار کرتے ہوئے دیگر اقوام ہند کی نئی نسل کے دوش بدوش اور ان سے متحد ہو کر اس نفع رساں تحریک میں پورا حصہ لیں اور اس کے مفید اصول پر عمل پیرا ہو کر اچھے شہری بنیں۔ نیز انفرادی و جماعتی فوائد اور ترقیات میں بیش از بیش اضافہ کر کے قومی سربلندی کا باعث ہوں۔

سب سے پہلے مختصراً یہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گو اس طریقہ کی ابتدا، نہایت چھوٹے پیمانہ پر اور محدود شکل

میں وقتی فوجی ضرورت کے لحاظ سے سر رابرٹ بیڈن پاول نے جنگ ٹرانسوال کے زمانہ میں کی تھی لیکن بعد اختتام جنگ انھوں نے اس کا مکمل نظام مرتب کرکے انگلستان میں شائع کیا تو نہ صرف انگلستان بلکہ دیگر ممالک یورپ امریکہ کے ماہرین تعلیم و نیز مدبرین نے نہایت گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اس کی اشاعت و تبلیغ ہر ملک میں نہایت تیزی سے ہونے لگی یہاں تک کہ اس وقت تک دنیا کی چھپتر قومیں اس کو اختیار کر چکی ہیں جن میں عثمانی ترک اور میسوپوٹامیہ کے اعراب بھی شامل ہیں۔ اور دنیا میں تقریباً پندرہ لاکھ بوائے اسکاؤٹس موجود ہیں۔ جن میں سے نصف امریکہ میں اور ایک چوتھائی انگلستان میں ہیں اور باقی تعداد دیگر اقوام عالم پر مشتمل ہے۔

میں نے برسبیل تذکرہ ترکان آل عثمان کے اس تحریک میں شمول کا صرف حوالہ دیا ہے لیکن اگر میں یہ بتاؤں کہ ترکوں نے اس تحریک کو جنگ عظیم کے شروع ہونے سے قبل یعنی ۱۹۱۴ء کے ابتدائی حصہ میں ہی اپنی قوم میں جاری کر دیا تھا تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ سمجھا جائیگا کہ ترکوں کی نشاۃ الثانیہ میں اس تحریک کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اور غازی انور پاشا مرحوم و مغفور نے اس تحریک کے متفرق اجزا کو مسلمانوں کے پرانے مستعملات میں سے نہ بھی سمجھا تاہم بموجب حدیث شریف "الحکمۃ ضالۃ المومن" اُسے اپنا سمجھ کر بڑے جوش و خروش سے اپنی قوم میں فی الفور رائج کر دیا۔

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بوائے اسکاؤٹنگ کے ذریعہ سے جو ایک عملی اور اخلاقی طریق تربیت ہے نہ صرف ان عام نقائص کی رفعداد اور اصلاح ہی ہوتی ہے جو مروجہ نظام تعلیم میں بالعموم پائے جاتے ہیں بلکہ بچوں میں زمانہ صغر سنی میں ہی ان اخلاق عالیہ اور اعمال صالحہ کی تخم ریزی اور نشو و نما ہوتی ہے۔ جو آگے چل کر اُن کو اچھا انسان اور اچھا شہری بنانے میں ممد ہوتے ہیں اور یہ جماعت نہ صرف اپنے ملک و قوم بلکہ بنی نوع انسان کے لئے باعث فخر ہوتی ہے اور اخلاقی ترقی کے معیار کو نمایاں طور پر بلند کرتی ہے۔

قبل اس کے کہ تعلیمی و اسلامی نقطہائے نظر سے بوائے اسکاؤٹنگ کے اصول پر غور کیا جائے اجمالی طور پر اُس کے بنیادی مقاصد اور اصول تربیت کا تذکرہ بغرض تکمیل مضمون ہذا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس تحریک کا مدعا یہ ہے کہ بچوں کو زیادہ تر انہیں مشاغل کے ذریعہ سے تربیت دی جائے جو انھیں فطرتاً پسند ہوتے ہیں اور سہ گانہ اغراض تعلیمی یعنی جسمانی تندرستی و توانائی ذہنی بیداری اور اخلاقی امتیازی پیدا کرکے ان کی ذہنی طاقتوں کو ترقی و جلا دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں سچائی ایمانداری اولوالعزمی جرأت و مردانگی خودداری خود اعتمادی اطاعت و وفاداری اور رحمدلی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بے غرضانہ خدمت خلق کا مخلصانہ شوق اور بڑے بڑے کام کرنے کی امنگ پیدا کیجائے۔

ظاہر ہے کہ قریب قریب یہی اغراض نظام تعلیم کے بھی ہیں اور ہر ملک میں باوجود اختلاف مدارج ترقی کمانہ

کم اصولی طور پر دماغی جسمانی و اخلاقی ترقی کی کوشش کی جاتی ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مقاصد مذکورہ کے حصول میں عملی طور پر جس قدر کامیابی بوائے اسکاؤٹنگ کے ذریعہ سے ہوئی اور ہو رہی ہے وہ نہایت ممتاز و نمایاں ہے اور اس وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علم التعلیم سے اس کا تعلق اور عام نظام تعلیم کے مقابلہ میں اس کے وجوہ امتیاز بیان کئے جائیں۔

مکمل ترین شکل میں تعلیمی نصب العین پانچ پہلوؤں پر مشتمل ہے یعنی جسمانی تعلیم۔ دماغی تعلیم۔ جذباتی تعلیم۔ اخلاقی تعلیم و مذہبی تعلیم اور ان سب کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بعد تکمیل مدارج تعلیم آگے چل کر ہم میں بہترین طریقہ سے زندگی بسر کرنے کی قابلیت پیدا ہو بلکہ یہ ہے کہ ان کی مدد سے ہم دوران تعلیم میں ہی مکمل طور پر زندگی بسر کرنے لگیں اور ہر دور لمحات پر اس میں بیش از بیش ارتقا ہوتا رہے۔

اس کا مطلب سادہ الفاظ میں یہ ہو کہ وہی نظام تعلیم و تربیت زیادہ مکمل و مستحسن سمجھا جاسکتا ہو جس کی مدد سے انسان عملی و واقعی طور پر صراط مستقیم اختیار کرلے اور حیات کاملہ کے آثار اس میں ابتداء سے ہونے لگیں۔ اس موقع پر یہ بھی جتا دینا مناسب ہو کہ جب تک قانون تسلسل کا انقطاع نہیں ہوتا یہ امر یقینی طور پر مسلم الثبوت ہو کہ ہر انسان کی شخصیت مستقبل میں بعینہٖ اسی نظام عمل کی تکمیل یافتہ صورت ہوتی ہو جو وہ اس وقت اختیار کر رہا ہے۔

خیالات بالا کو مدنظر رکھکر اگر دیکھا جائے تو بوائے اسکاؤٹنگ ایک ایسا طریق تربیت ہے جو مذکورہ بالا معیار پر پورا اترتا ہے اور چونکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ امر بھی بدرجہ اتم ملحوظ رکھا گیا ہے کہ عصر جدید کے اس میلان عام کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے کہ ہر شخص ذاتی وانفرادی مدارج کمال کے حصول کی سعی کرتے ہوئے اپنی کوششوں کو جمہوری فوائد سے مربوط کرتے اور سوسائٹی کے مفاد سے کسی وقت غافل نہو۔

اس اعلیٰ اور شریفانہ اور درحقیقت اسلامی نصب العین تک پہنچنے کے واسطے بوائے اسکاؤٹنگ میں جو مضبوط بنیاد قائم کی گئی ہے اور جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں انھیں میں اس کی روز افزوں اشاعت و کامیابی کا راز مضمر ہے۔

بوائے اسکاؤٹنگ کے بنیادی اصول تربیت

۱۔ بچوں کے فطری میلان اور ذہنیت (Child Psychology) کا اس نظام میں پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور جدید اصول تعلیم کے مطابق اس طریقہ پر بچوں کی تربیت کی جاتی ہے کہ ان کے دلوں کو خوش رکھکر کھیل ہی کھیل میں مفید اور گرانقدر امور کی تعلیم دیجائے۔

۲۔ اس زمانہ میں کہ ہنوز بچوں کے خصائل میں لچک موجود ہوتی ہے اور ان کے طبائع میں شگفتگی اور دل

دماغ میں جدید تاثرات قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے ان کے Sense of honour
یعنی پاس آبرو کے احساس کو بیدار کر کے Character building یعنی تا بیں اخلاق کی بنیاد
مضبوط کی جاتی ہے جو ہر شعبہ حیات میں یکساں طور پر ضروری ہے۔

۳۔ جو مسرت روحی کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے انسان کو طبعاً حاصل ہوتی ہے اور جس خصلت
کی تربیت و ترقی پر نظام مذہب اور نظام معاشرت دونوں میں بہت کچھ اہمیت دی گئی ہے اس کی لذت عنفوان
شباب میں ہی بچوں کے قلوب میں پیدا کر کے انھیں اس امر کا خوگر بنایا جاتا ہے کہ وہ اس برگزیدہ صفت کو اپنی
زندگیوں کا اصلی نصب العین قرار دیں اور تعلیمی نصب العین کے جملہ ذاتی مدارج تکمیل کے حصول کو اسی منزل
کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچنے کا زینہ قرار دیں اور ظاہر ہے کہ اگر ایسا کیا جائیگا جس کی کہ بوائے اسکاؤٹنگ
کے ذریعہ سے کوشش ہو رہی ہے۔.........

.........تو حیات قومی و ملکی کی بیشمار کثافتیں اور امراض دور ہو کر ہماری نئی نسلیں اپنی قوم و ملک بلکہ
بنی نوع انسان کے لئے باعث عزت ہونگی۔

۴۔ چوتھا اصول جو اسکاؤٹنگ میں ملحوظ رکھا جاتا ہے یہ ہے کہ Instruction
یعنی بیرونی امداد پہونچا کر تعلیم دینے کے بجائے اس میں اس امر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ تربیت دہندہ اپنی عمدہ
مثال اور حسب ضرورت راہنمائی سے بچے کو خود اس کی ذاتی کوشش اور توجہ سے اس کی استعداد اور خداداد
قوائے ذہنی کو نشو و نما دینے میں مدد دے جو کہ تعلیم Education کا اصلی مفہوم و مقصد ہے یہاں
تک کہ بچہ میں بتدریج خود آئین طلیعہ کی راہنمائی اور عادات حسنہ اور مشاغل خیر کے اثر سے برائی سے بچنے اور محاسبہ
نفس کر کے اپنی ذاتی اصلاح اور تزکیہ نفس کر نیکی استعداد ترقی پائے۔

۵۔ اسکاؤٹنگ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کھیلوں کو بہت زیادہ اہمیت دیجاتی ہے اور
جن امور کی تفصیلات باوجودیکہ وہ تعلیم و تربیت کا اصلی مقصد ہیں ہیلو کے سلیبس یا کریکولم یا پراسپیکٹس
میں نہیں ملتی مثلاً دیانتداری فوری انتقال ذہن سے صحیح رائے قائم کرنا مستعدی حوصلہ مندی جرأت و
بہادری کامل توجہ اور دلجمعی سے مفوضہ فرائض کو انجام دینا طبع آزمائی اور فائدہ ذاتی کو فائدہ عام کے
تابع کرنے کی خصلت ان کی تربیت مخصوص اور دلچسپ کھیلوں کے ذریعہ سے کیجاتی ہے۔

۱۔ اصول طلیعہ کے بیان کرنے کے بعد ان طریقہ جات کا اجمالی ذکر کافی ہوگا جو کام میں لائے جاتے
ہیں اور جن سے اکثر معزز حاضرین آگاہ ہونگے۔

(۱) ہر جدید اسکاؤٹ سے اس کے پاس آبرو یعنی عزت نفس کی کفالت پر نہایت سنجیدگی سے اول

تین حلف لئے جاتے ہیں کہ وہ خدا وطن اور بادشاہ کا وفادار رہیگا دوسرے لوگوں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہیگا اور آئین طلیعہ کے دس دفعات کی جو جملہ مذاہب کے علم الاخلاق کا لب لباب کہے جا سکتے ہیں پابندی کرے گا۔

۲۔ ضمناً کھیلوں اور دیگر مشاغل طلیعہ میں بچّوں کی نگرانی اور راہنمائی کرکے اور براہ راست بذریعہ مثال ولیکچر اسکاوٹس کو آئین طلیعہ کا عامل بنایا جاتا ہے۔

۳۔ اسکاؤٹنگ کے مخصوص اور دلچسپ کھیلوں کے ذریعہ سے علاوہ ترقی صحت وتوانائی و دیگر فوائد جسمانی بچّوں کے قوائے دماغی مثلاً حافظہ۔ توجہ۔ مشاہدہ و قوت فیصلہ وغیرہ کی تربیت ہوتی ہے۔ اور سراغ رسانی ونیز بوقت ضرورت اپنی حفاظت کرنے کی عملی تدابیر عملی طور پر سکھائی جاتی ہیں۔

۴۔ کیمپنگ (یعنی سیر وسفر) کے ذریعہ سے جو نظام اسکاؤٹنگ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بچّوں کو پیدل سفر کرنے کیمپ کا خود انتظام کرنے اور اسی ضمن میں بچوں میں تقسیم عمل ہمدردی باہمی یکجوئی جفاکشی وخود اعتمادی میں ترقی ہوتی ہے۔

۵۔ کیمپ فائر یعنی بوقت شب الاؤ پر مجتمع ہو کر بچے تفریح طبع کے لئے نظم خوانی لیکچر قصہ کہانی اور دوسرے دلچسپ مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں۔ جن سے ان کی قوت بیانیہ ونیز اظہار مطالب و مضمون آفرینی کی طاقت بڑھتی ہے اور مشاہیر قوم کے حالات وسوانح سنکر خود بھی اسی طرح کارنامے کرنے کی امنگیں اُن کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

۶۔ کھیل ہی کھیل میں بچّوں کو جھنڈی وسیٹی وہیلیوگراف وتار برقی و دیگر ذرائع سے خبر رسانی کا کام سکھایا جاتا ہے۔ نیز مریضوں اور زخمیوں کی فوری طبّی امداد کرنے کے طریقے۔ آتشزدہ مقامات میں پہنچ کر نقصان جان و مال کو کم کرنے اور روکنے کے تدابیر بحالت سکتہ مصنوعی تنفس کے ذریعہ سے ڈوبے ہوئے آدمیوں کو ہوش میں لانے کے ذریعے بڑے بڑے مجمعوں کے انتظامات کرنے اور بھیڑ ہٹانے کے قاعدے اور بوقت ضرورت عسرت کے ساتھ معمولی سامان سے سیڑھیاں پل چھپّے اور ڈولیاں بنانے کی ترکیبیں اور ان کو استعمال کرنے کے ڈھنگ اور اسی طرح کی اور بہت سی مفید باتیں بتائی جاتی ہیں۔ جن کے فوائد اظہر من الشمس ہیں۔

۷۔ بچّوں کو ان کے مختلف مبلغ کے مطابق مختلف فنون مفید اور دستکاریاں سیکھنے کی رغبت دلائی جاتی ہے اور مقررہ ومناسب معیار میں کامیاب ہونے پر انہیں ان مضامین کے نشانات تمغے یعنی Proficiency badges دیئے جاتے ہیں۔

۸۔ طغرائے طلیعہ یعنی Scouts motto جو بجائے خود جذبات کا محرک قوی ہے

یہ ہے Be Prepared یعنی مستعد رہو اور اس نظام کے مستند اور مقررہ دستور العمل کے مطابق ہر اسکاؤٹ کو روزانہ کم از کم ایک Good turn یعنی کارِ خیر کرنا لازمی ہے۔

اس مبحث کا تعلیمی پہلو ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس اصولی فرق کو بھی بیان کر دیا جائے جو کہ نظام تعلیم مروجہ میں بمقابلہ نظام طلیعہ بہ لحاظ طرقِ تربیت و ترتیب مقاصد پایا جاتا ہے۔

اول الذکر میں بغیر طلبہ کے انفرادی میلان طبع کا خاص لحاظ کئے ہوئے ایک عام اور مشترک نظام درس کی طلبہ سے تکمیل کرائی جاتی ہے اور انہیں درجات میں اجماعی طور پر تعلیم دیجاتی ہے مثلاً کلاس میں بعض مضامین لازمی ہیں اور خواہ کسی طالب علم کا رجحان طبع اس مضمون کی طرف نہ ہو پھر بھی اسے نصاب تعلیم کی تکمیل کی غرض سے باول ناخواستہ سیکھنا پڑتا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ جو مضامین نصاب تعلیم کی رو سے کسی جماعت کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ بجائے خود ضروری اور مفید ہیں لیکن خاص خاص بچوں کو خاص رجحان کا نہ کوئی عام نصاب تعلیم ذمہ دار ہو سکتا ہے نہ ہے۔ اس کے بالمقابل اسکاؤٹنگ میں ہر بچہ کے مخصوص فطری میلان کو دریافت کرکے اور اس کو مد نظر رکھکر حتی المقدور فرداً فرداً توجہ دیجاتی ہے۔

نظام تعلیم میں بالخصوص جو کہ ہندوستان میں نافذ اور رائج ہے ترتیب مقاصد یہ ہے کہ سب سے مقدم حصول علم اور اس کے بعد صحت جسمانی اور سب سے آخر میں درستی اخلاق حالانکہ اسکاؤٹنگ میں یہ ترتیب الٹ کر یوں ہو جاتی ہے کہ اول تربیت اخلاق دوم تربیت جسمانی اور سوم حصول علم زیادہ تر ذاتی کوشش سے۔

مصرعہ بالا فرق کو مد نظر رکھکر یہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل کی زندگیاں حسب دلخواہ کامیاب بنانے کے واسطے نظام اسکاؤٹنگ کو نظام تعلیم مروجہ کا لازمی طور پر تتمہ قرار دیا جاوے اور مستقل طور پہ اچھے راہنماؤں کی زیر نگرانی اس پر کماحقہٗ توجہ دیجائے۔

اسلامی نقطہ نظر اب اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تب بھی اسکاؤٹنگ کی تربیت نہایت درجہ قابل توجہ اور لائق عملدرآمد معلوم ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ یہ طلیعہ فی الجملہ انہیں اصول اور طرق پر مبنی ہے جن کی ہدایت نبی اکرم حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم و دیگر بزرگان اسلام نے فرمائی ہے اور نہ صرف ان امور کی تلقین ہی فرمائی ہے بلکہ بیشمار برگزیدہ مثالیں بطور شمع ہدایت دنیا بھر کی اور بالخصوص مسلمانان عالم کی راہنمائی کے لئے چھوڑ دی ہیں۔

Selfless service یعنی بے غرضانہ خدمت خلق کو اسکاؤٹنگ کی روح رواں کہنا بے جا نہ ہوگا اس کے متعلق حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نہایت جامع و فصیح الفاظ میں جو تاکید فرمائی ہے وہ ان احادیث قدسیہ سے بین طور پر ظاہر ہے۔

(۱) الخلق کلھم عیال اللہ فاحب خلقہ الیہ انفعھم لعیالہ

(۲) خیر الناس من ینفع الناس

(۳) سید القوم خادمھم

اسکاؤٹنگ میں جرأت وبہادری وعزت نفس پر زور دیا جاتا ہے جو حیات شخصی وملی کا ایک عنصر لازمی ہے اس کے بارہ میں کوئی تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ یہ وصف مسلمانوں کا من حیث القوم ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے اور تاریخ قدیم وجدید دونوں اس پر شاہد ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ اب پھر مسلمانان ہندوستان میں اس جذبہ کو اصلی حالت پر نہ لایا جائے۔

آئین طلیعہ کا پانچواں قانون ہے کہ طلیعہ خلیق ہوتا ہے اس ضمن میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا خلق عظیم ہماری راہنمائی کے لئے کافی ووافی ہے اور اس ملکوتی صفت کی اہمیت نص صریح وانک لعلی خلق عظیم سے بھی واضح ہے علاوہ بریں حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقاً

اسکاؤٹنگ کا نواں قانون ہے کہ اسکاؤٹ کو کفایت شعار ہونا چاہئے حدیث نبوی میں کسی خوبی اور جامعیت سے ارشاد ہوا ہے "کلوا وتصدقوا والبسوا بغیر اسراف ولا مخیلۃ"

مذکورہ بالا خیالات کو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ادا کرنے کے بعد اب میں اپنے نفس مدعا کو عرض کرنا چاہتا ہوں اس امر واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت تک ہمارا عزیز قومی کالج جو کہ بفضلہ اب مسلم یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچ گیا ہے مسلمانان ہند کی حیات ملی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ثابت ہوا ہے اور چونکہ سرسید اعظم علیہ الرحمۃ نے شروع سے ہی اپنے مقاصد بہت بلند اور اپنا نصب العین بہت اونچا رکھا تھا ہمارے اس مرکز قومی کی شعاعیں دور دور تک پہنچیں اور یہ عظیم الشان درسگاہ اکثر امور میں مخصوص طور پر ممتاز رہی۔

ان حالات وروایات کو مدنظر رکھکر یہ امید کرنا بالکل حق بجانب ہے کہ بوائے اسکاؤٹنگ میں بھی ہماری یونیورسٹی بہت جلد ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچکر خدمت قوم وخدمت مادر وطن کو باحسن الوجوہ سرانجام دیگی اور مسلمان بچے بھی اپنے ہموطن بھائیوں سے سبق لیکر نہ صرف نام کے بلکہ سچے اسکاؤٹ بننے کی مساعی حسنہ میں بلا تامل وتاخیر سرگرمی سے معروف ہو جائیں گے اور اس دھبہ کو اپنی قوم سے جلد تر دور کردیں گے کہ وہ ترقی کی ہر دوڑ میں کم از کم ایک نسل پیچھے رہ جاتی ہے۔

ختم کلام پر اس امر کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں میں تحریک اسکاؤٹنگ کی ابتدا تقریباً ۱۹۱۶ء میں ہوئی اور چونکہ ہندو اکابر قوم کی دوربین نگاہوں نے اسکاؤٹنگ کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج کو شروع سے ہی پہچان لیا تھا لہذا انھوں نے ایک مستقل اور منضبط مرکزی بوائز اسکاؤٹس ایسوسی ایشن زیر سرپرستی

سیوا سمتی ایسوسی ایشن الہ آباد قائم کی جو پہلے سے قائم تھی اور جس کا کام خدمت خلق ہے۔

اول الذکر انجمن کے پیہم اور مستقل ان تھک کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ ہندوستان کے اور صوبوں اور بعض ریاست ہائے دیسی میں سیوا سمتی بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کی شاخیں قائم ہو گئیں اور ہو رہی ہیں اور صوبہ ہذا کی گورنمنٹ نے اس کا درجہ بیڈن پاول ایسوسی ایشن لکھنؤ کے مساوی قرار دیکر دونوں کو یکساں گرانٹ دی ہے۔

اس انجمن نے جس مستعدی سرگرمی اور خلوص اور رواداری سے کام شروع کیا ہے وہ ارکان ایسوسی ایشن کے لئے باعث تحسین ہے صوبہ ہذا کے بعض اضلاع کے ورنیکیولر مدارس میں بھی یہ تحریک پہونچ گئی ہے اور انجمن مذکور کی کوشش سے ہندی و اردو میں اسکاؤٹنگ کا لٹریچر تیار ہو رہا ہے اور چونکہ اس خاکسار کو بھی اس انجمن کے رکن ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ حاضرین کرام اسے خود ستائی پر محمول نہ فرمائیں گے اگر میں یہ عرض کروں کہ اردو لٹریچر کی تیاری میں میں نے اپنے مقدور بھر حصہ لیا ہے فقط

لکچر نمبر ۱۵

تعلیم بالغان

مرتبہ

سید بشیر الحسن صاحب زیدی۔ بی اے۔ بیرسٹرایٹ لا حال ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڑھ

"تعلیم بالغان" کے معنی

حضرات جس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے میں کھڑا ہوا ہوں اُس کے لئے افسوس ہے کہ اب تک اُردو میں کوئی معقول اصطلاح وضع نہیں ہوئی۔ بہت کچھ غور کے بعد اور کوئی بہتر اصطلاح ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے میں نے اس مضمون کا عنوان "تعلیم بالغان" قرار دیا ہے۔ تعلیم بالغان سے مراد اُن لڑکوں کی تعلیم نہیں جو سن بلوغ کو پہنچ چکے ہوں۔ بلکہ اُن پختہ عمروں کی تعلیم۔ عام اس سے کہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ جو طالب علمی کی محدود مدت کو ختم کرنے کے بعد یا اس شیریں زمانہ کی چاشنی چکھے بغیر عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ جس طرح عام تعلیم سے مراد "تعلیم الاطفال" ہے۔ اسی طرح تعلیم بالغان" سے مراد "تعلیم الرجال" ہے۔

ہندوستان میں لوگ پختہ عمروں کی تعلیم کی اہمیت نہیں سمجھتے

حضرات۔ تعلیم کا مفہوم اگرچہ بیحد وسیع اور تعلیم کا زمانہ انسان کی تمام زندگی ہونی چاہیئے۔ لیکن ہندوستان کے عرف عام میں

تعلیم بچوں اور لڑکوں کے لئے مخصوص سمجھی گئی ہے۔ اور اس سے غالباً دو فائدے متصور کئے گئے ہیں۔ اول یہ کہ بچے دن بھر گھر میں پڑے پڑے شور و غل۔ شرارت اور دنگے۔ بیسیوں ضدوں اور سیکڑوں سوالوں سے ماں باپ کا دم ناک میں نہ کر دیں۔ اور اُن کے عیش و آرام اور روزمرہ کے کاموں میں خلل نہ ڈالیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی امتحان پاس کر کے تلاش روزگار میں سیکڑوں دروازوں پر مارے مارے پھریں اور بہ ہزار خرابی چار پیسے کی نوکری حاصل کریں۔ موجودہ طریقہ تعلیم سے نہ طلباء کو فائدہ ہے نہ قوم کو۔ اگر فائدہ ہے تو اول ماں باپ کو کہ چھ گھنٹہ روز کی جھنجھٹ اور بچے کے دل و دماغ کو خود صحیح طریقہ پر تربیت دینے کے بوجھ سے بچ جاتے ہیں۔ یا گورنمنٹ کو کہ آج سیکڑوں بی اے پاس تیس تیس چالیس چالیس کی نوکری کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یا استادوں کو جنھیں رزق کے سب دروازے بند ہو جانے کے بعد یک لخت محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُن کے مقاصد زندگی صیغۂ تعلیم سے وابستہ ہیں۔

اگر تعلیم کے وسیع معنی ہمارے مدنظر ہوتے اور اُس سے مراد افراد کا تزکیہ نفس۔ اُن کے کیرکٹر کی ساخت اور اُن کی ذہنی۔ جسمانی و روحانی ترقی ہوتی تو ہم تعلیم کے زمانہ کو بیس یا بائیس سال کی عمر تک محدود نہ کر کے "ز گہوارہ تا گور دانش بیاموز" پر عمل کرتے۔ اور آج ہمارے ملک میں لڑکوں کے اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ ہزارہا تعلیم گاہیں ان لوگوں کے لئے ہوتیں جو طالب علمی کے شیریں زمانے کو ختم کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی تعلیم کے متعلق پبلک میں احساس پیدا کرانے کی بیحد ضرورت ہے اور اس کی چند وجوہات میں یہاں بیان کرونگا۔

"تعلیم بالغان" کی اہمیت

(۱) اول تو۔ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم جبریہ اور عالمگیر ہو گئی تو بھی موجودہ نسل کے کروڑوں آدمی جو زمانہ طفولیت سے گذر چکے ہونگے اَن پڑھ رہجائینگے اور اُن کی تعلیم کے لئے ظاہر ہے کہ ہمیں خاص انتظامات کرنے پڑیں گے۔ اس وقت ہندوستان میں ہر محب وطن کی یہ خواہش ہے کہ دس سال بعد ملک بھر میں کوئی جاہل شخص نظر نہ آئے جب تک ابتدائی تعلیم کے ساتھ بالغوں کی تعلیم کا ابھی کوئی معقول انتظام نہ کیا جائے یہ تمنا پوری ہونی ناممکن ہے۔

(۲) ابتدائی تعلیم سے سوائے تھوڑی بہت نوشت و خواند اور شد بد کے معقول علم حاصل نہیں ہو سکتا ایک لڑکا جو بارہ سال کی عمر تک پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی کام پر لگ گیا ہے دو چار سال میں اپنی تعلیم کا ۸۰ فی صدی حصہ بھول جائیگا۔ بارہ سال سے پرے تعلیم کو ہم سب بچوں کے لئے جبریہ تو کر نہیں سکتے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ ایسے طلباء کو سکول چھوڑنے کے بعد اپنا علم تازہ رکھنے اور اُسے مزید

ترقی دینے کے مواقع دئے جائیں۔ ۱۹۱۸ء کے تعلیمی بِل کے مطابق انگلستان میں تمام وہ لڑکے جو کارخانوں دکانوں، ڈاکخانوں اور دیگر سرکاری محکموں میں کام کرتے ہیں ۱۸ سال کی عمر تک ہفتہ میں چند گھنٹے مفت تعلیم حاصل کریں گے اور یہ گھنٹے اُن کی ملازمت میں شمار ہونگے۔ اس طرح امید کی گئی ہے کہ بہت زیادہ طلبا بچپن کا پڑھا لکھا یاد رکھیں گے اور اُن کا تعلیمی شوق تازہ رہے گا۔ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد قانون تو تعلیم کے لئے کوئی قید نہیں لگاتا۔ لیکن قوم نے اس پر بھی اکتفا نہ کرکے یہ کوشش کی ہے کہ ساری عمر تعلیم کی تجدید ہوتی رہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے آخری پچاس سال میں تعلیم بالغان کے متعلق اس قدر دلچسپی کا اظہار ہوا ہے کہ ہر طرف کالج ہوں یا یونیورسٹیاں۔ میونسپلٹیاں ہوں یا مرکزی حکومت۔ کوششیں کی جارہی ہیں کہ قوم کے کل افراد کے لئے خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ امیر ہوں یا مزدور۔ تعلیمی سہولتیں پیدا کی جائیں۔

(۳) کسی لڑکے کی اعلیٰ تعلیم کے مدرسے صد یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ اُس کی دماغی ترقی ایک اونچے درجہ تک پہونچ جائے۔ مختلف مضامین مثلاً زبان۔ ادبیات۔ تاریخ۔ فنون لطیفہ اور سائنس وغیرہ میں علم کی بنیادیں مضبوطی سے قائم ہو جائیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کا کیرکٹر بن جائے۔ یہ ذکر ہے بہترین طلبا کا۔ عام طور پر تو طالب علم اعلیٰ تعلیم سے اس کا آدھا حصہ بھی حاصل نہیں کرتے۔ لیکن اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ عوام الناس تو در کنار۔ خواص کے لئے بھی تعلیم کا تسلسل اور تجدید لازم ہے۔ ورنہ جو دماغی قوتیں انھوں نے زمانہ طالب علمی میں حاصل کی تھیں وہ زنگ لگ کر نکمی ہو جائیں گی۔ ڈارون کے مسئلہ ارتقا سے آپ کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ پچھلی صدی کے قابل ترین شخصوں میں سے تھا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے "تقریباً تیس سال کی عمر تک مجھے مختلف شعراء کے کلام سے بیحد محبت تھی اور زمانۂ طفولیت ہی سے شکسپیر اور خصوصاً اُس کے تاریخی ڈراموں کا بیحد شوق تھا۔ لیکن اب چند سال سے میں نظم کی ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتا۔ تصاویر اور موسیقی میں بھی میری دلچسپی مُردہ ہوگئی ہے۔ لطیف چیزوں کے مذاق کی اس کمی نے میری مسرت حیات کو کم کر دیا ہے۔ اور اس طرح میری فطرت کے جذباتی پہلو کمزور ہو کر غالباً میرے دل و دماغ اور بالخصوص میرے کیرکٹر کو صدمہ پہنچائیں گے۔ اگر میں اپنی زندگی کا اعادہ کرسکتا تو روز کچھ نظم پڑھنا اور ہفتہ میں کم سے کم ایک دفعہ موسیقی سننا اپنا معمول قرار دیتا۔" حضرات۔ اگر ڈارون جیسے شخص کے لئے اپنے علم و ذوق کو تازہ رکھنے کی اس قدر ضرورت تھی تو ظاہر ہے کہ عوام الناس تو پھر کس شمار قطار میں ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی کو سنجیدہ سیع اور اعلیٰ تعلیم کے بعد شروع کیا تھا اُن میں بہ کثرت ایسے افراد پائے جائیں گے جنھوں نے اپنی تعلیم کو زندہ نہ رکھنے کے باعث اپنی شخصیت کے اثر اور دلچسپی۔ اور اپنی وسعت نظر اور قوت تصور کو

کمزور کر لیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ برے اور قابل افسوس وہ لوگ ہیں جن کی تعلیم زمانہ طالب علمی میں معمولی سے زیادہ نہ ہوئی تھی لیکن بعد میں انھوں نے اپنے محدود علم کو تازہ رکھتے اور اپنی جہالت کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ تجدید اور توسیع علم ہم سب کے لئے لازم ہے۔ اور جسمانی ورزش کی طرح ذہنی ورزش بھی روزانہ ضروریات سے ہے۔ زمانہ طالب علمی تو ہمارے ذہن اور دماغ کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ اور ہم صرف اتنا سیکھتے ہیں کہ مطالعہ کا ہے کا اور کس طرح کرنا چاہئے۔ لیکن خود مطالعہ تو صحیح معنوں میں طالب علمی کا زمانہ گزرنے پر شروع ہوتا ہے۔ ہم میں سے کون شخص بیسیوں شعبہ ہائے علم وحیات میں اپنی جہالت ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اور کون ہے جو علم کے بیشمار وسیع میدانوں سے ناواقف ہونے کے باعث روز یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ بہت کچھ فائدوں۔ قوت۔ اور خوشی سے محروم ہے؟

مسلسل تعلیم کی ضرورت

(۱) انفرادی نقطۂ نظر سے

کس قدر خشک۔ بنجر۔ اور غیر دلچسپ ہے وہ زندگی جسے تاریخ سے کچھ دلچسپی نہیں جس میں فنون لطیفہ کے لئے کچھ احساس نہیں۔ جس پر ادبیات کے بہترین نمونے کچھ بھی اثر پیدا نہیں کرتے! ظاہر ہے کہ زمانہ طالب علمی میں ان چیزوں کے ذوق کی محض ابتدا ہوتی ہے۔ زندگی میں داخل ہونے کے بعد اسے رفتہ رفتہ جلا اور ترقی دینا ہر اس شخص کا فرض ہے جو مذاق سلیم کا مالک اور سچی خوشی کا طالب ہے۔ اکثروں کی جوانیاں روزمرہ کی مصروفیتوں میں کٹ جاتی ہیں اور مکروہات دنیا اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ مگر تنہائی۔ بیماری۔ اور بڑھاپے میں جاہل دماغ اپنی بے بضاعتی کو محسوس کرتا ہے۔ اس مجمع میں سیکڑوں ہوں گے جنھیں اس وقت جب کہ بیماری یا مصیبت کے بادل چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے کسی بزرگ کے اقوال۔ کسی عظیم الشان ہستی کی سوانح عمری۔ یا کسی مشہور شاعر کا کلام پڑھکر نور دل۔ تقویت۔ اور مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔

(۲) قومی نقطۂ نظر سے

لیکن تعلیم بالغان کی سب سے بڑی ضرورت اعلیٰ مقاصد قومی کی بنا پر ہے۔ اس شخص سے زیادہ ضرورت مسلسل تعلیم کی کسی کو نہیں جس کی زندگی کا مقصد اوروں کی بہتری اور مفاد ہو۔ متعدد موقعوں پر یہ بات آپ کے تجربہ میں آئے گی کہ وہی لوگ با اثر سیاسی۔ مذہبی یا سوشل لیڈر بن سکتے ہیں جو تعلیم کے حامی ہوں اور خود اپنی تعلیم بھی جاری رکھیں۔ آج کتنے ہی مسلمان اس بات کے متمنی ہیں کہ قوم کی تعلیم کو بہتر بنایا جاوے لیکن یہ سہرا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب ہی کے سر رہا ہے کہ کانفرنس کی طویل تاریخ میں صرف اس برس سالانہ جلسہ کو پرانی ڈگر سے ہٹا کر اسے ایک نئی اور بہتم بالشان شاہراہ پر لگایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ قیام انگلستان میں صاحبزادہ

صاحب نے اُن تھک کوششیں اس بات کی کیں کہ ولایت کے طریقۂ تعلیم کی تمام خرابیوں کا اچھی طرح مطالعہ کرکے ان کے متعلق ہندوستانی پبلک کو مطلع کریں۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص جو اپنا مطالعہ ہمیشہ وسیع نہ کرتا رہے قوم کے تعلیمی مسائل کو حل کر سکے۔ یا قوم کے کسی اور شعبہ میں کوئی قابل قدر خدمت انجام دے سکے۔ آج ہمارے

علماء کے لئے تعلیم بالغان کی ضرورت

مذہبی پیشواؤں اور عالموں کا اثر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے علم کی کمی ہی اس امر کا باعث ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات مولویوں سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ایک عالم دین کے لئے زہد و اتقا۔ صداقت و پاکیزگی۔ اور واقفیت امور شرعیہ کے علاوہ اس بات کی بیحد ضرورت ہے کہ وہ عقلیات زمانہ سے آگاہ ہو۔ اور رفتار زمانہ کے مطابق موجودہ علم و فلسفہ اور سائنس سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد لوگوں کو ہدایت کرے۔ اور جوں جوں علم میں ترقی ہوتی رہے وہ بھی اپنے علم کو بڑھاتا رہے۔ ہمارے علماء کا یہ حال ہے کہ سوائے معدودے چند کے کسی کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان وغیرہ میں علوم اسلامی کے متعلق کیا کیا نایاب نسخے شائع ہو رہے ہیں اور ان ممالک کے مستشرقین اسلامی موضوعات پر کیا کیا تصانیف کر رہے ہیں۔ جن مسلمان نوجوانوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم ملی ہے ان کا فرض ہے کہ کم سے کم ہر اس شہر میں جہاں علوم قدیمہ اور روایات اسلامی زندہ ہیں مکتبوں اور ملاؤں سے قطع تعلق کرنے کی بجائے ان سے اچھے تعلقات قائم کریں۔ ان کے بھلے اور برے میں شریک ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے طریقۂ تعلیم اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنے کے لئے خاص تعلیمی سہولتیں مہیا کریں۔

پبلک لیڈران

جو لوگ قوم کے نمایندے بن کر میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جا رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ مختلف مسائل کے متعلق اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھیں۔ وہ شخص اپنے قصبہ۔ شہر یا ملک کی کیا خدمت کر سکتا ہے جسے یہ معلوم نہیں کہ شہر کن اصول پر بنانے چاہئیں۔ واٹر ورکس حفظان صحت۔ روشنی وغیرہ کے متعلق کیا کیا انتظامات لوکل ضروریات کے لئے بہترین ثابت ہوں گے ابتدائی اور ثانوی اسکول کن اصول پر بنانے چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل کے متعلق معقول اور تشفی بخش واقفیت کا ہونا کچھ معمولی کام نہیں۔ دنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے اور جو اصول کل تک مناسب تھے وہ آج قصۂ ماضی ہو گئے۔ بغیر مسلسل تعلیم کے کوئی شخص پبلک اور شہری ضروریات کے متعلق بہترین معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ انگلستان میں لندن کاؤنٹی کونسل۔ مزدوروں کے متعلق قانون سازی۔ شہروں کو خوبصورت بنانے۔ بچوں کی صحت بہتر کرنے اور ایسے ہی بیشمار مضامین کے متعلق سوسائٹیاں قائم ہیں جو

پبلک کی تعلیم جاری رکھتی ہیں۔ اور عامۃ الناس میں مختلف ضروریات قومی کے متعلق احساس اور دلچسپی پیدا کرتی ہیں۔ وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہم تعلیم بالغان کے اس سبب سے اہم پہلو کی اہمیت کو سمجھیں اور ہندوستانی پبلک کو بھی، مختلف مقامی اور قومی مسائل، کے متعلق تعلیم دیں۔

اُستاد صاحبان

اس مجمع میں ایک کافی تعداد اُستادوں کی موجود ہے۔ اور اُن کے لئے بھی مسلسل تعلیم لوازمات سے ہے۔ صرف وہی اُستاد ہر ننھی سی ہستی کی بارکیوں کو سمجھ اور ہر دل کی گہرائیوں تک پہونچ سکتا ہے جس کے پاس اثر پیدا کرنے کے بیسیوں طریقے موجود ہوں اور جو مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے کام لے سکے۔ شاگرد چھوٹے ہوں یا بڑے۔ بہت جلد معلوم کر لیتے ہیں کہ آیا اُن کا اُستاد ایک گراموفون کی مانند ہے جو ہر سال وہی پُرانی باتیں سنا تا رہتا ہے۔ یا ایک وسیع اور بڑھتے رہنے والے علم کا مالک جس کے دماغ میں علم کے بہت سے پنہاں خزانے موجود ہیں۔ جو ابھی طلباء کی آنکھ سے اوجھل ہیں۔

ماں باپ

ماں باپ کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے علم کو ہمیشہ تازہ اور وسیع کرتے رہیں۔ ورنہ اپنے بچّوں کی صحیح ہدایت کے بہت سے موقع انہیں نصیب تو ہونگے اور اُن کے اور اولاد کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو جائے گی جو محبت اور روحانی یگانگت کے راستہ میں ایک زبردست خطرہ ہوگی۔ بہت سے اچھے پڑھے لکھے ماں باپ ایسے ہیں جو اپنے نوجوان لڑکوں کے عمیق ترین جذبات اور احساسات کو سمجھنے سے عاری ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کی ذہنی ترقی عرصہ سے بند رہی ہے اور وہ وہیں ہیں جہاں آج سے بیس برس پہلے تھے۔ مثلاً بہت سے ہر طرح معقول اور سمجھدار باپ نہیں سمجھتے کہ اُن کا لڑکا باوجود بیحد اعلیٰ تعلیم کے کیوں ایک بڑھیا نوکری سے جی چُرا کر سکول میں پڑھانے کا متمنی ہے۔ یا شادی کے بارے میں اُس کے خیالات اُن کے اپنے خیالات سے اس قدر مختلف کیوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے والدین اور اُن کے بچّوں کے تعلقات کبھی بیحد خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ خون کی محبت تو خدا نے جزو فطرت بنا دی ہے اور زائل نہیں ہو سکتی لیکن ایسے والدین اپنے بچّوں کے رفیق حیات۔ دوست۔ اور محرم نہیں بن سکتے۔ جس کے بغیر میرے نزدیک باپ اور بیٹے کے تعلقات میں کبھی حقیقی لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔

تاجر

اور لوگ تو در کنار تجارت اور دیگر کاروبار میں مصروف اشخاص کے لئے بھی مسلسل تعلیم کی ضرورت ہے۔ بزنس میں بھی صحیح فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو علاوہ اپنے پیشہ کے مخصوص علم کے علاوہ وسعت نظر رکھتا ہو اور آدمیوں اور امورات کے جانچنے میں تیز ہو۔ یہ بات اُس شخص میں کبھی نہ پائی جائے گی جو اپنی تعلیم بیس سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے ختم کر چکا ہو اور اپنے کاروبار کو ایک مقررہ

ڈگر پر چلا رہا ہو۔ ہمارے یہاں کے تاجر۔ کارخانے دار۔ کسان سبھی لکیر کے فقیر ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ہفتہ میں ایک بار ان کی ضروریات کے مطابق ایسے لیکچر دئے جائیں جو قابل عمل ہوں تو چند سال میں ان کی حالت بہت کچھ بدلی ہوئی ہوگی۔

اس طویل بیان کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ قوم کے ہر فرد کے لئے قطع نظر اس سے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے مسلسل تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کا احساس افراد کو اس وقت تک اچھی طرح پیدا نہ ہوگا جب تک ملک میں تعلیم بالغان کا ایک عام چرچا نہ ہونے لگے۔ یونیورسٹیوں کالجوں اور دیگر تعلیمی انجمنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مغربی تعلیم گاہوں کی مثال پیش نظر رکھکر اجتماعی کوشش کام میں لائیں، اور تعلیم بالغان کی تحریک باقاعدہ شروع کردیں۔

فرصت کی اہمیت

لیکن قبل اس کے کہ ہمارے ملک کے غریب جہلا کو تعلیم بالغان کا موقعہ مل سکے اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کے لئے فرصت کے اوقات پیدا کئے جائیں۔ ہندوستان میں سوائے طبقہ امراء کے ہر شخص کو اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ تعلیم کے لئے کوئی وقت نکالنا بیحد مشکل ہوجاتا ہے۔ انگلستان میں مزدور پیشہ لوگ اتوار کو بالکل کام نہیں کرتے کیونکہ تمام کارخانے اس دن حکماً بند رہتے ہیں۔ ہر روز بھی وہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رات کے وقت وہ لیکچروں وغیرہ میں شریک ہوسکتے ہیں اور اتوار کو انہیں بہت کچھ وقت اخبارات اور کتابیں پڑھنے۔ مذہبی واعظوں میں جانے۔ بالغوں کی جماعت میں تعلیم پانے۔ یا باغات کتب خانوں۔ عجائب گھروں، قابل دید عمارتوں اور تصویر خانوں کی سیر کے لئے مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انگلستان میں زیادہ تر دکانیں ہفتہ میں ڈیڑھ دن بند رہتی ہیں۔ اتوار کو پورے دن اور کسی اور روز آدھے دن۔ ویسے بھی ہر روز زیادہ تر دکانیں چھ بجے بند ہوجاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اس بات کی بیحد ضرورت ہے کہ ہفتہ میں ایک دن ہوٹلوں اور دوائی خانوں کے علاوہ باقی سب دکانیں قانوناً بند رہیں۔ چونکہ سبھی دکانیں بند ہونگی کسی دوکاندار کو مالی نقصان بھی نہ ہوگا اور گاہکوں کو بھی بہت جلد دو دن کا سامان ایک دفعہ خرید لینے کی عادت ہوجائے گی۔ اس طرح اگر ہفتہ میں ایک دن ملک بھر کے لئے آرام اور فرصت کا دن مان لیا جائے اور سرکاری دکانوں کارخانوں۔ بنکوں وغیرہ وغیرہ کے ملازم اس دن خالی ہوں۔ اور لڑکوں کی چھٹی ہو تو پھر وہ دن تمام قوم کے لئے آرام وسکون جسمانی اور ذہنی ترقی۔ اور لطف و مسرت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ تمام بڑے میچ۔ کشتیاں۔ مظاہرے۔ جلسے۔ مذہبی وعظ اور مجلسیں اسی دن منعقد کی جائیں اور مختلف

مضامین میں بالغوں کی جماعتیں بنا کر لیکچر دیے جائیں۔ تعلیم بالغان کا مفہوم نہایت وسیع ہونا چاہیے
عوام الناس جو اپنے مقررہ کام کی محدود دنیا میں زندگی کا ہر دن گذارتے رہتے ہیں ان کے لئے یہ
بھی تعلیم اور روحانی ترقی کا ایک ذریعہ ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک دن اگر اور کچھ نہیں تو صرف فٹ بال کا میچ
خود کھیلیں یا اوروں کو کھیلتا ہوا دیکھیں۔ یا تھیٹر۔ بائسکوپ وغیرہ دیکھنے جائیں۔ یا باغوں، شاندار اور تاریخی
عمارتوں اور عجائب خانوں کی سیر کریں۔ غرضکہ کسی نہ کسی طرح اگر وہ اپنے پیشہ کی محدود دنیا سے نکل کر خدا کی پیدا
کی ہوئی دنیا کو دیکھیں اور گھر سے نکل کر اس خالق کی شان اور اس کے بندوں کے کارناموں کا مطالعہ کریں
تو سمجھئے کہ ان کی تعلیم شروع ہو گئی ہے۔

تعلیم بالغان کا وسیع مفہوم

تعلیم بالغان سے مراد پختہ عمروں کا صرف جماعتوں میں پڑھنا نہیں بلکہ
ہر طریقے سے ان کی واقفیت۔ مذاق اور کیرکٹر میں ترقی پیدا کرنا۔ چونکہ طلبا
کی تعلیم ہندوستان میں بیحد غلط اصول پر ہوتی ہے اور بچوں کے نزدیک ایک مصیبت عظیم سے کم نہیں ہوتی لہذا
اسکول چھوڑنے کے بعد ان کے دل میں دماغی دلچسپیوں کے برخلاف ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ان
لوگوں سے کہا جائے کہ طالب علمی کے زمانے کو ختم کرنے کے بعد بھی برابر پڑھتے رہو تو ان میں سے بہت کم
دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بالغ کسی کے مارے باندھے تو پڑھنے سے رہے۔ ان کی تعلیم تو کلی
طور پر ان کی ذاتی خواہش اور شوق کا نتیجہ ہوگی۔ بہت مناسب ہوگا اگر پختہ عمروں کی تعلیم اس قسم کی ہو جس
سے ان کے شوق میں ترقی ہو۔ اور جو ان کی اپنی ذاتی خواہشات۔ حالات زندگی۔ اور پیشہ کی ضروریات کے
مطابق ہو۔ مثلاً ایک ماؤں کی جماعت کے لئے بہترین مضمون زچہ گری۔ بچوں کا رکھ رکھاؤ اور حفظان صحت
کے اصول کی تعلیم ہوگی۔ کسانوں کے لئے بہترین مضمون کاشتکاری ہے۔ مثلاً آپ اگر ایک گاؤں میں گنے
کی کاشت پر لیکچر دیں اور اس کے بہترین طریقے انہیں آسان زبان میں بتلائیں اور سینما کی امداد سے انھیں
دکھائیں کہ جاوا میں گنے کی کاشت کس طرح ہوتی ہے اور شکر سازی کے اصول کیا ہیں تو وہ بہت جلد تعلیم میں

پیشہ کے متعلق تعلیم

دلچسپی لینے لگیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ انہیں ان مضامین پر کتابیں دی جائیں۔ اور
اگر وہ ان پڑھ ہیں تو اول تو تمام لیکچروں کو وہ بیحد شوق اور غور اور تنقیدانہ حیثیت
سے سنیں گے اور پھر رفتہ رفتہ ان میں سے کم از کم کچھ کے دل میں یہ شوق پیدا ہوگا کہ انہیں بھی پڑھنا لکھنا آجائے
ضرورت اس کی ہے کہ شروع شروع میں انھیں ایسی باتیں بتلائی جائیں جو قابل عمل اور آسان ہوں۔ ان پر عمل
کرنے سے اگر ان کی آمدنی میں ترقی ہوئی تو پھر ان کی دلچسپی تعلیم میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور روز بروز زیادہ
واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ صرف شکر سازی کو لیجئے۔ اگر آپ اس کے متعلق اس صوبہ کے

زمینداروں اور کسانوں کو عام فہم لیکچر دیں تو وہ بیحد دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ رفتہ رفتہ آپ کے طلبا کو معلوم ہو گا کہ جاوا ایک ملک ہے جہاں فی ایکڑ ہمارے یہاں سے ۸ گنی شکر پیدا ہوتی ہے۔ جرمنی ایک ملک ہے جہاں چقندر سے شکر بنائی جاتی ہے۔ روس ایک اور زبردست ملک ہے جہاں سے شکر کی مقدار کثیر آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کاشتکاری کے بہتر اصول معلوم کرنے کے علاوہ انہیں جغرافیہ سے دلچسپی پیدا ہوگی اور دیگر ملکوں کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ اسی طرح بمبئی کے گرد و نواح میں اُن مزدوروں کے لئے جو کپڑے کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں تعلیم کی بہترین ابتدا اس طرح ہوگی کہ روئی کی کتنی قسمیں ہیں۔ اور کہاں کہاں سے آتی ہیں۔ کپڑے بننے کی صنعت نے کس طرح ترقی کی ہے۔ اور اس ترقی کی تاریخ کیا ہے۔ روئی کن کن کیمیائی اور میکینکل عملوں کے بعد کپڑے کی صورت میں تبدیل ہوتی ہے۔ کپڑا بننے کے لئے کس قسم کی آب و ہوا۔ کس قسم کی مشین اور کس قسم کی پیداوار والی زمین کے قرب کی ضرورت ہے۔ انہیں بتلانا ہوگا کہ مانچسٹر میں کون کون سی طبعی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہاں بہترین کپڑا بنا جاتا ہے۔ اور ہندوستان میں اس کام کے لئے بہترین قسم کے مقامات کہاں کہاں ہیں۔

تعلیم بالغان کا تعلق صرف پیشہ اور کاروبار سے نہ ہونا چاہیئے

ان اصول پر بالغ طلباء کی تعلیم شروع کرنے سے ان کی دلچسپی قائم رہے گی اور رفتہ رفتہ ان کا علم وسیع تر ہوتا چلا جائیگا۔ مثلاً کسانوں کی جماعت میں کچھ عرصہ بعد کم سے کم کچھ افراد ایسے نکلیں گے جو کوآپریٹو سوسائٹیوں۔ مشترکہ طور پر بیج ہل۔ بیل وغیرہ خریدنے اور مشترکہ طور پر پیداوار بیچنے کے فائدوں اور کاشتکاری کے علمی طریقوں کی اہمیت اور ضرورت سے واقف ہونے لگیں گے۔ کارخانوں کے مزدور طلباء کی جماعت میں سے کچھ افراد ایسے نکلیں گے جو رفتہ رفتہ ان مسئلوں پر غور کرنا شروع کرینگے کہ ان کے روزانہ کام کی علت غائی کیا ہے۔ یہ اس طرح کیوں ہوتا ہے۔ پچھلے زمانہ میں یہی کام کس طرح ہوتا تھا اور آئندہ اس میں کیا کیا ترقیاں ہو سکتی ہیں۔ وہ سوچنے لگیں گے کہ ٹریڈ یونین یعنی مزدوروں کے اتحاد کے کیا معنی ہیں دیگر ملکوں میں یہ جماعتیں کس طرح کام کر رہی ہیں۔ اور ہندوستان میں انہیں کن اصول پر چلانا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح ان مزدوروں کو اقتصادیات کا بہت کچھ علم ہو جائیگا۔

لیکن ان مثالوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ پختہ عمروں کی تعلیم کا اہم پہلو صرف وہ ہے جس کا تعلق اُن کے پیشہ اور کاروبار سے ہو۔ پیٹ بڑی بلا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی تعلیم جس سے مادی فائدہ حاصل ہو اکثر آدمیوں کو زیادہ پسند آئے گی۔ لیکن جس طرح پیٹ جسم انسانی کا معزز ترین عضو نہیں ہے اسی طرح پیشہ سے متعلق تعلیم بھی تعلیم بالغان کا اہم ترین پہلو نہیں۔ زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد

یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے پیشہ کی محدود اور اکثر غیر دلچسپ دنیا میں خواہ اس سے کتنے ہی بڑے مادی فائدے کیوں نہ حاصل ہوں۔ اپنی حیات چند روزہ گذار دے۔ کون صاحب دل ہوگا جو ایک بنیہ یا مارواڑی کی

انسان کی زندگی کو پاکیزہ بنانا تعلیم بالغان کا سب سے اہم نصب العین ہے

زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہو جو اور کیا مزہ ہے ایسی زندگی میں جو عناصر لطیف اور مذاق سلیم سے معرّا ہو؟ کس قدر پھیکی ہے اس شخص کی زندگی جس کے دل میں دریا شب ماہ کے نظارے" گرمیوں کی شام کو کھیت سے لوٹتے ہوئے کسانوں کے گیت" یا عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار" کی دید سے کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں ہوتا! اور کس قدر قابل افسوس ہے اس ہندوستانی کی زندگی جو اشوکا اور اکبر کے کارناموں سے ناواقف اور غالب کے کلام کی خوبیوں سے ناآشنا ہو۔ جو بھیرویں۔ ٹھمری اور قوالی میں امتیاز نہ کر سکے جس کے دل میں ہمالیہ جیسے سر بفلک پہاڑ کی کوئی عظمت اور کشمیر جیسی جنت نظیر سرزمین کی کوئی محبت نہ ہو! کس قدر بے معنی ہے اس شخص کی ہستی جس کا کوئی اعلیٰ نصب العین یا عظیم الشان خواب نہ ہو جس کے خیالات تنگ اور ہمتیں پست ہوں؟ ہندوستان میں آج ۳۵ کروڑ آدمی موجود ہیں جن کی دلچسپیاں اس کے پیشہ تک محدود اور جن کی زندگیاں لطیف مشاغل اور شستہ مذاق سے خالی ہیں۔ دیہات کی زندگی تو خاص طور پر بے رنگ اور بے لطف ہے جس میں نہ کسی قسم کے علمی چرچے ہیں نہ ادبی صحبتیں۔ نہ موسیقی کا ذوق نہ مصوری کی چاشنی۔ کس قدر زمین و آسمان کا فرق ہے ہمارے اور جرمنی کے دیہات میں آج باوجود خستہ حالی کے جرمنی کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں آپ کو ریڈنگ روم اور کتب خانے ملیں گے اور ہر طرف ادبیات۔ موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے لئے ایک قومی جذبہ نظر آئیگا۔ ہمارا فرض ہے کہ تعلیم بالغان کو ایسے اصول پر چلائیں جن سے ایک طرف تو ہمارے بھائیوں کو مالی اور مادی فائدہ پہونچے اور دوسری طرف ان کے مذاق میں شستگی و شائستگی پیدا ہو اور اُن کی دلچسپیاں وسیع' ان کے مقاصد بلند اور ان کے نصب العین اعلیٰ بنجائیں۔

فرصت کا صحیح استعمال سکھانا تعلیم بالغان کا مقصد ہے

ہمارے ملک میں اول تو لوگوں کو کافی فرصت نہیں ملتی لیکن فرصت کے جو محدود اوقات میسر آتے ہیں وہ بھی بہترین طریقے سے صرف نہیں کئے جاتے۔ اکثر لوگ فرصت کا وقت گھر پر پڑے پڑے یا دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں گذار دیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جنھیں اُس وقت گانا سننے' کتابیں پڑھنے' تھیٹر یا بائسکوپ جانے کا خیال آتا ہے۔ لیکن جو گانا انہیں بھاتا ہے وہ اکثر عامیانہ ہوتا' جو ناول وہ پڑھتے ہیں وہ اکثر ادنیٰ درجہ کے اور مخرب اخلاق اور جس تماشہ میں وہ جاتے ہیں وہ اکثر پاکیزہ مذاق سے گرا ہوا ہوتا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے لئے بہتر دلچسپیوں کا سامان مہیا کریں جس سے انہیں روحانی واخلاقی۔ ذہنی و جسمانی ہر طرح کا فائدہ حاصل ہو۔

لکچر نمبر (۱۶)

انجمنہائے امداد باہمی اور تعلیمی جدوجہد

مرتّبہ

آغا عطاء اللہ خاں صاحب۔ جی، سی، ایس، اسسٹنٹ رجسٹرار
کواپریٹو سوسائٹیز منٹگمری (پنجاب)

انسان کو ہر ایک کام کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایک طالب علم کو مدرسہ جانا ہے تو اُسے جانے سے پہلے کھانا کھانا ہوگا۔ کپڑے پہننے ہونگے یہی ہماری تعلیمی کانفرنس جو آج ہورہی ہے اس کا انتظام کئی مہینوں سے ہو رہا تھا۔ دراصل آرگنائزیشن یا تنظیم ہی ہر ایک کام کی کامیابی کی کنجی ہے۔ اس وقت یورپین ممالک میں مختلف قسم کے آرگنائزیشن جو کام کررہے ہیں ان میں سب سے بہتر آرگنائزیشن جو تمام دنیا پر اپنا تسلط جما رہا ہے وہ کوآپریشن ہے۔ یہ ایک نہایت سادہ اصول ہے۔

کوئی کام جب انسان خود اپنی تنہا کوشش سے سرانجام نہیں دے سکتا تو وہ قدرتاً دوسرے کی امداد چاہتا ہے وہی کام اب دوسروں کی امداد سے باآسانی اور جلدی ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جس میں کہ چند اشخاص اپنی اقتصادی ترقی کے لیے باہم مل جاویں۔ ان میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہو ہر ایک کی رائے برابر ہو۔ یہاں سرمایہ کا کوئی دخل نہیں اور ان میں سے ہر ایک کا فرض ہو کہ وہ سب کی امداد کرنا اپنا نصب العین قرار دیں اور سب کا فرض ہو کہ وہ ہر ایک کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ یہی

کواپریشن کا اصول ہی سلف ہیلپ یا اپنی مدد آپ کرنا بہت اچھا ہی لیکن جب سلف ہیلپ مدد باہمی سے مل جائے تو اُس کی طاقت دوگنی ہو کر ترقی یقینی ہو جاتی ہی۔ رلیفائزن جسے اس تحریک کا بانی کہنا چاہئے فرماتے ہیں کہ جو اس اتحاد میں اس غرض سے شامل ہو کہ اس کی ذات کو فائدہ حاصل ہو وہ خود غرض ہی۔ لیکن جو اس غرض سے شامل ہو کہ اس کی شمولیت سے اس کے دوسرے بھائیوں کو فائدہ پہنچے اور پھر اس کو بھی فائدہ حاصل ہو تو یہ نہایت قابل تعریف ہی۔ گویا پہلے دوسرے بھائی کا فائدہ مدنظر ہو۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ اگر اس مشترکہ فائدہ کے واحد مدعا کو دل میں لیئے ہوئے چند اشخاص باہم مل جاویں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ جس کام کے لئے کمرہمت باندھیں وہ کامیابی کو نہ پہنچے۔

دراصل یہ اسلام کا اصول تھا جسے ہم نے چھوڑ دیا اور یہی وجہ ہی کہ ہم ابتر حالت میں ہیں دولت ہمارے پاس نہیں تعلیم ہم میں نہیں۔ غرض کونسی کمی ہی جو ہم میں نہیں پائی جاتی۔ چند اصحاب جو شہروں میں بستے ہیں اور صاحب ثروت اور صاحب علم ہیں اس سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قوم خوش حال ہی۔ زرعی آبادی قعرِ مذلت میں ڈوبی ہوئی ہی ان بیچاروں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آج شدھی کا ہر طرف چرچا ہے۔ یہ کیوں۔ صرف اس لیے کہ روپیہ کا لالچ۔ مگر ہماری یہ مشکلیں اُسی وقت حل ہو سکتی ہیں جب قوم خوش حال ہو لیکن یہ ایک دن کا کام نہیں۔ انگلستان جو آج روپیہ کے زور سے تمام دنیا پر حکومت کر رہا ہی یہ دولت اس کے باشندوں نے کفایت شعاری سے صدیوں میں جمع کی۔ بدقسمتی سے ہم جس قدر کماتے ہیں اُسی قدر کھا لیتے ہیں بچانے کی ہم میں عادت نہیں جو بُرے وقت میں کام آئے۔ مصیبت کے وقت تو بچانے کا ہر ایک کو ضرور خیال آتا ہی لیکن اس کا فوری اثر جلدی رفع ہو جاتا ہی۔ ہمارے علماء کرام سود لینے کے برخلاف تو خوب زور سے فتویٰ دیتے ہیں لیکن کون مسلمان ہی جو سود نہ دیتا ہو۔ اگرچہ سود دینا بھی ناجائز ہے مگر دبی دبی زبان سے کہہ دیا جاتا ہی کہ یہ حالت مجبوری ہی۔ افسوس۔ اگر سود نہ دینے پر بھی ویسا ہی زور دیا جاتا تو بھی ہم مسلمان بچ جاتے۔ آپ یہ سُن کر حیران ہونگے کہ پنجاب کے زمیندار جو زیادہ تر مسلمان ہیں سالانہ ۱۲ ½ کروڑ روپیہ صرف سود میں ادا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم دوسری قوموں کا گھر اپنی محنت شاقہ سے تو خوب بھرتے رہیں اور خود بھوکے مریں۔ اگر ہمیں دنیا میں اور قوموں کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کوآپریشن یا مدد باہمی ہماری ہر بیماری کا علاج ہی۔ کونسا ملک ہی جو آج اس پر عمل پیرا نہیں ہی۔ جرمنی کی آج سے ساٹھ سال پہلے نہایت خراب حالت تھی۔ لیکن آج وہ دنیا میں ایک نہایت آرگنائزڈ ملک ہے باوجود اس کے کہ جرمنی کو لڑائی میں بہت نقصان ہوا ہی لیکن کوآپریشن اب بھی وہاں نہایت

زور سے پھیل رہی ہے جو علاقہ ملک فرانس کو اُسے دینا پڑا - اس میں ۲۳۰۰ سوسائیٹیوں کو بھی خیرباد کہنا پڑا لیکن اس کے دو سال بعد دس ہزار اور نئی انجمنیں قایم ہو گئیں - اب وہاں ہر قسم کی ایسی انجمنوں کی تعداد سینتالیس ہزار ہے جن میں ستر لاکھ خاندان کسی نہ کسی طرح شامل ہیں - ڈنمارک میں امداد باہمی کے طریقے پر مکھن کے کارخانوں نے اسے نہایت خوشحال ملک بنا دیا ہے - اٹلی میں یہ تحریک نہایت سرعت سے پھیل رہی ہے - انگلستان میں کوآپریٹو اسٹور نہایت کامیابی سے کام کر رہے ہیں جن میں تقریباً تیس لاکھ ممبر ہیں اور جو سالانہ چار کروڑ روپیہ کا مال فروخت کرتے ہیں اور اپنے ممبروں کو کروڑوں روپے واپسی قیمت میں دے چکے ہیں - غرضیکہ ہر ایک ملک میں یہ تنظیم بہت کارگر ثابت ہوئی ہے - ہندوستان میں بھی یہ کام ۱۹۰۴ء سے جاری ہے - ہر ایک صوبہ میں اس کی کچھ نہ کچھ ترقی ہو رہی ہے - لیکن اگر پنجاب کے کچھ حالات بیان کر دیے جائیں تو وہ خالی از دلچسپی نہ ہونگے -

مہاجن - زمیندار کو سب سے بڑی ضرورت قرضہ کی ہے - یہ اپنے بُرے بھلے وقت کے لئے کچھ نہیں بچا پاتا - اس کی ضرورت کا کوئی وقت نہیں - ساہوکار اس کی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر سود لیتے ہیں - اس وقت چالیس ہزار ساہوکار پنجاب میں موجود ہیں - جن کا گذارہ انھیں غریبوں کی کمائی پر ہے اور یہ سالانہ ایک بڑی نہر کی قیمت اُنھیں صرف سود میں ادا کرتے ہیں پنجابی زمیندار کی سب سے بڑی ضرورت کوآپریٹو کریڈٹ کی تھی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قرضہ کی انجمنیں بنائی گئیں جو پنجاب میں اس وقت نو ہزار کے قریب ہیں جن میں ۲۲½ لاکھ ممبر شریک ہیں - قرضہ کی انجمن بہت چھوٹے رقبہ میں قایم کی جاتی ہے جہاں ممبران آپس میں ایک دوسرے سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں - اس انجمن کا انتظام کرنے کے لیے تمام ممبران سالانہ انتظامیہ کمیٹی کا انتخاب کرتے ہیں یہ کمیٹی ممبران کو مناسب اور جائز ضروریات کے لئے قرضہ دیتی ہے - بیرونی قرضہ جات کے لیے انجمن کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے - یعنی تمام ممبران مشترکاً و منفرداً ان قرضہ جات کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن اس خطرہ سے بچنے کے لئے کمیٹی کئی ایک طریقے اختیار کرتی ہے - ہر ایک فصل پر ممبران کچھ رقم جو کم از کم آٹھ آنہ ہوتی ہے بطور حصہ داری کے دس سال تک ادا کرتے رہتے ہیں - اس طرح سے جو رقم جمع ہوتی ہے اُسے قرضہ پر دیا جاتا ہے - لیکن ممبران کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ انجمن سنٹرل بینک جو ان دیہاتی بنکوں کو قرضہ دینے کے لیے قایم ہوتی ہیں ان سے نو فیصدی پر قرضہ لیتی ہے اور آگے اپنے ممبران کو ساڑھے بارہ روپیہ فیصدی پر قرضہ دیتی ہے اس طرح سے اور حصہ داری کی رقم پر جو سود سے منافع ہوتا ہے وہ سرمایۂ محفوظ میں جمع ہوتا رہتا ہے اور اُسے بھی قرضہ

دینے میں ہی استعمال کیا جاتا ہے جو رقم اس طرح سود سے بچتی ہے۔ اور ممبران کے حصہ داری کی جو رقم جمع ہوتی ہے ان سے ایک ایسا سرمایہ قائم ہو جاتا ہے۔ جو غیر محدود ذمہ داری کے خطرہ سے بچنے کے لئے ایک بہترین پناہ ہوتی ہے۔ ان دیہاتی انجمنوں نے اب اس طرح سے بہتر لاکھ روپیہ منافع جمع کر لیا ہے اور پینتالیس[۵] لاکھ روپیہ ان کے حصہ داری کی رقم ہو گئی ہے۔ گویا یہ ایک کروڑ اور ستر لاکھ روپیہ کی رقم بہت معمولی سی کوشش اور بچت سے پیدا ہو گئی ہے اور ممبران اسے محسوس ہی نہیں کرتے ہیں لیکن اس بچت کے علاوہ ممبران ساہوکارہ ن کا پرانا قرضہ بھی ادا کرتے رہتے ہیں اپنی اراضیات فک کراتے ہیں اور جب روپیہ ہو تو اور زمین بھی خریدتے یا رہن لیتے ہیں۔ جب کوئی انجمن دس سال کی عمر ختم کر لیتی ہے۔ تو اس کی دس سالہ ترقی کا نقشہ بنایا جاتا ہے جس سے اس کی ترقی یا تنزل معلوم ہوتا ہے چنانچہ گزشتہ سال تقریباً ۸۶۵ انجمنوں نے اپنی عمر کے دس سال پورے کئے تھے جن میں ۳۲۰۰۰ ممبران شریک تھے۔ ان میں ۸۰۰۰ ممبران تو اس عرصہ میں ساہوکاری قرضہ جات سے بالکل آزاد ہو گئے ہیں اور باقی ابھی مقروض ہیں جو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس دس سال کے عرصہ میں ان ممبران نے ۴۳ لاکھ روپیہ تو کھلا قرضہ ادا کیا ہے اور ۱۷ لاکھ سے زائد کی اراضی فک کرائی ہے۔ اور تقریباً اٹھارہ لاکھ کی زمین خرید کر لی ہے۔ اور اکیس لاکھ سے زائد کی رہن لی ہے۔ اس کے علاوہ ممبران نے ۲۷ لاکھ سے زائد حصہ داری اور منافعہ کی رقم جمع کر لی ہے گویا اس دس سال کے عرصے میں ممبران نے ۱۵ لاکھ سے زائد تو زیر باری قرضہ میں کمی کی ۶۶ لاکھ کے قریب اپنے اثاثہ میں بیشی کی اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کس قدر مفید ہے اور اس سے زمینداروں کو کیا فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ جہاں پر یہ دیہاتی انجمن کامیابی سے کام کرتی ہے وہاں لوگوں میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی بری رسومات کی اصلاح کرتے ہیں مقدمہ بازی کم ہو جاتی ہے ان میں بچانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے اپنے حسابات رکھنے کے لوگ عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنا چاہیئے کہ امداد باہمی ان میں پوری اصلاح کر دیتی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی سلف گورنمنٹ ہے جہاں دیہاتی انجمن قائم ہے وہاں ہر ایک قسم کی ترقی کا کام ہو سکتا ہے۔ اب ضلع جالندھر ہوشیار پور گورداسپور جہاں کہ یہ تحریک بہت پرانی ہے وہاں پر منتشر شدہ کھاتہ جات کو ایک جگہ اکٹھی کرنے کے لیے انجمنیں قایم ہو رہی ہیں۔ ان اضلاع میں ملکیتیں بہت تھوڑی ہیں اور وہ بھی کئی ایک جگہ پر واقع ہیں۔ بعض جگہ اوسط رقبہ فی کھیت ¼ ایکڑ اور بعض جگہ ½ حصہ فی ایکڑ پایا گیا۔ اکثر ملکیتیں تیس تیس چالیس چالیس جگھوں پر واقع ہیں۔ ان حالات میں زراعتی ترقی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ کہیں یہ شکل کو اپریٹو طریقہ

سے رفع ہوگئی ہے لوگ ہر جگہ ایسا کرنے کے لیے تیار ہیں صرف عملہ کی ضرورت ہے لیکن یہیں ہی ہمارا کام ختم نہیں ہوجاتا۔ قرضہ کے بعد زمیندار کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اُسے اپنی پیداوار کی پوری قیمت ملے۔ لیکن درمیانی آدمی اس قدر فائدہ اٹھا لیتے ہیں جو اس کی اصل قیمت سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے آڑہت کی دکانوں کا مختلف جگہوں پر تجربہ ہو رہا ہے ایسی چھ انجمنیں ضلع لائل پور اور منٹگمری میں ہیں۔ جن میں گزشتہ سال ۲۸ لاکھ سے زائد کی پیداوار فروخت ہوئی۔ اور انھیں پوری قیمت ملی۔ اسی طرح سے زمینداروں کو ارزاں قیمت پر اشیاء بہم پہنچانے کی بھی علیحدہ انجمنیں ہیں۔ اور بھی کئی قسم کی انجمنیں ہیں جن کا ذکر کرنا باعث طوالت ہوگا اس لئے اب میں نہایت ضروری حصہ پر آتا ہوں جو تعلیم سے تعلق رکھتا ہے۔

ہماری تعلیمی جدوجہد

مسلمانوں میں سب سے بڑی ضرورت تعلیم کی ہے۔ اور مختلف صوبوں کی رپورٹیں صاف بتلا رہی ہیں کہ ہم اپنی ہمسایہ قوموں سے اس گھوڑ دوڑ میں بہت ہی پیچھے ہیں۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور وہاں وہ جاہل زمیندار رہتے ہیں جو اب بھی تعلیم کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ پنجاب میں میں نے خود ایسے دیہات دیکھے ہیں جو اسکول قایم ہونے پر اپنے بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ باوجود اس کے تعلیم یافتہ اصحاب اور خاص کر ہمارے علماء کرام نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ اُن کو آہستہ آہستہ تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ دیہاتی کو اکثر گنوار جاٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس سے ملنا تو درکنار اُس سے بات کرنا بھی عار سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے جسقدر جلسے واعظین کے ہوتے ہیں وہ سب شہروں میں ہوتے ہیں جہاں پر ہمارے لیڈر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں اور اُن کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی اور پھر اخباروں و رسالوں میں یہ شور مچایا جاتا ہے کہ قوم تعلیم میں پیچھے ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب اور ہمارے لیڈروں کا قصور ہے۔ اس وقت تک جسقدر تعلیم پر زور دیا گیا ہے وہ شہروں میں دیا گیا ہے۔ لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہات میں رہتا ہے جب تک کہ آپ ان کی خبر نہیں لیں گے اُس وقت تک ہماری ترقی نہیں کہلا سکتی ہے۔ پنجاب میں کواپریشن کی ترقی نے دیہاتیوں میں احساس پیدا کر دیا ہے اب وہ اپنی ان کمیوں کو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے محسوس کرتے ہیں زمینداروں کی زیرباری قرضہ کا ایک یہ بھی باعث ہے کہ وہ ناخواندہ ہیں وہ بیچارے صرف انگوٹھا لگانا ہی جانتے ہیں۔ ساہوکار لوگ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جس قدر رقم چاہیں لکھ لیتے ہیں۔ کوآپریشن بذات خود تعلیمی پہلو لیے ہوئے ہے دراصل بڑی عمر کے لوگوں کے لیے ایک اسکول ہے جو انھیں اپنا

حساب کتاب رکھنا سکھاتی ہے اور ان میں ایک نئی زندگی پیدا کرتی ہے۔ کوآپریشن بغیر تعلیم کے کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہر ایک کوآپریٹر کا یہ ہمیشہ فرض اولین رہا ہے کہ وہ تعلیم کی طرف توجہ دلائے۔ دیہاتوں میں کسی انجمن کی کامیابی کے لیے سب سے مشکل یہی ہے کہ حساب کتاب رکھنے کے لیے پڑھے لکھے آدمی دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔ چنانچہ انھیں مشکلات کو رفع کرنے کے لیے سنہ ۱۹۲۱ء میں ضلع انبالہ میں ایک قرضہ کی انجمن نے ایک اڈیلٹ اسکول جاری کیا اور اس میں سب ممبران پر تعلیم حاصل کرنا لازمی شرط قرار دی مقامی سکرٹری بطور ٹیچر کام کرتا رہا آہستہ آہستہ اس تجربہ کو اور جگہ بھی وسعت دی گئی اور اس کے لیے علٰحدہ کوآپریٹو سوسائٹیاں قایم کی گئیں۔ محکمہ تعلیم نے بھی اپنی توجہ اس طرف شروع کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تقریباً ہر ایک ضلع میں یہ اسکول جاری ہو رہے ہیں۔ ایسے جو اسکول کوآپریٹو پارٹمنٹ نے جاری کئے ہیں وہ تقریباً ۶۵ ہیں جن میں سے اکثر بہت کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ جب لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں تو اسکول کو اکثر بند کر دیا جاتا ہے سب سے بڑی مشکل جو محسوس ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ ان اسکولوں کے لیے کوئی کورس نہیں تھا۔ وہی بچوں والی کتابیں تھیں جو بڑی عمر کے آدمی کے لیے کچھ باعث دلچسپی نہ تھیں مگر یہ خوشی ہے کہ شیخ نور الٰہی صاحب انسپکٹر مدارس ملتان نے اب اس مشکل کو رفع کر دیا ہے۔ کتابیں چھپ رہی ہیں اور امید ہے کہ وہ ہر جگہ پسند کی جائینگی۔

لازمی تعلیم کے لیے ہر طرف چرچا ہو رہا ہے اور اس پر زور دیا جا رہا ہے لیکن کوآپریشن نے لوگوں میں بالکل ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ہر ایک بات میں قانون سے مدد لیویں لوگوں میں مدد ذاتی کا وصف پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں اب لازمی تعلیم کی کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔ جہاں آبادی کا کچھ حصہ اس پر رضامند ہے وہاں یہ جاری کر دی جاتی ہیں۔ ہر ایک ممبر جو ان میں شامل ہو اُس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بچوں کو پرائمری تک کے لئے تعلیم دلوائے اگر وہ ایسا نہ کرے تو پنچائت کو اختیار ہے کہ اُس پر پچاس روپیہ تک جرمانہ کر دیوے جو بذریعہ ثالثی وصول ہوتا ہے یہ ایک اخلاقی دباؤ ہے اور یہ بہت مؤثر ثابت ہوا ہے۔ بعض کریڈیٹ سوسائٹیوں نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ ہر ایک ممبر کیلئے لازمی ہے کہ وہ اپنے بچے کو پرائمری تک تعلیم دلوائے ورنہ اُسے انجمن سے خارج کر دیا جائے۔ اس کام کے لیے نہایت وسیع میدان ہے۔ صرف کام کرنے والوں کی ضرورت ہے پنجابی زمیندار ہر ایک نئے خیال کو اختیار کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے۔ صرف اُسے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن پرائمری تعلیم کی وسعت سے ہماری تعلیمی جدوجہد ختم نہیں ہو جانی چاہیئے۔ ہمیں اعلیٰ تعلیم کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیئے لیکن تعلیم اب اس قدر مہنگی ہو رہی ہے کہ معمولی آدمی اُس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ کئی ایک

گریڈیٹ سوسائٹیاں تعلیمی وظائف کے لئے روپیہ دے رہی ہیں۔ کئی ایک نے مڈل اسکول قائم کرنے کے لئے بھی روپئے دئے ہیں لیکن یہ ایک ایسی جد وجہد ہے جو بہت معمولی پیمانہ پر ہو مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہی اس سال منٹگمری میں جو تعلیمی کانفرنس ہوئی اور اس میں ایک بڑی رقم چندہ کی جمع ہوئی۔ بدقسمتی سے وہ رقم مقامی انجمن لینا چاہتی تھی جس پر لوگوں کو اعتبار نہیں تھا۔ یہ کانفرنس جو خاں صاحب ملک زماں مہندی خاں صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ انھیں یہ فکر تھی کہ اس روپیہ کو کیا کیا جاوے۔ اور آخر ہم سب نے مشورہ کر کے ایک کوآپریٹو مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی بنا ڈالی جس کا زیادہ تر مقصد یہ تھا کہ وہ وظائف دے۔ ان کے مفصل قواعد پر جو ایک علیٰحدہ رزدلیوشن کی شکل میں ہی بحث ہوگی اس بات کی ضرورت ہی کہ ہر ایک ضلع میں ایسی انجمن قائم ہوں۔

آیندہ ہمیں کیا کرنا چاہیے

تعلیم یافتہ اصحاب نے اس وقت تک اس تحریک میں بہت کم حصہ لیا ہی بلکہ بعض اصحاب تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہونگے۔ اس بات کی اب ضرورت ہی کہ اس تحریک کو عام طور پر پھیلانے کے لیئے شہروں کالجوں اور اسکولوں میں لکچروں کا سلسلہ شروع کیا جاے کفایت شعاری کی انجمنیں بنائی جاویں جن میں ماہواری مقررہ چندہ دینے کے علاوہ اس بات کی بھی ترغیب لائی جاے کہ اس میں بچوں کی تعلیم اور شادی اور دیگر مقاصد کے لیے بھی روپیہ جمع کیا جاے شہروں میں ایسی فلاح وبہبود کی انجمنیں (Public good) بنائی جاویں جن کے ممبران کا فرض ہو کہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ عام فلاح کے کاموں میں خرچ کریں خواہ وہ سال میں ایک یا دو ہی دن کیوں نہ ہو۔ اسی طرح سے طالب علموں میں ایسی سوسائٹیاں قائم کی جاویں اور تعطیلات کے زمانے میں ہر ایک طالب علم دیہاتوں اور شہروں میں جاکر لوگوں کی تکلیفات معلوم کر کے اس کے رفع کرنے کی کوشش کریں۔ جاپان میں ایسی انجمنیں پہلے سے ہی جاری کرتے ہیں۔ اس سے طالب علمی کے زمانہ سے ہی ان میں قومی کاموں کا خیال پیدا ہو جائے گا۔ ہر ایک کالج اور اسکول کا اس طرح سالانہ ریکارڈ جمع کیا جاے کہ اس کے طالب علموں نے کیا کیا ہی۔

مسلمانوں کی اقتصادیات پر غور کرنے کے لئے کانفرنس کی زیر نگرانی ایک بورڈ قائم کرنا نہایت ضروری ہی۔

لیکچر نمبر ۱۷

انجمن ہائے امداد باہمی

مرتبہ

محمد عبدالمجید خاں صاحب (علیگ)
پولٹری فارم۔ ڈاکخانہ جانی ضلع میرٹھ

ہندوستان کے لئے کوئی تحریک اس قدر سودمند و اہم نہیں ہو جس قدر کفایت شعاری سکھلانے والی انجمن ہائے امداد باہمی کا قایم کرنا یعنی کواپریٹو کریڈٹ سوسائیٹیز کا وجود ہو ان انجمنوں کا عام فائدہ یہ ہو کہ جب چند شخص باہم مل کر ایک مشترک غرض کے لئے قرضہ کے طلبگار ہوتے ہیں تو وہ سرمایہ جو کسی ایک شخص کی انفرادی حیثیت سے حاصل ہونا ناممکن ہوتا ہو قابلِ حصول ہو جاتا ہو اور وہ فائدے جو کسی ایک تنہا کام کرنے والے کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں حاصل ہونے لگتے ہیں اس امداد باہمی کے اصول پر دو قسم کی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں ایک امدادی قرضہ کا انتظام کرنے والی۔ دوسری کواپریٹو طریقہ پر چیزوں کی خرید و فروخت پیداوار اور بیمہ کا انتظام کرنے والی اوّل صورت میں چند شخص مل کر اپنی متفقہ ضمانت پر قرض لیتے ہیں جس سے روپیہ کم شرح پر مل جاتا ہو۔ دوسری صورت میں بھی ویسی ہی ایک متحد جماعت اشیاء کی پیداوار اور خرید و فروخت کا کم خرچ انتظام کرتی ہے۔ اس متحدہ جماعت کا مقصد اولی کفایت شعاری ہوتا ہے ان کی اصل غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ روپیہ کم شرح سود پر ملے اور دیگر ضروریات و سامان ارزاں قیمت پر دستیاب ہو اور جو کچھ وہ پیدا کریں اس کی قیمت بازاری نرخ سے زیادہ حاصل ہو۔ مثلاً اگر غلہ کافی مقدار میں صاف کرکے مہیا کیا جاوے تو بڑے بڑے سوداگر و خریدار براہِ راست اُن جماعتوں سے خریدینگے اور کاشتکاروں کو بہ نسبت اُن قیمتوں کے جو وہ اب پا رہے ہیں کہیں اچھی قیمتیں ملیں گی۔

اگر کوآپریشن کے مقاصد کو تمام ملک میں حقیقی کامیابی حاصل ہوگی تو اس کے فائدے بے حد و بے پایاں ہیں
کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیز کی ابتدا ہندوستان میں بہت تھوڑے عرصے سے ہوئی ہے اس کا پہلا ایکٹ محض
ایک سادہ صورت میں سنہ ۱۹۰۴ء میں پاس ہوا تھا اور موجودہ ایکٹ سنہ ۱۹۱۲ء میں پاس ہوا ہے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۴ء کی گورنمنٹ
آف انڈیا کی رپورٹ ہے کہ جب کہ سوسائٹیز کی تعداد تمام ہندوستان میں صرف بارہ ہزار تھی تو اس سود کے تفاوت کا
حساب لگانے سے کہ جو روپیہ کوآپریٹو سوسائٹیز سے کاشتکاروں نے قرض لیا تھا اگر وہ ساہوکاروں اور
مہاجنوں سے اُن کی مروجہ شرح سود پر قرض لیتے تو اس سے کم از کم بیس لاکھ روپیہ سالانہ سود کا اضافہ
ہوتا یعنی صرف بارہ ہزار سوسائٹیوں کے قائم ہونے کی حالت میں جس کی نسبت یہ تھی کہ پچیس ہزار کی آبادی
میں صرف ایک سوسائٹی حساب میں آتی ہے۔ بیس لاکھ روپیہ سالانہ سود کی بچت ہوتی جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے
کہ ملک کو اور مخصوص اس کے زراعتی طبقہ کو جو ملک کا جزو اعظم ہے کیسا عظیم الشان مالی نفع حاصل ہوا اگر یہ امداد باہمی
کی انجمنیں حسب ضرورت رواج پاجاویں اور بیسود کی رقم کا نفع کوآپریٹو سوسائٹیوں کے نفع کا ایک ضمنی فائدہ ہے جن دفینوں
کو زمین میں دبے دبے زنگ لگ رہا تھا وہ ان امدادی انجمنوں کی بدولت کام آنے اور ملک کو نفع پہونچانے لگے
بہت سے پرانے قرضے ان سے ادا ہوگئے اور مکفول جائدادیں چھوٹ گئیں حتی کہ بعض جگہہ سالم گاؤں کے گاؤں ان
انجمنوں نے کفالت سے چھوڑا دیئے۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے جس کی ۷۰ فی صدی آبادی براہ راست
یا بالواسطہ زراعت پیشہ ہے اور ان امدادی انجمنوں کا وجود سب سے زیادہ صیغہ زراعت کے لئے مفید و کارآمد
ہے۔ پہلے تو یہ انجمنیں مزارعین کو تباہ کن قرضہ سے سبکدوش کرتی ہیں اور اُن کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں
پھر اُن کو کفایت شعاری اور انتظام کا سبق دیتی ہیں۔ جہاں جہاں ان مبارک انجمنوں نے اپنی خیر و برکت پھیلائی
ہے وہاں بنجر زمینیں کاشتکاری اور چراگاہوں کے کام آنے لگیں ناموافق اور بے قاعدہ موسموں اور آفات
ارضی و سماوی کا مقابلہ ہونے لگا یعنی کاشتکار جو قحط کے اثر مویشیوں کے متعدی امراض میں ضائع ہوجانے اور
اور عدم پیداوار کے باعث زمیندار کے لگان یا ساہوکار کے قرضہ میں کھیت و مال قرق ہوجانے وغیرہ وغیرہ ناگہاں
آفات سے برباد ہوجاتے تھے وہ ان انجمنوں کی معاونت سے ایسی یکایک بربادی سے محفوظ ہوگئے۔
ملک معظم دولت انگلشیہ نے ۱۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو ہندوستان کے کوآپریشن کی بابت فرمایا تھا "کہ اگر کوآپریشن
کے طریقہ نے ہندوستان میں خاطر خواہ رواج پالیا اور اس کے پورے پورے نفعے ملک کو حاصل ہونے لگے تو
میں ہندوستان کے زراعتی طبقہ کی ایک شاندار عروج کے مرتبہ پر پہونچنے کی پیشین گوئی کرتا ہوں"۔

صنعتی و حرفتی طبقہ یعنی کاریگروں اور پیشہ وروں کے لئے بھی یہ تحریک یکساں مفید ہے۔ محدود سے محدود
آمدنی کا شخص بھی اس میں شریک ہوکر اپنا کام بڑی کامیابی سے چلاسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ قواعد کی پابندی اور اس کے

منشا کے مطابق سلیقہ و احتیاط سے کام کرے اس اتحاد کا یہ منشا نہیں ہو کہ صرف اپنا ہی فائدہ مدنظر ہو بلکہ اپنی جماعت کے ہر ایک شخص کا فائدہ یکساں پیش نظر ہونا چاہئیے۔ اس واسطے یہ تحریک انسان میں جوہر انسانی و ولولۂ شرافت پیدا کرتی ہے اور سیلف ہلپ (اپنی آپ مدد کرنے) کی ایک ممتاز ترین صورت ہی۔

کوآپریٹو تحریک سے ملک کو صرف مالی نفع ہی نہیں پہونچتا ہے بلکہ دماغی اور اخلاقی منفعت بھی حاصل ہوتی ہے۔ جب ایک جماعت کسی کاروبار کے لئے متفق ہوتی ہے تعلیم حاصل کرنا اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے مثلاً اُن کو کاروباری حساب سیکھنا اور حسب ضرورت قانونی واقفیت حاصل کرنا ناگزیر ہوتا ہے (۲) ان میں خوش انتظامی اور کفایت شعاری کا سلیقہ پیدا ہوتا ہی (۳) ان کو مہذب چال چلن اختیار کرنا پڑتا ہے (۴) جب کسی جماعت کی نیک نامی یا بدنامی متحد ہوتی ہے تو ضرور ہی کہ اُس کا اثر ایک دوسرے کے اخلاق پر پڑے اس لئے بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ بُری عادتیں مثلاً شراب خواری، قماربازی خراب صحبتیں رسومات میں خلاف حیثیت صرف وغیرہ وغیرہ ترک کرنا پڑتا ہے (۵) ماسوا اس کے اعتدال، پابندئ اوقات راست گوئی، حق پسندی، خود داری، باقاعدگی، قناعت وغیرہ اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں (۶) رفاہ عام کے کام عمل میں آتے ہیں مثلاً اسکول کھولنا، وظیفے دینا، بیماروں کو مفت دوا تقسیم کرنا، آب نوشی کے کنوئیں کھودوانا، راستوں کی صفائی کرانا نزاعات اور مقدمات کا انسداد کرنا۔ ثالثی فیصلوں کا رواج دینا، پنچایتی طریقہ جو ہندوستان میں قدیم سے رائج تھا اور اب زمانہ کی رفتار نے اُسے نیست و نابود کردیا ہی اس کی تجدید کرنا۔

ایک غائر نظر رکھنے والے سیاح کا بیان ہی کہ کوآپریٹو سوسائیٹیز نے زراعتی و حرفتی ترقی کے ساتھ مختلف مفید اثر پیدا کئے ہیں۔ زراعتی و صنعتی ایسوسی ایشنیں قائم کیں کاروباری و زراعتی جماعت میں اتحاد و اتفاق کی بنیا دڈالی۔ اس طور سے اس تحریک نے تمام اُن تدابیر سے جو گورنمنٹ رعایا کی شایستگی کے لئے کر رہی ہے تمدن پر گہرا اثر ڈالا ہے اور میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اصلاح تمدن جو ہمارا نصب العین ہی اس کے لئے اس تحریک سے زیادہ کوئی تحریک ممد و مفید نہیں ہوسکتی بلکہ اس کو اگر اصلاح تمدن کی جان کہا جاوے تو بیجا نہ ہوگا۔

لارڈ ولنگڈن سابق گورنر بمبئی نے پونا کوآپریٹو کانفرنس ۱۹۱۷ء میں فرمایا تھا کہ میں کوآپریشن کے اصولوں کو بلحاظ اس کے کہ وہ اخلاقی و تمدنی تربیت اور کفایت شعاری کی تنظیم کر ممد ہیں ہمیشہ بڑی اہمیت دی ہی۔ یہ امر کہ انسانی خلقت عامہ میں اخلاقی و اقتصادی تنزل مطلق العنانی کے ساتھ ترقی کرتا ہوا عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا گورنمنٹ اور پبلک دونوں کو تسلیم ہے لیکن یہ ایک نہایت دلچسپ نظارہ ہوتا ہو کہ یہی خیالات عملی صورت اختیار کرتے ہوئے ایک چھوٹی دیہاتی جماعت میں روزمرہ کی زندگی میں پیش نظر ہوں

میرا عقیدہ ہے کہ یہ جذبہ سال بہ سال ترقی کریگا اور اپنا مفید اثر ہندوستان کی وسیع آبادی میں پھیلائیگا۔ اور لکھو کھا مزدوروں کی امید آسودگی، خودداری اور خوشحالی کا موجب ہوگا۔

گورنمنٹ کی نظر میں بھی اس تحریک کی بڑی وقعت ہی اور وہ اس کی ہر طرح کی معاونت پر آمادہ رہتی ہی چنانچہ ۱۰ جون سنہ ۱۹۱۲ء کا گورنمنٹ آف انڈیا کا رزلیوشن نمبر ۱۲-۲۸۷/۱ یہ ہے کہ یہ امر لوکل گورنمنٹ کے طے کرنے کا ہی کہ وہ غور کرے کہ اس کے صوبہ میں ضلع کے عاملانہ انتظام میں کواپریٹو سوسائٹیاں کیا حصہ لے سکتی ہیں اُن کے ذریعہ سے ضلع کی دیہاتی آبادی کے حقیقی خیالات کا کس طرح سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کس حد تک وہ رضاکاری سے ابتدائی تعلیم کے ترقی دینے حفظان صحت و طبی امداد کا اہتمام کرنے گرانی و قحط کے وقت یا متعدی امراض کے پھیلنے کی حالت میں مددگاری کرنے میں کام میں لائی جاسکتی ہیں۔ اور آیا اُن کی تعلیم دیہاتی حکومت کے نظام کی صحیح تکمیل کر رہی ہے۔

گورنمنٹ نے ان انجمنوں کے لئے خاص مراعات منظور فرمائی ہیں۔

(۱) کواپریٹو سوسائٹیاں انکم ٹیکس سے بری ہیں (۲) ان سوسائیٹیوں کے دستاویزوں پر اسٹامپ کی ضرورت نہیں ہی (۳) فیس رجسٹری معاف ہی (۴) کمپنی ایکٹ کے شرائط ان پر عائد نہیں ہوتی (۵) ان بنکوں کے روپیہ سے بیج مول لیکر جو فصل تیار کی جاوے یا بیل خریدی جاویں یا آلات زراعت مول لئے جاویں یا کچا سامان خرید کر چیزیں تیار کرائی جاویں تو ان میں سے روپیہ وصول کرنے کا سب سے پہلا حق ان سوسائٹیوں کو ہوتا ہی (۶) روپیہ جو ان بنکوں کے حصے خریدنے میں لگایا جاوے وہ عدالت سے قرق نہیں ہوسکتا (۷) ڈاکخانہ میں حساب کھولنے کی اجازت ہی (۸) متوفی ممبران اور بنک کے قرض داروں کی اولاد پر ایسی قانونی پابندیاں ہیں کہ بنک کا روپیہ مارا نہیں جاسکتا (۹) گورنمنٹ کی جانب سے ہر صوبہ میں ایک رجسٹرار اور دو اسسٹنٹ رجسٹرار اور حسب ضرورت انسپکٹروں کا عملہ رہتا ہے جو ان بنکوں کو مدد دیتا ہے اور اُن کے حسابات کی جانچ کرتا رہتا ہے تاکہ لوگوں کو ان بنکوں پر اطمینان و اعتماد رہے (۱۰) گورنمنٹ نے سرکاری افسروں کو عام اجازت دیدی ہی کہ کواپریٹو سوسائٹیوں کو بیدریغ امداد پہونچائیں اور یہ گورنمنٹ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ کلکٹران ضلع کو ہدایت ہے کہ وہ اس تحریک کی کامیابی میں امکانی مدد دیں۔ کلکٹر ضلع ہمیشہ ضلع کے کواپریٹو بنک کا چیرمین ہوتا ہی اگر بہ نظر سیاست دیکھا جائے تو یہ تحریک تمام دیگر تحریکوں سے جو ہندوستان میں ہو رہی ہیں اپنے میں اصلی مادہ اور صحیح جذبہ لوکل سیلف گورنمنٹ کا رکھتی ہی جیسا کہ سر جیمس مسٹن سابق لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے کواپریٹو کانفرنس کے سنہ ۱۹۱۴ء کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر فرمایا تھا کہ امور سیاسی پر بحث کرنے والی جماعت سے اپیل کرتا ہوں کہ کوآپریشن سیلف گورنمنٹ کی ایک حقیقی صورت ہی جو تمہارے قبضہ قدرت میں ہی

اور یہ سمجھدار رائے دہندگان کے پیدا کرنے کے لئے جن کے بغیر ہندوستان میں ذمہ دار گورنمنٹ کا وجود صرف برائے نام ہوگا آسان ترین و بہترین ذریعہ ہے۔ یہاں مدعیان سیاست کے لئے صلائے عام ہے کہ اس رفاہ عام کی تحریک میں جو حکومت خود اختیاری کی عمارت تعمیر کرنے والی ہے شرکت کریں اور اپنے جوہر دکھائیں

صاحب رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹیز پنجاب نے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۵ جنوری ۱۹۱۸ء میں یوں تقریر کی تھی کہ سر ہورس پلنکٹ آئرلینڈ ہوم رول کا سب سے بڑا شخص محض اس لئے تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کی کواپریٹو تحریک نے باشندگان آئرلینڈ پر منکشف کر دیا کہ ان کے بہت سے وہ معاملات جو دوسروں کے ہاتھ سے سرانجام پاتے ہیں وہ اپنے آپ ان کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس موقع پر یہ کہنا ناموزوں نہ ہوگا کہ ان لوگوں کو جو ہندوستان کی کواپریٹو تحریک میں سرگرم کوشش ہیں عملاً ہوم رول کا سب سے بڑا پرجوش معاون و حامی سمجھنا چاہئے بلکہ یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ وہ مثل سر ہورس پلنکٹ کے امور سیاست سے احتراز رکھتے ہیں لیکن ان کا مقصد لوگوں کو اس قابل بنانا ہے کہ اپنے لئے وہ خود آپ سوچیں اور اپنے کام آپ کریں اور صرف اسی وقت جبکہ یہ حالت بہم پہونچ جاوے ہوم رول کا اصل وجود اس کے صحیح معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

جس وقت سکرٹری آف اسٹیٹ ہندوستان کی سیاسی حالت کی جانچ کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لائے تھے اس وقت سر ڈینیل ہملٹن نے یوں ریمارک کیا تھا کہ سکرٹری آف اسٹیٹ نیو انڈیا یعنی نئے ہندوستان کی ایک شققی بنیاد رکھ رہے ہیں جس کے گر جانے کا خطرہ ہے اور چھت کے نیچے سکونت پذیر لوگوں کے کچل جانے کا اندیشہ ہے۔ ہندوستان کی بنیاد دیہاتوں کی ہستی پر قائم ہے رعیت ہندوستان اور ہندوستان رعیت ہے لیکن اس بلند آہنگی کے زمانہ میں بھی رعیت کی خاموش اور دھیمی آواز سیاسی طوفان کے گرداب میں غرق ہو رہی ہے۔ ممبران کواپریٹو کانفرنس کو اب اس انتہائی شرم و حجاب کو بالائے طاق رکھنا چاہئے اب ان کی معرکہ آرائی کا وقت ہے وہی ہندوستان کی قائم مقامی کا حق رکھتے ہیں وہی ملک کی دولت اور زرخیزی کا ذریعہ ہیں وہی باشندگان ہندوستان کے وکیل ہیں وہی نیشنل کانگرس ہیں بقول مسٹر ممبن کواپریٹو تحریک ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی وساطت سے ہندو مسلمان سرکاری و غیر سرکاری افسر، راعی و رعایا، خواندہ و ناخواندہ سب مل کر عام بھلائی کے لئے کام کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں کوئی چیز ایسی ترقی کی سدراہ نہیں ہے جیسے چیزوں کا بیکار و فضول صرف۔

اس تحریک میں خاص بات یہ ہے کہ یہ اس فضول نقصان کو روکتی ہے۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے سب جگہ کچھ نہ کچھ فضول بربادی نظر آتی ہے۔ دماغی قوت بیکار جھگڑوں کے صرف میں آتی ہے جب کہ وہ ملکی فلاح کے کام میں

لائی جاسکتی تھی۔ روپیہ جمع کیا جاتا یا بے فائدہ کاموں میں صرف کیا جاتا ہی۔ جب کہ وہ ملک کے صنعتی و حرفتی
صیغہ کے اشد ضرورت کے کام آسکتا تھا۔ زراعتی دولت بھی رائیگاں جاتی ہے کیونکہ کاشتکاروں کی بچت کی
پونجی زمین میں نہیں لگائی جاتی۔ دیہاتی آبادی کی قدرتی کفایت شعاری کسی کام نہیں آتی کیونکہ جو کچھ پس انداز
ہوتاہے اس کو وہ جمع نہیں کرسکتے اور اس طرح کفایت شعاری کی عادت پیدا نہیں ہوتی مجلسی اور قومی نظام
میں جو پسندیدہ دستور اور عمدہ مراسم ہیں اُن میں بھی ویسی ہی فضول خرچیاں شامل ہیں جو ترقی میں رکاوٹ پیدا
کرتی ہیں اور افلاس کی رہنمائی کرتی ہیں ان سب کا علاج کواپریٹو تحریک ہی جس سے مزارعین کو تباہ کن قرضوں
سے نجات مل سکتی ہی اور وہ اپنی محنت کے نتیجوں سے متمتع ہونے کے قابل بن سکتے ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں
کی دولت بھی بیکار پڑے رہنے کے بجائے صنعتی کاموں میں لگائی جاسکتی ہے اس طرح قومی کفایت شعاری
کی بدولت ملک کی زائد دولت اور ملک کی تجارت وصنعت سے بچا ہوا روپیہ ہندوستان کی اشد مالی ضرورتوں
کے پورا کرنے میں کام آسکتا ہے۔

کہا جاتاہے کہ ہندوستان سودخواری کا گھر ہے کسانوں اور کاریگروں کو اپنا کام چلانے کے لئے عموماً
قرضہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بہت زیادہ سود پر قرض لیتے ہیں جس سے ہمیشہ قرض میں اتنے ڈوبے رہتے
ہیں کہ اس سے ابھرنا ناممکن ہوتاہے دوسرے لوگوں کو ٹھیک بیوپار کی عادت نہیں چند بڑے شہروں کے
سوا دوسری جگہوں میں بنکوں کے ذریعہ سے لین دین نہیں کیا جاتا۔ جاہل کاشتکار اور کاریگروں کو خود غرض
وچالاک بنئے مہاجنوں سے واسطہ رہتا ہی جو اُن کو ہر وقت مالی مشکلات میں مبتلا رکھتے ہیں ان کی شرح سود
چوبیس سے پچھتّر روپیہ فی صدسالانہ تک ہی جو کاشتکار یا کاریگر جس قدر غریب ہوتاہے اس کو اُسی قدر زیادہ
شرح سود پر قرض ملتاہے جس کی بابتہ سرڈینیل ہملٹن نے بنگال کانفرنس کے موقعہ پر ۱۹۱۸ء میں گورنمنٹ بنگال
سے خواستگاری کی تھی کہ بنگال میں کواپریٹو سوسائٹیوں کا جال پھیلا دیا جاوے کیوں کہ صرف یہی ایک ایسی
تحریک ہی جو رعایا کو مہاجن کے پنجہ سے چھڑا سکتی ہے۔ سودخواری کا جو قانون پاس کیا گیا ہی وہ اس خرابی
کے دفعیہ کا جو نظام سیاسی میں سرایت کئے ہوئے ہی مجرب علاج نہیں ہے ہندوستان کو ایسے قانون
کی ضرورت نہیں تھی جو ہنس کے پر کے قلم کو دودھ وپانی میں ڈبو کر لکھا جاوے یہاں تو احتیاج اس امر کی تھی کہ سفاک
آہنی قلم مہاجنوں کے خون سے تر کیا جاتا۔

اس لئے ہندوستان سے زیادہ جو ایک زراعتی ملک ہی اس تحریک کارواج دینا کہاں مفید اور ضروری
ہوسکتاہے جرمنی کی ترقی کا بڑا راز انھیں سوسائٹیوں کا عام رواج اور صحیح نظام تھا۔ یہ سوسائٹیاں
تمام ممالک یورپ و امریکہ وجاپان وغیرہ میں بڑی کامیابی سے کام کررہی ہیں۔ پھر اس کی کوئی

وجہ نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان میں جہاں اُن کی کامیابی کے بہترین موقعے موجود ہیں وہ کامیاب نہ ہوں۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کی اولاد جو تعلیم پا کر نوکری کے لئے پریشاں پھرتی ہے اگر اس طرف متوجہ ہو تو اپنا اور ملک دونوں کا فائدہ کر سکتی ہے اگر تعلیم یافتہ جماعتیں جو پولیٹیکل اکانومی کا مطالعہ کئے ہوں کام خوش سلیقگی اور دلی توجہ سے کریں اور قومی کفایت شعاری کا نظام قائم کر کے آپس کے سچے میل اور حقیقی کوشش سے کاروبار شروع کریں، ملک کا روپیہ مختلف صنعتوں، ریلوں، نہروں مشینوں، کرگھوں اور مستری خانہ کے اوزاروں وغیرہ میں لگایا جاوے تو ہندوستان بھی دوسرے تجارتی ملکوں کے ہم پلہ بن سکتا ہے اور آج جو ہم کو اپنی بے ہنری کا رونا ہو کہ دوسری ولایتوں کی دست نگری میں پامال ہو رہے ہیں وہ باقی نہ رہے۔ ہماری موجودہ صنعتی و حرفتی حالت کا مولانا حالی نے یہ صحیح خاکہ کھینچا ہے ؎

اگر اک پہننے کی ٹوپی بنائیں	تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں	تو مشرق سے مغرب کو لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ	میکنکس کے رو میں تاراج ہیں وہ
نہ پاس اُن کے چادر نہ بستر ہے گھر کا	نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا	صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں قلم دفتروں میں	اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں
جو مغرب سے آئے نہ مال تجارت	تو مر جائیں بھوکے یہاں اہل حرفت
ہو تجار پر بند راہِ معیشت	دکانوں میں ڈھونڈے نہ پائے بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیوپاریاں سب	طفیلی ہیں سیٹھ اور تجاریاں سب

جناب والا! میں نے اپنی تحریر میں بلحاظ گنجایش وقت یہ دکھلا دیا کہ یہ تحریک اقتصادی اخلاقی، تعلیمی، تمدنی، سیاسی، ہر حیثیت سے کس قدر مفید تحریک ہو لیکن اس کا صحیح استعمال یا اس سے پورا پورا نفع حاصل ہونا مسلمانوں کے لئے جب ہی ممکن ہو کہ ملک کی تعلیم یافتہ جماعت یا کوئی ایسی بڑی ایسوسی ایشن جیسی کہ آپ کی کانفرنس ہے اس کی حامی بنے۔ دوسری ولایتوں کے حالات اگر آپ صاحبان پڑھینگے یا پڑھے ہوں گے تو معلوم کر سکیں گے کہ یہ تحریک دیگر ممالک میں کیسے کیسے معجز نما کام کر رہی ہے۔ مجھے علی گڑھ میں اس پانچ چار روز کے قیام میں اہالین کانفرنس سے جو گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس تحریک کو مسلمانوں میں رواج

دینے میں جو کچھ امداد اُن کے امکان میں ہو وہ کریں - اور اس مشورہ کے طلب گار ہیں کہ اس کی ابتدا کس طور سے کریں میری رائے میں ابتدا اس طور سے کرنی چاہئے کہ کانفرنس کے ماتحت ایک بورڈ بنایا جاوے اور اس میں ایسے لوگ رکھے جاویں جو اس صیغہ سے واقفیت رکھتے ہوں اور اس تحریک سے ان کو گہری دلچسپی ہو یا جو خواہش سے اس میں شریک ہونا اور اپنا وقت دینا چاہتے ہوں وہ بورڈ ایک اسکیم مرتب کرے اور اس کے مطابق عمل شروع کیا جاوے -



لیکچر نمبر ۱۸

اصلاحِ تمدّن

سید نثار حسین صاحب پنشنر ڈپٹی مجسٹریٹ۔ علی گڑھ

ہم کہاں ہیں؟

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ایک جہاز پر سوار ہیں جس کا پیندا خطرناک رخنوں سے چھلنی۔ کوئلہ ذخیرہ اور پانی کا حوض خالی۔ کھانے کی چیزوں کا خاتمہ اور ناخدا خواب میں ہے ہم ہیں کہ تاش بلیرڈ اور طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف ہیں۔ میزوں پر خوان نعمت چار اور فواکہات چنے ہیں۔ ایک طرف سگار اور سگریٹ کے بکس خالی پڑے ہیں دوسری طرف سگرٹ کے کش لگ رہے ہیں۔ پانوں کی ڈھولیوں سے در و دیوار پر بے تمیزی کی گلکاری ہو رہی ہے کہیں سنگار میز پر چار ابرو کا صفایا۔ گلے میں نکٹائی اور کالر پھندا اور کہیں حضرات پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہے ہیں کہیں یاوہ گوئی اور رنج بحثیاں ہو رہی ہیں طوفانی ہوا کے تھپیڑے ہیں کہ جہاز کو تباہی میں لیئے جا رہے ان بے فکروں میں چند بوڑھے جو بے قرار ہو کر دوڑتے پھرتے ہیں اور اپنی پگڑیوں اور عماموں سے رخنے بند کر رہے ہیں خدایا اس جہاز کا کیا حشر ہونے کو ہے؟ کبھی ساحل مراد دیکھنا نصیب ہوگا؟ آخر اس تباہی کی علت۔ یہ سب خرابی اور آہ یہ سب تمدنی اور معاشرتی سو رنظمی کا انجام کیا ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انسان مدنی الخصال ہے اور خلاق عالم نے اس کی سرشت میں ایک ایسا مادہ رکھا ہے جو اس کو ہر وقت ترقی پر اُبھارتا رہتا ہے اُسی نے جذبۂ تمدّن کی بنیاد ڈالی۔ تمدن بغیر ترقی ایک بے معنی لفظ تھا۔ تمدن کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی بڑھتی گئیں مختلف قوموں نے مختلف راہیں اختیار کریں۔ کوئی

راہِ مستقیم پر چلا اور منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ کوئی ادھر اُدھر ہی بھٹکتا رہا۔ بتلائیے اس وقت تمدن کے مختلف مدارج طے کرکے ہمارا ملک کہاں پہنچ گیا ہے۔ آیا یہ سیدھے راستہ پر جارہا ہے یا کہیں گم گشتہ راہ ہے۔ ہمارا موجودہ تمدن زندگی کے مقاصد کے مطابق ہے یا متضاد اس بحث کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے لیکن ہم ایک نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ہم اجمالاً ان اثرات کا ذکر کریں جو موجودہ طرزِ معاشرت کی وجہ سے ہماری معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور روحانی حالت پر موثر ہیں۔ اس دورِ انقلاب کی ایک خصوصیت عجیب ہے۔ چاروں طرف آزادی آزادی کا شور ہے مگر ہمارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہماری عزت وقار، خودداری، شان وشوکت، اولوالعزمی اور علوہمتی نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا اتحاد و یکجہتی علم و تعلیم کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری موجودہ معاشرت نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ پانی سر سے گذرنے والا ہے۔ کیا اب بھی یہ ملک خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوگا اور دنیا ومافیہا سے بےخبر رہ کر کروٹیں بدلتا رہیگا۔ جہالت اسراف اور اندھی تقلید ستم ڈھارہی ہیں کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا سب اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ جس شعبہ کو دیکھئے۔ ہماری ہستی کو فنا کردینے پر تلا ہوا ہے۔ کتنے گھر ہیں جو شادیوں کی بیجا رسوم سے ماتم کدے بن گئے ہیں۔ کتنے گھر ہیں جنھیں نفسانی خواہشوں اور چٹورپن نے مفلس کردیا ہے اور جو ذوقِ نمائش لباس وملبوس کے بھڑکیلے پن اور گوٹہ کناری کی نذر ہوچکے ہیں اور تو اور تعلیم جو ہماری لئے شمعِ ہدایت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے جو ہماری کشتی حیات کی ناخدا کہی جاسکتی ہے۔ ہمیں کہاں لئے جارہی ہے کیا تعلیم اسی کا نام ہے کہ آج ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہماری آنکھیں ہیں مگر دیدۂ نرگس کی طرح بے نور۔ ہمارے کان ہیں مگر گنگ۔ زبان ہے مگر لال۔ دماغ ہے مگر بےحس۔ ہمارے دل ہیں مگر مردہ وپژمردہ۔ ہم دوسروں کی زبان سے بولتے ہیں۔ دوسروں کے کانوں سے سنتے ہیں اور ہماری ایک ایک حرکت تابع فرمان ہے۔ ہمارا تمام جسم ایک بیجان مشین ہے جس کی کلیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں جدھر چاہیں گھما دیا گھوم گئے۔ افسوس ؎

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے

ہمیں کچھ خبر نہیں کہ زندہ قومیں کس سرگرمی اور جانفشانی سے اپنی مدد آپ کرتی ہیں۔ انھیں دنیا میں حکومت کرنے کے گُر کس طرح یاد ہیں چلیے بازاروں میں چلیے دیکھئے غیر ملکوں کا مٹی کا کھلونا، ربڑ کی ایک گڑیا۔ شیشے پیتل تانبے لوہے اور مختلف ادنیٰ دھاتوں کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کس طرح ہماری جیبوں سے سونا کھینچ رہا ہے اور ملک کا سرمایہ کس طرح روز بروز خالی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک جسم پر لاکھوں جونکیں لگی ہوئی ہیں جو دم بدم خون چوس رہی ہیں۔ غیر ممالک کی ایک سوئی نے اس ملک کی جڑیں کھود ڈالیں ہیں غیر ملک

کی نمایشی وضع قطع نے ہماری صورتیں مسخ کر دی ہیں ہم اپنی روش بھول گئے نقالی نے ہماری ہر حرکت کو دوسروں
کی نظروں میں مضحکہ بنا دیا ہے اور ہم ہیں کہ بے حس ہیں اور ہمیں خبر نہیں کہ ہمارا سرمایہ کہاں جا رہا ہے۔ پان تماکو
جدا گل کھلا رہا ہے۔ کوکین الگ گلا گھونٹ رہی ہے۔ ناچ رنگ تھیٹر۔ بائیسکوپ، فیشن اور اسراف بیجا اخلاق
کا خون کر چکے۔ سگار، سگریٹ نے اندر ہی اندر گھر پھونک دیا ہے ذرا غور تو کیجئے ہم کس قدر بے پروائی سے
اپنا سرمایہ لٹا رہے ہیں مان لیا جائے کہ بتیس ۳۲ کروڑ آبادی میں صرف آٹھ کروڑ متنفس سگار سگریٹ نوشی
کرتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ ایک سگریٹ کے پینے میں دو دیا سلائیاں اوسطاً خرچ ہوتی ہیں تو سولہ کروڑ دیا سلائیاں
یا سو لاکھ دیا سلائیوں کے بکسوں کی قیمت ہوتی ہے کہئے پچیس ہزار روپیہ اب اگر سگار اور سگریٹ کی قیمت کا بھی
حساب لگایا جائے جو روزانہ صرف میں آتے ہیں تو شاید کروڑوں پر نوبت پہونچے میں نے اس وقت اقتصادی پہلو
سے اس کمبخت زہریلی چیز کا ذکر کیا ہے میں اس وقت تیار نہیں ہوں کہ اس کی اپنی مضرتوں پر بھی بحث کروں
جو انسانی زندگی کے تباہ کن اسباب میں ایک نمایاں درجہ رکھتے ہیں؟۔ اسی طرح ہزاروں چھوٹی بڑی چیزیں ہیں
جن سے بازار پٹے پڑے ہیں۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کے اس بیرونی مال کو لے لیجئے جو جہازوں پر چڑھ کر آیا اور
ہندوستان پر دھاوا بول دیا۔ چمڑا ایک کروڑ آٹھ لاکھ بارہ ہزار روپیہ کھینچ لے گیا۔ موٹروں نے
بارہ کروڑ چونتیس لاکھ تینتیس ہزار روپیہ وصول کئے۔ خوردنی اشیاء نے تین کروڑ پچاس لاکھ چھیانوے
ہزار حاصل کیا۔ فرنیچر نے چون لاکھ چون ہزار کا ٹکس لگایا۔ کانچ کے برتن تین کروڑ سینتیس لاکھ باسٹھ
ہزار لے کر ہٹے آلات آہنی نے بچپن لاکھ بیس ہزار کا خون کیا شکر (Sugar candy) نے ایک کروڑ
ایک لاکھ بچانوے ہزار سمیٹے مختلف شرابوں پر تین کروڑ چوبیس لاکھ گیارہ ہزار خرچ ہوا۔ تماکو کی نذر
دو کروڑ بچانوے لاکھ اکیانوے ہزار روپیہ ہوئے اور بیرونی پارچہ جات ساٹھ کروڑ روپیہ دیکر خریدے گئے۔

یوں کہئے کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں بیرونی اشیاء نے اٹھاسی کروڑ باسٹھ لاکھ چوہتر ہزار پانسو روپیہ ہندوستان
کی جیب سے کھینچ لیا کاش یہ کل روپیہ اسی ملک میں رہتا اور اسے کھو کر ہم اپنی بربادی کے اسباب مہیا
نہ کرتے۔ کیا یہ بدنصیب ملک بغیر بیرونی اشیاء کے زندہ نہیں رہ سکتا؟ ایک طرف یہ حالت اور دوسری طرف
اس کی ناقابلیت اور جہالت خود اپنی بربادی کے اسباب مہیا کر کے دھن دولت خاک میں ملا رہی ہے ایک طرف
تو ماحول میں نور علم کی شعاعیں پڑ رہی ہیں اور دوسری جانب بے مغز سروں میں زریں لوپیں کا سودا سمایا ہوا
ہے اور ٹاٹ بافی جوتوں پر دل لوٹا جاتا ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

اسی طرح اور فضولیات ہیں جو ملک کی بیخ کنی پر آمادہ۔ حضرات انقلاب کی ہوائیں چل رہی ہیں ترقیوں کا

بازار گرم ہے اور میدان عمل پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو زمانہ کی رفتار پہچانیں۔ زندہ قوموں کے دوش بدوش چلنے کی فکر کریں دورِ زماں کا ساتھ دیں اور اپنا موازنہ اُن ہستیوں سے کریں جنھوں نے آج گوشہ گوشہ عالم کو اپنا بنالیا ہے۔ چپہ چپہ زمین جن کی حلقہ بگوش ہے ہوا جن کی تابع فرمان ہے پانی پر جن کا سکہ جاری ہے۔ بجلی جن کی ایک ادنیٰ کنیز ہے اور سائنس جن کے در کا ایک حقیر پاسبان۔ یہ کیوں اس واسطے کہ قانون روزگار صاف بتا رہا ہے کہ علم کو تاج سر بناؤ۔ اپنی مدد آپ کرو اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو پھر دنیا پر حکومت کرو۔ پروردگار عالم خود فرماتا ہے کہ تم اپنی حالت آپ بدلو تو ہم تمھاری حالت بدلیں ورنہ قعر ذلت ہے اور تم۔

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اب بتائیے ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے کیا تعلیم حاصل کی ہے اور ہماری تعلیم کے ذرائع کیا ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی خواہشوں پر اپنی تعلیم کو قربان کر رہے ہیں ایسی تعلیم کیا سکھاتی ہے۔ اسراف۔ فضول خرچی۔ کاہلی۔ سستی اور غلامی کی تمنا۔ ورنہ اگر ہم حقیقی تعلیم حاصل کرتے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہوتا کہ ہم اپنی زندگی کو شاندار آزاد اور اعلیٰ بنائیں تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ ہمیں تعلیم بتا سکتی ہے کہ ہم کس طرح اپنے دخل و خرچ پر مدبرانہ نظر رکھیں تاکہ دوسروں کے دست نگر نہ رہیں۔ کس طرح اپنی تھیلیوں کا منہ شاطر حریفوں کی دست و برد سے بچا کر بند رکھیں اور ضرورت کے وقت کام میں لائیں۔ ہمارے ملک کی اقتصادی حالت کیا ہونی چاہیئے۔ ضروریات زندگی کس طرح اور کہاں سے حاصل کی جائیں۔ ملک کی فلاح و شادابی کے اسباب کیا ہیں اور ہمارے ملک کا سرمایہ کس طرح روز افزوں ہو سکتا ہے۔ تجارت صنعت۔ حرفت اور زراعت کی نشو و نما ہمیں کہاں پہونچا دینگے اور غلامی کی پستیوں سے نکالنے والی کیا چیز ہے۔ اپنے قومی اور ملکی وقار اور روایات شان و نمود کس طرح برقرار رکھیں اور غیر ملکوں کی دولت کس طرح خود ہمارے قدموں میں لوٹتی پھرے۔ ہمارا ملک کس طرح سرسبز و شاداب ہو سکتا اور ہم غریبوں یتیموں اور ناداروں کی امداد کس طرح کر سکتے ہیں۔ بزرسی، کفایت شعاری کا کیا ماحصل ہے۔ ایک بتی یا دیاسلائی بچا کر ایک طالب علم کی امداد کا کیا فائدہ، اندھی تقلید کی جکڑ بند سے ملک کس طرح نجات پا سکتا ہے اور دولت و سرمایہ کا صحیح و جائز مصرف کیا ہے ہنسی آتی ہے جب موجودہ تعلیم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔ غلامی کی آرزو بڑھتی جاتی ہے۔ ملک کی حالت سے واقفیت سے کیا معنی۔ حس ہی نہیں کہ ملک پر کیا گزر رہی ہے وہ تو فیشن ایبل بننے کی دھن میں از خود رفتہ ہیں غیر ملکی اشیاء کے استعمال میں اس درجہ محو ہیں کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ کاش وہ اس پر بھی غور کریں کہ یہ گراں بہا ضروریات زندگی خریدنے سے ملک کا سرمایہ کہاں جائیگا اور جب ملک میں سرمایہ نہیں رہیگا تو تعلیم پر اس کا کیا اثر پڑیگا اور کیونکر قیمتی تعلیم جو آئے دن گراں بہا ہوتی جاتی ہے خریدی جائیگی اور جب تعلیم کے خریدنے کی ملک میں سکت ہی باقی نہ رہیگی

قومی جیبیں خالی ہو جائیں گی تو انجام کار کیا ہوگا۔ تباہی اور بربادی کج ہے جسم میں خون کہاں ہے۔ آخر یہ کس قوت کے کرشمے ہیں ملک کی فلاح و بہبودی پر کس نے پانی پھیر دیا ہے ظاہر ہے کہ فضول خرچی نے، جہالت نے ملک کی دولت کے پرخچے اڑا دیے ہیں جو کچھ ہمارے ہاتھ میں تھا ہم کھو چکے اور جو کچھ باقی ہے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اس کے بچنے کی بھی کوئی امید نہیں۔ سب سے زیادہ قابل رحم اور نکبت زدہ مسلمانوں کی بستی ہے بتائیے آپ کے پاس کیا ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو اسے سود کا گھن کھائے جاتا ہے ایسے مسلمان تو بہت ہی کم ہوں گے جو اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہوں ترقی و دولت کا ذکر کیا۔ آئے دن جائدادیں نکل رہی ہیں اور روز بروز افلاس و ناداری ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے نکبت ادبار کا دور دورہ ہے اور اس پر بھی کروٹ نہیں بدلی جاتی صنعت۔ حرفت۔ تجارت اور زراعت ہمارے یہاں کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ جو چیز آزادی کی جان ہے ہم اس سے جان چراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب رہی ایک ملازمت، اس میدان تقابل میں بھی پیچھے ہیں تو بیچارے مسلمان۔ حریف نہایت تیز رفتاری کے ساتھ انھیں روندتے چلے جارہے ہیں اور یہ ہیں کہ عالم بیخبری ہیں ان کی گرد راہ تک بھی پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے

ہیہات نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر یہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

اس پر ستم یہ کہ بے اعتدالیاں۔ سیاہ کاریاں جہالت غفلت اور کاہلی مشقت اور محنت سے گریز۔ اخلاقی جرأت و ہمت کا فقدان، مصالح ملکی سے لاعلمی اور بے پروائی۔ نقص تربیت۔ حلم و بردباری۔ فروتنی۔ بلند حوصلگی، علو ہمتی اولوالعزمی، ایفائے عہد و پیمان سے تنفر اور سب سے زیادہ احکام مذہبی سے بے صبری۔

خدا ہمیں آنکھیں دے تو ذرہ ذرہ سے درس عبرت حاصل کرسکتے ہیں آج ہی کانفرنس کے جلسوں اور نمائش کو دیکھ لیجئے۔ آپ کے سامنے ہر طرح کی تقریریں ہو چکیں۔ جغرافیہ، ورزش، کشیدے، ریاضی، نقاشی، اندھوں کی تعلیم، علم حیوانات، نباتات، طریقہ تعلیم طفلاں، خطاطی، خوشنویسی، ڈرائنگ، صناعی، طبیعات، کیمیا، فلکیات وغیرہ وغیرہ کے نمونے دکھائے جا چکے سمجھائے جا چکے۔ اب آپ نتیجے نکالئے کہ انسان کس طرح اپنے تمدنی، معاشرتی مرحلوں کو طے کرے اور کیوں کر اپنی زندگی کے دوران کو ہوشیاری اور تدبیر سے انجام کو پہنچائے۔ کس طرح قانون قدرت سے جو انسان کے ساتھ وابستہ ہیں پورا پورا مستفید ہو۔ اور کیوں کر نعمائے ربانی کا شکریہ ادا کرے۔ وہی ایک ہوا پانی خاک آتش ہے۔ وہی حیوانات، نباتات، جمادات ہیں وہی دماغ آنکھ، ناک، کان اور دیگر اعضائے بدن ہیں جن سے مل کر ایک جسم کا نظام قائم ہوتا ہے۔ ہر جز ایک خاص کام کے لئے بنایا گیا ہے اگر اس سے وہ کام نہ لیا جائے بلکہ خلاف فطرت استعمال میں آئے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً تباہی اور بربادی۔ لیکن ہر درد سے را علاجے۔ اگر تباہی اور بربادی ہمارے سر پر منڈلا رہی ہے تو آخر اس سے بچنے کے کیا طریقے

ہیں۔ بزرسی، کفایت شعاری اور اصلاح تمدن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ ہم اپنی آمدنی کو جائز محل پر صرف کرکے دیکھیں کہ ہم اپنی جیبوں، اپنی قوتوں پر کتنا اعتماد کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں ذرا اپنی عقلوں سے بھی کام لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہمارے رہنماؤں میں کیا کیا اوصاف ہونے چاہئیں۔ ہم نے جس کو لیڈر بنا لیا اگر وہ آخر کار ریاکار اور فریبی نکلا تو ہم کہیں کے نہ رہینگے۔

حضرات! اس محدود چار دیواری سے نکلئے۔ ملک کے بندرگاہوں پر چلئے اور دیکھئے یہاں کے سونے اور چاندی کی لہریں کدھر کو جا رہی ہیں اور سمندر کی جانب سے تیل، لوہا، تانبا وغیرہ کس طرح اس ملک پر گولہ باری کر رہا ہی سوچئے اور جلد سوچئے اس کی روک تھام کس طرح ہو سکتی ہے۔

دل تو چاہتا ہے کہ کہے جاؤں کوئی سنے یا نہ سنے۔ لیکن کہاں تک۔ اب گفت و شنید کا وقت نہیں رہا خدا کے لئے آنکھیں کھولئے اور عمل شروع کیجئے۔ اصلاح تمدن ہی ایک ذریعہ ہے جو ہمیں معراج ترقی پر پہنچا سکتا ہے اس کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ہمارے نوجوان بھائیوں کو اپنی خداداد قوتوں سے کام لینا چاہیے کیا مشکل ہے کہ گاؤں گاؤں ہماری ایک کمیٹی قائم ہو جائے جس کا نصب العین اور مقصد یہی ہو کہ تمدن کی خرابیوں کو دور کرکے ہماری معاشرت میں ایسی تازہ روح پھونکی جائے کہ ہم پھر زندہ قوموں میں شمار ہونے لگیں اگر ہم نہ جاگے تو زمانہ خود بتائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

چہ مے پرسی زحال دل کہ چوں است
دلم خوں گشت و خوں از دل بروں است

اے خداوند ہماری مدد کر ہم راہ مستقیم پر چل سکیں اور اصلاح تمدن پر ہماری متفقہ توجہ مبذول ہو اور ہم سمجھ جائیں کہ ہمارے بچوں کا نشو و نما کیوں کر ہو سکتا ہے ہمارے جوانان پاکباز و صالح اپنی دماغی ذہنی اور روایتی کرشموں سے دنیا کو محو حیرت کر سکتے ہیں۔ ہمارے سن بزرگ اپنی موجودہ و آیندہ نسلوں کے لئے اپنی تجربوں اپنی رفتار و گفتار و کردار اور اپنے طرز عمل کے نمونوں سے کس طرح رہبری کر سکتے ہیں ہمارے طلبا کی قابلیت اور اساتذہ کا نصب العین ملک اور قوم کے لئے کہاں تک مایۂ ناز بن سکتا ہی پروردگار عالم ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ جب ہم اس جلسہ سے اٹھ کر اپنے گھروں کو جائیں تو اس کانفرنس کی نیک صلاحوں پر عمل کریں اور اپنی قوم کو بتائیں کہ ہم کہاں گئے تھے اور اس کے لئے کیا بیش بہا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ ہم بیداری، بزرسی، کفایت شعاری اور اصلاح تمدن جیسی دولت سے مالا مال ہونے کی کوشش کریں ورنہ ؎

چوں دست نمی دہد وصالت
دست من و دامن خیالت

لیکچر نمبر ۱۹

ابجد کی تعلیم کھیل کے ذریعہ سے

مرتبہ

مولوی نیاز محمد خاں صاحب اردو معلم نارمل اسکول الہ آباد۔

حضرات! خاکسار کے تعلیمی نمونے تین اقسام پر مشتمل ہیں۔

(۱) اردو زبان کے لینگوا فرینکا ہونے کے متعلق دو نقشے۔

(۲) قواعد اردو کے متعلق۔ اقسام کلمہ۔ ترکیب صرفی و ترکیب نحوی Analysis and Parsing کے چند نقشے۔

(۳) اردو حروف تہجی کی بابت دو نقشے جن میں صرف چھ نشانوں سے کھیل کود کے طور پر اردو الف بے کے پڑھانے اور لکھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا نام بازیچہ اطفال تجویز کیا گیا ہے۔ احباب اسے طرز نیازی کہتے ہیں۔ خاکسار کو آج کچھ اس کی بابت عرض کرنا ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ جس طرح بچے پڑھنے کو جبر و تشدد سمجھ کر اس سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ اسی طرح وہ کیا چیزیں ہیں۔ جو بچوں کو بھاتی ہیں اور جن کی طرف اُن کا رجحان اور میلان طبع قدرتی طور پر ہوتا ہے۔

صاحبو! ہم دیکھتے ہیں

(۱) بچے کھیل کود کے بالطبع شائق ہوتے ہیں۔

(۲) اپنے ہم جنس بچوں کے ساتھ خوشی خوشی کھیلتے ہیں۔

(۳) جس کام میں اُن کے حواس دیکھنے - چھونے - چکھنے اور نیز ہاتھ پاؤں سے کام کرنے کا جتنا زیادہ موقع ملتا ہے - اس میں وہ اتنے ہی زیادہ محظوظ ہوتے ہیں اور اُس سے اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے -

پس ہمیں چاہیئے کہ ہم بچوں کے اس قدرتی میلان سے فائدہ اٹھائیں اور کھیل کھیل میں انھیں پڑھائیں جیسے ہوشیار ڈاکٹر کڑوی سے کڑوی دوا جیسے کونین کو مصری میں لپیٹ کر آسانی کے ساتھ بچوں کو کھلا دیتے ہیں - اسی طرح ہوشیار معلم کو چاہیئے کہ علم کی تلخی کو کھیل کود کی مٹھاس سے رفع کر کے انھیں سکھائے تو کھیل کا کھیل اور کام کا کام ہوگا -

"چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار"

طریقہ پہلے مدرس خود ایک تختی لے اور اسی طرح ہر ایک لڑکے کو بھی دے - پھر تھوڑے سے چاول کچھ تیلیاں اور کھریا مٹی خود لے اور اسی طرح ہر ایک لڑکے کو بھی دے - اب بچوں کے ساتھ کھیلنا اور انھیں کھیل کھیل میں پڑھانا شروع کرے - اس طرح کہ:-

(۱) ہاتھ اور انگلیوں سے چاولوں کو باہم ملا کر اُن سے اپنی تختی پر ایک کھڑی لکیر بنا دے - اسی طرح ہر ایک لڑکے سے بھی بنوائے - پھر اُن سے کئی مرتبہ بنوا بگڑوا کر اس کی مشق بھی کرائے -

(۲) پھر کھڑی تیلی سے اس کا مقابلہ کرا کے اس کی شکل کا تصور پختہ کرائے -

(۳) جب تصور پختہ ہو جائے - تب نام بتائے کہ یہ ہے کھڑی لکیر

(۴) پھر کھریا مٹی سے اپنی تختی پر بنائے اور اسی طرح لڑکوں سے بھی بنوائے -

( ) تختہ سیاہ پر خوب جلی لکھ کر دکھائے - اسی طرح لڑکوں سے اُن کی تختی پر لکھوائے - اور مشق کرائے - اس طریقہ سے پڑی ترچھی لکیریں اور باقی نشانات ایک ایک کر کے سکھائے - پھر حروف سکھائے - اس تیار شدہ بے ترتیب حروف کے پہلے گروپ میں ایک ایک حرف سکھائے - علی ہذا تمام گروپوں کے حروف پڑھائے - آخر میں ترتیب وار حروف پڑھا کر یاد کرائے اور ساتھ ہی ساتھ لکھانا بھی رہے - بہتر ہوگا کہ اس طریقہ سے پڑھاتے وقت مدرس کوئی نظم ایک ایک مصرعہ کر کے پڑھتا جائے اور لڑکے اس کو دھراتے جائیں - بعینہ اسی طرح جیسے عورتیں گیت گاتی ہیں - کہ ایک آگے آگے گاتی جاتی ہے - پھر باقی اس کی تقلید کرتی جاتی ہیں - وہ نظم اس قسم کی ہو سکتی ہے -

(نشانات کے لئے)

آؤ لڑکو! مِل کر کھیلیں   چاول کو تختی پہ رکھیں

جب ہم اچھا کھیلیں بھائی ! — تب ابّا سے لیں گے مٹھائی
یہ ہے کیسا پیارا کھیل — آپس میں بڑھتا ہے میل
چاول سے کچھ چیز بناویں — کھیلیں اور تماشا دکھاویں
چاول سے یہ بنی لکیر — نئی طرح کی اپنی کھیر
نہ وہ کھیر جو منہ میں جاوے — (ملاحظہ ہو صاحبو یہ ہے ٹیڑھی کھیر)
ابا جان سے پیسہ دلائیں — (حضرات یہ مال کش بھی ہے)

(ا) کھڑی لکیر
دو ایک بار جگڈیں بنائیں — تب ہم اس کا نام بتائیں
بھائی ہوئی یہ کھڑی لکیر — جیسے ہوئے ایک سیدھا تیر
آؤ لڑکو کھریا اٹھائیں — تختی پر اب اسے بنائیں

(—) پڑی لکیر
کھڑی لکیر کو جب ہم لٹائیں — پڑی لکیر تب نام بتائیں
کھڑی پڑی تو ہوئی لکیر — دیکھو ترچھی بنی لکیر

(/) ترچھی لکیر
ایسی ترچھی بنی لکیر — جیسے ہو اک ترچھا تیر
آؤ لڑکو کھریا اٹھائیں — تختی پر اب اسے بنائیں

حروف کے لئے

ا — کھڑی لکیر جو پہلے بتائی — الف اسے کہتے ہیں بھائی
ب — ترچھی پڑی بنی ہے بے — نقطہ رکھو دھیرے سے
پ — تین نقطوں سے بن گئی پے — یہ نقطے ہیں نیچے کے
ت — دو نقطوں سے ہو گئی تے — یہ نقطے ہیں اوپر کے
ث — تین نقطوں سے بن گئی ثے — یہ بھی نقطے اوپر کے
(ب پ) ت ث — بے اور پے یا تے اور ثے میں فرق بتاؤ — نقطوں کی تعداد گنواؤ
پ ث — پے اور ثے میں فرق بتاؤ — نقطے تلے اوپر کے دکھاؤ
جھوٹ مُٹ کھیلیں سچ مچ ہوئی — سچ مچ کھیلیں برے کوئی

یعنی

(جھوٹ موٹ کھیلتے کھیلتے سچ مچ کھیل ہو جاتا ہے اور یہ سچا کھیل کھیلنے والے نایاب ہیں)

غرض کہ پہلے نشانات کا تصور پختہ کرایا جائے۔ پھر نام بتایا جائے اور کھریا سے تختی پر لکھایا جائے یہی طریقہ حرفوں کے سکھلانے میں مدنظر رہے یعنی پہلے بے ترتیب حروف کے گروپ ایک ایک کرکے پڑھائے جائیں پھر ترتیب وار حروف پڑھا کر یاد کرائے جائیں۔ بعدازاں لڑکوں کی گیلی تختی پر نقش یا کھنچ کرکے اس پر بچوں سے سیاہی پھروائی جائے اور اس طرح سے لکھنے کی مشق کرائی جائے۔

حضرات خاکسار نے آپ صاحبان کا وقت بہت زیادہ لیا اور سمع خراشی کی جس کی معافی چاہتا ہے۔ اور آپ صاحبان کے بغور سننے کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اس طرز میں جو بات قابل اصلاح ہو بندہ اُسے شکریہ کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہے۔ چونکہ وقت بہت تنگ ہوگیا ہے۔ لہذا ملتمس ہے کہ جن صاحبوں کو اس طریقہ کی بابت کچھ دریافت کرنا ہو۔ وہ بذریعہ تحریر نارمل اسکول الہ آباد کے پتہ سے استفسار فرماسکتے ہیں۔ یہ ہے بازیگر کے تماشے کی تھیلی۔ جس میں رنگ برنگ کے چاولوں کی تھیلیاں بھری ہوئی ہیں۔ انھیں سے تمام حروف بنائے اور سکھلائے جاتے ہیں۔



لکچر نمبر ۲۰

لندن کی تعلیمی نمائش کے حالات

مرتبہ

میر کریم بخش صاحب بی، اے، ایس پرسنل اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات پشاور

(اس لکچر کے پڑھے جانے کا وقت نہ مل سکا)

امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق جو تعلیمی نمائش ہوم آفس انڈسٹریل میوزیم اور ویسٹ منسٹر ٹرننگ کالج میں ۲۵ جون لغایت ۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء کو منعقد ہوئی، اس کی علت غائی یہ تھی کہ انگلستان کے ابتدائی مدارس اور ٹرننگ کالجوں کی تعلیمی سرگرمی پر اُن کے روزانہ دستورالعمل اور ان کی صحیح زندگی کا پورا پورا نقشہ آتار جائے۔

ہوم آفس انڈسٹریل میوزیم میں مندرجہ ذیل مناظر کا مظاہرہ ہوا

(۱) لندن اور یارک کے ابتدائی سکولوں کا پورا کام (۲) ابتدائی مدارس کے منتخب کام (۳) لسسٹر شائر اور لنڈن کے پبلک ایلیمنٹری مدارس کا مکمل کام (۴) مانچسٹر اور وارو ک شائر کے مرکزی مدارس کا تمام کام (۵) یارک شائر کے پبلک ایلیمنٹری سکول اور لنڈن کے مرکزی سکول کا مکمل کام (۶) مرکزی مدارس

کا منتخب کام (۷) دیہاتی مدارس کا کام (۸) اسکولوں کے متعلق سفر و سیاحت۔ کیمپ اور سروے کا کام (۹) انگریزی (۱۰) مدنی مضامین (۱۱) امتحانات (۱۲) تجربے اور موجودہ اصلاحات (۱۳) ریاضی (۱۴) کند ذہن اور کمزور لڑکوں کا کام (۱۵) سائنس جس میں مطالعۂ قدرت اور باغبانی شامل ہے۔ (۱۶) مدارس ہوم آفس کا کام (۱۷) خاص خاص مدارس کا کام (۱۸) دستکاری (۱۹) تواریخ (۲۰) جغرافیہ (۲۱) سوئی سلائی کا کام (۲۲) فن

ویسٹ منسٹر ٹریننگ کالج میں حسب ذیل مظاہرے ہوئے

(۱) انگلستان میں تعلیم کا مقامی نظام کیا ہے (۲) سکولوں کے خاکے (۳) ابتدائی مدارس کے استادوں کے لئے ٹریننگ کالجوں کا کام (۴) مدنی مضامین کے متعلق استادوں کے لئے تعلیمی کورس

کانفرنس کے اختتام پر لندن کے سکولوں کے کام کا ایک مظاہرہ لندن ڈے ٹریننگ کالج میں ہوا جس میں عملی طور سے دکھلایا گیا۔ کہ سکولوں میں کون کون سے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور کس طرح۔

بورڈ آف ایجوکیشن نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ اگزبیشن تمام ابتدائی سکولوں کا نمونہ پیش کرے نہ صرف اُن سکولوں کا جو خاص طور سے اچھا کام کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتنے مختلف قسم کے مظاہرے ہوئے کہ ہر ایک مضمون کے متعلق یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہوگیا کہ کام کس طرح ہو رہا ہے۔

اس رپورٹ میں میں نے کوشش کی ہے کہ صرف اُن مظاہروں کا حال بیان کردں جو صوبہ سرحدی کے افسرانِ تعلیم کے لئے باعث دلچسپی ہوسکے۔

(۱) اُن مدارس کا کام جن میں چھوٹے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ملک کے مختلف حصّوں کے تین ایسے سکول انتخاب کئے گئے۔ جو معمولی حالات میں بچوں کے سکول کی کارگزاری کا نمونہ پیش کرسکیں۔ ان سکولوں میں مندرجہ ذیل مضمون پڑھائے جاتے ہیں۔

(۱) پڑھنا (۲) زباندانی (۳) لکھنا (۴) ہندسے (۵) علم ادب (۶) موسیقی (۷) کھیل (۸) مطالعۂ قدرت (۹) دستکاری (۱۰) ڈرائنگ

سات سال سے بڑی عمر کے بچوں کو تواریخ جغرافیہ اور سوئی سلائی کے کام کے ابتدائی اسباق بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

ایک نہایت دلچسپ ذخیرہ اُن اوزاروں کا بھی اکٹھا کیا گیا ہے جو اُستادوں اور بڑی عمر کے شاگردوں نے بچوں کے لئے پڑھائی اور ہندسوں کے متعلقہ کام کے لئے تیار کئے تھے۔ ان مضامین میں بجائے اجماعی تعلیم

سے انفرادی کام نے جگہ لے لی ہی۔ اِن لڑکوں کو اجازت ہوتی ہی کہ ان مضامین کا کام وہ اپنی اپنی جگہ پر کریں اور گو ان کو کچھ ضروری امداد دی جاتی ہی۔ تاہم خود مختارانہ طریقہ سے کام کرنے کی جرائت دلائی جاتی ہی۔

پڑھنا سکھانے کے اوزار زیادہ تر بحفظ مراتب الفاظ اور فقروں کے کارڈ ہیں جو تصاویر کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یعنی ایک مناسب لفظ یا فقرہ کسی چیز یا کسی تصویر کے ساتھ لگایا جاتا ہی۔ ہندسے کے کام کے لئے مختلف چارٹ تھے۔ جن کے ساتھ دانے سکے وغیرہ اشیاء لگائی ہوئی تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہندسے کی تعلیم کس طرح بتدریج پڑھائی جاتی ہی۔ جس میں جمع اور تفریق کے قاعدے بھی شامل تھے۔ ایک فرم جو جمع کے عمل کی خود تصحیح کرتا تھا۔ نہایت دلچسپ تھا۔ ان اوزار میں روپیہ کی مقدار اور ناپ تول کے اندازے بتائے جاتے تھے۔ اس عمل میں کوئی نئی بات نہیں۔ وہی طریقہ تعلیم ہی۔ یعنی معلوم سے نا معلوم کی طرف جانا۔

لکھائی کے نمونے اس قسم کے تھے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ چھپائی یا ہاتھ کی لکھائی کس طرح روان نویسی کے درجے پر پہنچتی ہی۔

چھوٹے بچوں نے زباندانی اور حساب کے متعلق جو کام کیا تھا۔ اُس کے نمونے بھی دکھائے گئے۔ اور بچوں کے بنائے ہوئے موسمی نقشے اور قدرتی مناظر کے نقشے بھی دکھائے گئے۔

دستکاری کا کام جو چھوٹے بچوں نے کیا تھا۔ بہت اچھا اور مختلف قسم کا تھا۔ ڈرائنگ جو یاد سے تخیل کی مدد سے یا مشاہدے کے ذریعے سے کیا جاتا ہی۔ اُس کے نمونے۔ کینوس کا کام تصویریں اور نمونے کاٹنے کا کام مختلف رنگوں میں دکھایا گیا۔ مٹی سے بنائی ہوئی گاڑیاں اور میگا فون نہایت دلچسپ تھے۔ اوزار اور فرنیچر جو پانچ سال سے چھوٹی عمر کے بچوں کے سکولوں میں استعمال ہوتے ہیں دکھائے گئے۔ ان اسکولوں میں لڑکوں کو اچھی عادات کی تعلیم دی جاتی ہی۔ ان مدارس کے کھلونے نہایت سادہ ہوتے ہیں مثلاً گیندیں اور پرانی ریلیں۔

دیہاتی مدارس

ان اسکولوں کے متعلق ٹائم ٹیبل۔ کام کا انتظام اور ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے نمونے دکھائے گئے۔ اس طریقہ تعلیم سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ لڑکوں کو اپنی ارد گرد کی چیزوں سے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہی۔ عملی کام جغرافیہ اور مطالعہ قدرت کے متعلق ہوتا ہی۔ گاؤں کی روایات اور یادگاری مقامات سے مقامی تواریخ اور عام تواریخ کے سبق دیئے جاتے ہیں۔ ایک اسکول نے اپنے گرد و نواح کے متعلق ایک کتاب اور اسکول نے اپنے گاؤں کی تواریخ کے متعلق ایک کتاب تیار کی تھی۔ کتاب ہاتھوں کی لکھی ہوئی تھی اور لڑکوں نے اُس میں تصویریں لگائی تھیں۔ مطالعہ قدرت

سائنس - دستکاری اور باغبانی قریباً ایک ہی قسم کے مضامین ہیں - قدرت کا مطالعہ لڑکوں کو اپنی باغبانی کی طرف مائل کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت کے اسباق کے نتائج اثر پذیر ہوتے ہیں - دستکاری کے کام میں دیہاتی رنگ غالب رہتا ہے - لڑکے مرغی خانے، مکھیوں کے چھتے اور باغبانی کے ہتھیار وغیرہ بناتے ہیں - رنگ سازی اور وارنش کرنا اُن کو سکھایا جاتا ہے - مٹی سے جانوروں کی شکلیں بناتے ہیں اور اپنے باغوں کے پھولوں کی تصویریں تیار کرتے ہیں - دستکاری کے نہایت اعلیٰ اعلیٰ نمونے دکھائے گئے - بہت اسکولوں میں زندہ جانوروں کے ذخیرے سے باغبانی کے عملی کام میں مدد ملتی ہے - بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ مرغیاں وغیرہ کس طرح رکھی جاتی ہیں اور چونکہ ان چیزوں کے رکھنے میں روپیہ خرچ ہوتا ہے اس لئے اُن لڑکوں کو حساب رکھنے اور آمد و خرچ کا اندازہ لکھنے میں مصروف کیا جاتا ہے - جس سے اُن کی حساب دانی میں امداد ہوتی ہے - ان سکولوں کی پڑھائی بھی زیادہ تر دیہاتی زندگی کے متعلق ہوتی ہے -

سیاحت کیمپ و سروے

اس کے متعلق مظاہروں کا پہلا حصہ ظاہر کرتا تھا کہ ایک دن یا اس سے کم یا ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ کے لئے نزدیک کے دلچسپ مقامات یا دُور دُور کے مقامات کا سفر تعلیمی اغراض کے لئے کیا جاتا ہے - اس سفر و سیاحت کے متعلق پہلے پورا انتظام کیا جاتا ہے - سفر پر جانے سے پہلے لڑکوں کو اُسی سفر کے متعلق بہت سے اسباق دیئے جاتے ہیں اور اس اصول کی تعلیم دی جاتی ہے - کہ معلومات بڑھا کر آنے کے لئے گھر سے کچھ معلومات لے کر جانا چاہیئے - سفر سے واپس آکر لڑکوں کو کہا جاتا ہے - کہ انھوں نے جو کچھ سفر میں دیکھا ہے - اُس کے متعلق مضامین لکھیں - اس ایگزبیشن میں کئی ایسے نوٹ دکھائے گئے - جو لڑکوں نے دورانِ سفر میں تیار کئے تھے - نیز وہ مضمون جو انھوں نے واپس آکر اس کے متعلق لکھے -

اِن مظاہر کا دوسرا حصہ کیمپ کے متعلق جس میں کیمپ کا انتظام، پروگرام، ٹائم ٹیبل - فوٹوگراف اور کیمپ کے متعلق دوسرے معلومات دکھائے گئے - کیمپ کی زندگی میں استاد اور لڑکے کچھ دنوں کے لئے اکٹھے رہتے ہیں اور زیادہ بے تکلفی سے آپس میں ملتے جلتے ہیں - اس طرح لڑکوں کو ہر طرح جسمانی ورزش کا موقع بھی مل جاتا ہے -

ان مظاہر کے تیسرے حصے میں مقامی سروے تھی - گرد و نواح کی سروے کرکے اس کے نقشے بنائے جاتے ہیں جغرافیہ اور مناظرِ قدرت کی تعلیم دی جاتی ہے اور تواریخی حالات کا ریکارڈ بنایا جاتا ہے یہ کام لڑکوں کے ساتھ مل کر کیا جاتا ہے - چنانچہ انفرادی اور مشترکہ کام کے نمونے بھی دکھائے گئے -

انگریزی

اس مضمون کو ابتدائی سکولوں میں بہت اہمیت دی جاتی ہے - ایگزبیشن میں دکھایا گیا ہے کہ

سات سال، چودہ سال، گیارہ سال اور پندرہ سال کے لڑکے زباندانی اور علم ادب کے متعلق کیا کام کرتے ہیں۔ اس میں لڑکوں کے لکھے ہوئے مضمون، خطوط نویسی۔ نظم اور سکول میگزینوں کے نمونے دکھائے گئے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عمدہ علم ادب کی خواہش پیدا کرنے کے لئے اسکولوں میں کیا کچھ کیا جاتا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ لڑکوں کو کتاب کا استعمال اور پبلک لائبریریوں سے کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ کس طرح سکھایا جاتا ہے۔ عام رواج یہ ہے کہ سکول کی کتابوں کے علاوہ کتابوں کی چھوٹی چھوٹی لائبریریاں بھی رکھی جاتی ہیں۔ بعض قصبوں میں لڑکے مقامی پبلک لائبریری کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ خواہ لائبریری کے ممبر ہو کر یا بصورت دیگر اُن کتابوں کے استعمال سے جو سکول کو لائبریری کی طرف سے وقتاً فوقتاً کچھ عرصہ کے لئے دی جاتی ہیں۔ چپ چاپ پڑھنے کی چھوٹی عمر کے لڑکوں کو بھی جو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ ترغیب دی جاتی ہے۔ اُن کو سکھایا جاتا ہے۔ کہ موزوں اور دلچسپ کتابیں وہ خود بخود پڑھا کریں۔ اور اُن کتابوں کے متعلق زبانی بیان کریں۔ دوسرے مظاہرے کے ذریعے یہ بتایا گیا۔ کہ صحیح اور صاف بولنا کس طرح سکھایا جاتا ہے بعض اسکولوں میں لیں دین کے طریقے پر ڈرامے، بحث مباحثہ اور لیکچر لڑکوں سے کرائے جاتے ہیں۔ جب لڑکے پہلے سکول میں داخل ہوتے ہیں۔ تو ان کو جرأت دلائی جاتی ہے کہ جس مضمون کے ساتھ اُن کو دلچسپی ہو۔ اُس کے متعلق کھلے طور سے باتیں کریں۔ سات سال کی عمر پر بچے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جو چیزیں انھوں نے دیکھی ہیں یا جو کہانیاں انھوں نے سُنی ہیں اُن کو زبانی دہرائیں۔ جب بچوں کو یہ لکھنا آجاتا ہے تو اُن سے یہی باتیں لکھوائی جاتی ہیں۔ ہجوں کی صحت کی چنداں پروا نہیں کی جاتی لڑکے جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھ دیتے ہیں۔ ابتدائی سکولوں کی بالائی جماعتوں کے لئے نثر نویسی خطوط نویسی۔ نظم اور اسکول میگزین کے لئے مضامین لکھنے کا کام ہوتا ہے۔ مضمون نویسی کے لئے وہی مضمون دیئے جاتے ہیں جن پر لڑکوں کو کافی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ کہانیاں بیان کرنا اب متروک ہو رہا ہے۔ مضمون نویسی کے لئے جدت کو ضروری سمجھا گیا ہے۔

مدنی مضامین

اگزبشن کا یہ حصہ نہایت دلچسپ ہے علاوہ تصویروں، نقشوں اور اُن مقامات کے فوٹوگرافوں کے جن میں یہ مضمون سکھائے جاتے ہیں۔ مکمل اسباب بالتصویر اور ختم کئے ہوئے کام کے بہت سے نمونے۔ اُن میں دکھایا گیا کہ ہائی جین اور بچوں کی حفاظت کا کام کس طرح ہوتا ہے۔ کھانا کس طرح تیار ہوتا ہے۔ اور کھانا کھیتوں میں کام کرنے والوں کے لئے کس طرح لے جاتے ہیں مکھن بنانے کے طریقے۔ پھلوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے کپڑے دھونے کا کام جس میں یہ بھی بتایا گیا کہ اونی کپڑوں پر رگڑ کا کیا اثر ہوتا ہے یا زیادہ صابون لگانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسے کپڑوں کے

نمونے جن پر یہ عمل ہوا تھا۔ دکھایا گیا۔ علاوہ اس کے رنگ سازی۔ دھاتوں کا صاف کرنا اور گھروں کے نقشے تیار کرنے کا کام بھی بتایا گیا۔ کفایت شعاری کے عملی سبق بچوں کو اس طرح دیئے جاتے ہیں۔ کہ اُن کو سکھایا جاتا ہے کہ ردّی چیزوں سے کام کی ضروری چیزیں کس طرح تیار کی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہاں ایک نہایت عمدہ سٹول دکھایا گیا تھا جو سات خالی ٹین کے ڈبوں سے بنایا گیا تھا۔ ایک اسکول کے لڑکوں نے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بچوں کی ایک کرسی اور ایک چھوٹا سا کوئلے کا بکس بنایا تھا۔ لکڑی کا کام۔ رنگ سازی اور وارنش کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔

امتحانات یہ بیان کرنا نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ابتدائی مدارس میں امتحان کس طرح لئے جاتے ہیں امتحان تین قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) اندرونی امتحانات جو ہیڈ ماسٹر خود لیتے ہیں (۲) وہ امتحانات جو وظائف اور معافی فیس کے لئے لئے جاتے ہیں (۳) بیرونی امتحانات جو مقامی افسران تعلیم لیتے ہیں جو گیارہ سال کی عمر کے لڑکوں کی تعلیمی لیاقت معلوم کرنے کے لئے یا اُن کو اچھے کام کے سرٹیفکیٹ دینے کے لئے منعقد ہوتے ہیں۔

اس ایگزبیشن میں امتحانوں کے پرچے بچوں کے جوابات استادوں کی رپورٹیں، اور مقامی افسران تعلیم کے نتائج امتحانات دکھائے گئے۔

اندرونی امتحانات کے متعلق ہیڈ ماسٹروں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کام کے اطمینان بخش ہونے کی تسلّی کرتے رہا کریں۔ ہیڈ ماسٹر سال میں تین یا چار دفعہ لڑکوں کا امتحان لیتے ہیں۔ چھوٹے لڑکوں کے امتحانات سرسری ہوتے ہیں۔ تحریری کام صرف حساب مضمون نویسی اور ڈرائنگ کے متعلق ہوتا ہے۔ باقی امتحان زبانی ہوتا ہے۔ بڑی جماعتوں میں تمام امتحان تحریری ہوتا ہے۔ ہر جماعت کا نتیجہ جماعت کی ریکارڈ بک میں درج کیا جاتا ہے۔ جس میں جماعت کی عام لیاقت کا ذکر ہوتا ہے۔ ضروری مشورے دیئے جاتے ہیں اور نکتہ چینی کی جاتی ہے تاکہ وہ استادوں کے کام آئے۔

بہت اسکولوں میں اس قسم کے امتحانات کے ساتھ باضابطہ طور سے ذہن کے اندازہ کرنے کے امتحانات بھی ہوتے ہیں۔

ابتدائی اسکولوں میں بیرونی امتحان گیارہ اور بارہ سال کے لڑکوں کا مقامی تعلیمی افسر لیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیا لڑکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لائق ہوگیا ہے یا نہیں۔ یہ امتحان کئی طریقوں سے لیا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر ایک خاص عمر کے لڑکوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ہر ایک سکول کے

چیدہ چیدہ لڑکوں کا امتحان ہوتا ہی بعض ضلعوں میں امتحان زبانی اور بعض ضلعوں میں تحریری ہوتا ہی۔

تجربے اور موجودہ اصلاح تعلیم

اس حصّے میں یہ دکھایا جاتا ہی کہ

(۱) کہ ابتدائی سکولوں میں موسیقی اور دوسرے علوم و فنون میں کیا ترقی ہوئی

(۲) یہ کہ لڑکوں میں خود اعتباری کا کتنا مادّہ پیدا کیا جاتا ہی بذریعہ طریقہ ڈالٹن وغیرہ

(۳) یہ کہ اپنے آپ کے سدھارنے کے کون کون سے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

بعض مظاہر میں یہ دکھایا گیا۔ کہ ذہنی امتحانات کس طریقے سے لئے جاتے ہیں۔ جماعت کے کمرے میں سائینس۔ سینما موٹوگراف، چھپائی کی تحریر کے نمونے امپایر ڈے کے جشن کے حالات۔ اولڈ سکالرز ایسوسیشن کے حالات، ہیلتھ بریگیڈ کی کیفیت اور اسکولوں کے کھانے کا انتظام دکھایا گیا ہی۔

موجودہ تعلیم کا اصل اصول یہ ہی۔ کہ لڑکے کو۔ اُستاد کو اور اسکول کو مکمل آزادی ہو۔ بورڈ آف ایجوکیشن نے اپنے مشوروں کی تمہید میں لکھا ہی کہ انگریزی ابتدائی سکولوں کے لئے یک رنگی کو ہم ناپسند کرتے ہیں۔ ہر ایک اُستاد کو چاہیئے کہ اپنے خیال کے مطابق تعلیم کے ایسے طریقے سوچے۔ جو لڑکوں کے لئے خاص خاص حالات میں مفید ہوں۔ ہر بات میں سوائے انتظام اسکول کے یک رنگی مناسب نہیں۔

ریاضی

اس حصے میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ مظاہروں میں دکھایا گیا کہ اسکول میں داخل ہونے کے دن سے لے کر سکول چھوڑنے تک لڑکا ہندسوں کے متعلق کیا کچھ سکھتا ہی۔ بالائی جماعتوں میں وہ حساب سکھایا جاتا ہی جو روزانہ کام میں آئے مثلاً لین دین کا حساب سیونگ بنک کا حساب اور نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ کی خرید و فروخت یا کسی کمپنی کے حصّوں کی خرید و فروخت یا زندگی بیمہ کرانے کے طریقے۔ بہت سے لڑکیوں کے اسکولوں میں حساب اس قسم کا سکھایا جاتا ہی جو خانگی ضروریات اور خرید و فروخت کے متعلق ہوتا ہی۔ لڑکوں کے سکولوں میں ریاضی اور دستکاری پہلو بہ پہلو رکھے جاتے ہیں۔

کند ذہن اور کمزور بچے

اس حصّے کے مظاہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن بچّوں کو جو کمزور اور کند ذہن ہوتے ہیں یا سکول کے معمولی کام سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اُن کو خاص طریقے سے تعلیم دی جاتی ہی جب ایسے لڑکوں کی تعداد کافی ہو۔ تو خاص جماعتیں اُن کے لئے کھولی جاتی ہیں اور تعلیم کے خاص طریقوں پر زور دیا جاتا ہی جو دستکاری اور کھیلوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ جماعت کے مضمون مثلاً حساب اور انگریزی پڑھائے تو جاتے ہیں۔ لیکن نرم اور سادہ طریقے سے لڑکیوں کے اسکولوں میں سوئی سلائی کے عمدہ کام۔ چمڑے کے کام اور گڑیا بنانے کے کام پر زور

دیا جاتا ہے۔

سائنس پہلے بھی دیہاتی سکولوں میں سائنس کی تعلیم کا ذکر ہو چکا ہے۔ جہاں نباتات، کیڑوں، پرندوں اور جانوروں کے متعلق معلومات حاصل کئے جاتے ہیں۔ قصباتی مدارس میں ابتدائی طبیعات علم کیمیا اور علم اجسام پر سبق دیئے جاتے ہیں۔

چھوٹی جماعتوں کو خواہ وہ قصباتی ہوں یا دیہاتی سائنس کی تعلیم صرف مطالعۂ قدرت کے متعلق ہوتی ہے۔ بالائی جماعتوں کو سائنس کی تعلیم دینے میں مقامی حالات کے اثرات کا خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ دکھایا گیا تھا کہ وہ اسکول جو سمندر کے نزدیک ہیں اُن کی سائنس کی تعلیم پر سمندر کی نزدیکی کا کیا کیا اثر پڑتا ہے۔

سائنس کا کام اور دستکاری کا کام لڑکوں کے اسکولوں میں پہلو بہ پہلو رکھے جاتے ہیں بعض اسکولوں میں ٹیلیفون اور بے سلکی تار کا سلسلہ اپنا ہے۔ بعض سکولوں میں لڑکوں کو سکھایا جاتا ہے کہ برقی روشنی اور برقی گھنٹوں کا کام کس طرح ہوتا ہے۔ ایک مکمل بے سلکی تار کا سلسلہ ڈربی شائر کے ابتدائی سکول کے چار لڑکوں نے اگزبیشن پر تیار کیا۔ جو اسی غرض کے لئے لنڈن آتے تھے۔ ایک دلچسپ مجموعہ سائنس کے اوزار کا دکھایا گیا۔ جو لڑکوں نے ردی ٹکڑوں سے بہت تھوڑے خرچ سے تیار کیا تھا۔ خرچ کا اندازہ بھی ساتھ لگا تھا۔

دستکاری اس اگزبیشن کا سب سے دلچسپ حصہ یہی تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی بنائی ہوئی چیزیں دکھائی گئیں اور یہ چیزیں تین قسموں میں تقسیم کی ہوئی تھیں۔

(الف) گیارہ سال سے کم عمر کے بچوں کی بنائی ہوئی چیزیں۔

(ب) بڑے لڑکوں کی بنائی ہوئی چیزیں یعنی (۱) عمدہ مذاق پیدا کرنے کے لئے لکڑی کی گلکاری وغیرہ (۲) سائنس کی اغراض سے بنائی چیزیں مثلاً سورج کا نظام اور چاند گرہن کے وقت زمین اور سورج کی حالت۔ (۳) کارآمد چیزیں مثلاً چھٹیاں تولنے کی میزان وغیرہ

(ج) بڑی لڑکیوں کی دستکاری مثلاً اعلیٰ سوئی سلائی کا کام۔ چمڑے کا کام، کپڑے بنانے کا کام۔ پرانے کپڑوں کو نیا کرنا۔ فیتا۔ گوٹا، کناری اور خانگی استعمال کی چیزیں۔

دستکاری سکھانے کا نیا طریقہ یہ ہے۔ کہ ہر کام کے عمدہ عمدہ نقشے اور نمونے لڑکوں یا لڑکیوں کو بتائے جائیں۔

ٹرننگ کالجوں کے تمام لڑکوں کو آج کل دستکاری کا کچھ نہ کچھ کام سیکھنا پڑتا ہے۔ اور کسی خاص دستکاری کے متعلق اعلیٰ تعلیمی کورس بھی لے سکتے ہیں۔

اس نمائش کا ایک خاص جزو مختلف فنون کے متعلق تھا۔ اعلیٰ قسم کا ڈرائنگ قلم یا پنسل سے بنایا ہوا دکھایا گیا۔ حافظے کی مدد سے یا تخیل کی مدد سے بنائی ہوئی تصویریں۔ روزانہ زندگی کے واقعات کی تصویریں۔ کہانیوں کی تصویریں۔ ادبی فقروں کی تصویریں اور جغرافیہ، تواریخ، مطالعہ قدرت کے ڈرائنگ، دستکاری، مساحت اور علم حساب کے ڈرائنگ بھی دکھائے گئے۔ سوئی سلائی کے کام مختلف نمونے اور نقشے اور وہ چیزیں جو بچوں نے خاص اپنے نمونوں کے متعلق خیال کی تھیں۔ بنائی گئیں۔

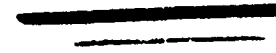
تواریخ تواریخ پڑھانے کا وہ طریقہ جو ہندوستان کے اکثر سکولوں میں رائج ہے جس میں لڑکوں کو تواریخ کی کتابیں جماعت میں پڑھائی جاتی ہیں۔ کئی سال ہوئے کہ ترک ہو چکا ہے۔ موجودہ طریقہ یہ ہے کہ اُستاد ایک خاص تواریخی مضمون پر لڑکوں کو لکچر دیتا ہے اور لڑکے نچ کے طور پر اُس کے متعلق کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ آج کل یہ خیال ہے کہ تواریخ دستکاری اور ڈرائنگ وغیرہ کے ذریعے سے پڑھائی جائے چنانچہ نمایش میں ایسے نقشے دکھائے گئے جن میں مختلف زمانوں کے لباس، تعمیر اور خانگی اشیا کی شکلیں دکھائی گئی تھیں اور ایسی کتابیں دکھائی گئیں جن میں لڑکوں نے مشہور آدمیوں، تاریخی عمارتوں، تاریخی مکانوں و مشہور پرانے کا غذات کی تصویریں بنائی تھیں۔ مقامی تواریخ بھی بہت حد تک پڑھائی جاتی ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لڑکوں کو مقامی عجائب گھروں اور تواریخی عمارات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ چھوٹی جماعتوں میں کہانیاں بیان کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ لڑکوں کو اجازت ہوتی ہے کہ ان کہانیوں کے متعلق ڈراما کیا کیا کریں۔ بالائی جماعتوں میں لڑکوں کو منتخب مضامین کا خود بخود مطالعہ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اس کے علاوہ جماعت میں تواریخی مضمون نویسی اور زبانی تذکرے ہوتے ہیں۔ کسی خاص زمانے کی تاریخی کے متعلق لڑکوں کے معلومات کا اندازہ کرنے کے لئے لڑکوں سے اُس زمانے کے متعلقہ اشیا کا ڈرائنگ کرایا جاتا ہے۔

جغرافیہ اس مضمون کے متعلق بھی اس نمائش میں بتایا گیا کہ دستکاری اور جغرافیے کا آپس میں قریبی تعلق ہے۔ نقشے، تصویریں اور ایسے نمونے دکھائے گئے جن سے قدرتی مناظر مثلاً گرہن اور موسموں کے تغیر و تبدل وغیرہ کے حالات معلوم ہوتے تھے اور ایسے اوزار دکھائے گئے جو ان مضمونوں کے واضح کرنے کے لئے لڑکوں نے خود بنائے تھے۔

چھوٹی جماعتوں میں جغرافیہ اس طرح پڑھایا جاتا ہے کہ مختلف ملکوں کے لوگوں کی زندگی کے

حالات کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ قدرتی مناظر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور بچوں کو گرد و نواح کی چیزوں کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ سادہ طور سے موسموں کے متعلق نقشے تیار کریں جن میں ہوا، بارش، گرمی اور سردی کے متعلق ذکر ہو اور جس علاقے میں وہ رہتے ہیں۔ اُس کی سڑکوں آمد و رفت کے ذرائع اور صنعت و حرفت کا ذکر ہو۔

بالائی جماعتوں میں جغرافیہ ملکی کے لحاظ سے پڑھایا جاتا ہے اور جغرافیہ کے متعلق سوالات کا حل لڑکوں سے بذریعہ اٹلسوں اور دیگر کتابوں کی مدد کے کرایا جاتا ہے۔



لکچر نمبر ۲۱

مانٹسوری طریقہ تعلیم

یعنی بچوں کو کھیل کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا طریقہ

(مولوی محمد حبیب الرحمان صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ لکچرر ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرات۔

مجھ سے پیشتر مس اسکاٹ نے اپنی جامع تقریر میں مانٹی سوری طریقہ تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ اور اُن کی دلاویز تقریر کے بعد یہ نہایت غیر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ عرض کروں، لیکن اردو داں حضرات کے استفادہ کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو اُن کی مادری زبان میں بیان کیا جائے، اُس کے مخصوص اغراض و مقاصد سے اُن کو کما حقہٗ آگاہ کیا جائے اور اُن آلات کے فوائد اور طریقہ استعمال پر روشنی ڈالی جائے جو اس صنف تعلیم میں کام آتے ہیں۔

اس طریقہ تعلیم میں متعلم کی ذات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، اور میڈیم مانٹی سوری کے زاویہ نگاہ سے حقیقی اور سچی تعلیم وہ ہے جو بچہ خود حاصل کرے، اور خود بخود تعلیمی آب وہوا میں ہوش کر ادراک سے کام لے، اور فہم و فراست پر زور ڈالے۔ یعنی تعلیم وہ دماغی عمل ہے جس کی مدد سے بچہ روحانی، اخلاقی اور ذہنی تربیت خود حاصل کرے، چنانچہ اس نوع کی تعلیم صرف اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب بچہ کی قوتوں کو نظری قوانین کے موافق نشو ونما پانے کا موقع دیا جائے، یعنی وہ اپنی موجودہ اور پوشیدہ قوتوں کو عمل میں لائے، اور نیچرل ضوابط کے دائرہ میں رہ کر تکمیل حاصل کرے۔ یورپ میں روسو کے زمانہ تک اور ہندوستان میں اب تک تعلیم کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ بچہ کو ہر لحاظ سے اس امر پر مجبور کیا جائے کہ وہ لباس میں حرکات و سکنات میں گفتار و رفتار میں اور خیالات و جذبات میں اپنے بزرگوں کی کورانہ

تقلید کرے، یعنی بہ الفاظ دیگر یہ ضروری تعلیم مسلمہ کہ بچہ کی دنیا اُس کے بزرگوں کی دنیا سے مختلف ہے، اور اُس کے خیالات اور افعال کو اُس کی فطری قوانین کے تابع ہونا چاہئے ہمیشہ پس پشت ڈالا گیا ہے۔ روسو۔ فروبل، ٹالسٹائی اور موجودہ زمانہ میں میڈیم مانٹی سوری نے اپنے طریقہ تعلیم میں اسی اصول پر زور دیا ہے کہ معلّم کی انتہائی کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ بچہ کی فطرت کا عمیق نگاہ سے مطالعہ کرے، اور اس کی تکمیل میں حتی الوسع اعانت کرے۔

میں مانٹی سوری کے طریقہ تعلیم کے بنیادی اصول بالتفصیل عرض کرنا بیکار سمجھتا ہوں اس لئے کہ مجھ سے قبل فاضل مس اسکاٹ صاحبہ نے انھیں نہایت فصاحت سے فرما دیا ہے اس وقت میں صرف نہایت اختصار سے آپ صاحبان کے سامنے مانٹی سوری اسکول کے کمرہ کا موقع پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اُس کے بعد مختصر طور پر اُن آلات و اشیاء کی تشریح کروں گا جو اس طریقہ تعلیم میں استعمال کئے جاتے ہیں کلاس ایک بڑا ہوادار کمرہ ہوتا ہے جس کی کھڑکیاں اور دروازے اس قدر اونچے ہوتے ہیں کہ تین سال کی عمر کے بچے آسانی سے کھول اور بند کرسکیں۔ دیواروں پر ہلکا سبز یا کوئی اور رنگ ہوتا ہے۔ اور جا بجا تصاویر اس قدر بلندی پر آویزاں کیجاتی ہیں کہ بچے اُن کا آسانی کے ساتھ مطالعہ کرسکیں اور اُن کو صاف دیکھ سکیں، جا بجا چھوٹی چھوٹی ہلکی میزیں اور کرسیاں بچھی ہوتی ہیں اور ان میزوں اور کرسیوں کے سائز اور اونچائی میں فرق ہوتا ہے تاکہ ساڑھے تین سال سے سات سال کے بچے باسانی اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دیوار کے قریب دو یا تین الماریاں بقدر ضرورت رکھی ہوتی ہیں، اور ان میں مانٹی سوری طریقہ تعلیم کا سامان محفوظ ہوتا ہے، جو بچے خود وہاں سے نکالتے ہیں، اور استعمال کرتے ہیں، کمرہ کے وسط میں فرش ہوتا ہے مختلف بچے کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بچوں کی آوازوں کے ملنے سے کمرہ میں ایک دلاویز بھنبھناہٹ پیدا ہوتی ہے، سب بچے بے انتہا مصروف نظر آتے ہیں، اور یہی امر اس بات کا ثبوت ہے کہ بچوں کو اس طریقہ تعلیم سے دلچسپی ہوتی ہے مانٹی سوری کلاس کی خاموشی اُس سکوت سے مختلف ہوتی ہے جو طریقہ قدیم کے اُستادوں کے خوف سے طاری ہوتا ہے، اس خاموشی کی وجہ محض وہ انتہائی انہماک ہے جو ہر بچہ پر طاری ہوتا ہے، بچہ کو ہر جائز قسم کی آزادی دی جاتی ہے، بسا اوقات بعض بچوں کی طبیعت کام کرنے کو نہیں چاہتی۔ مانٹی سوری معلم انہیں کام کرنے پر اس حالت میں مجبور نہیں کرتا بالخصوص نئے داخل شدہ بچے دو تین روز تک کام نہیں کرتے، وہ صرف دوسرے بچوں کو کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور اس مشاہدہ سے ان کے دل میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے، باقاعدہ مانٹی سوری اسکولوں میں بچوں کی رہائش کا سامان بھی ہوتا ہے اور کچھ کمرے اس مصرف کے لئے مخصوص کردئے جاتے ہیں، کلاس کے کمرہ اور رہائش کے کمرہ کے

درمیان میں آمد و رفت کا دروازہ ہوتا ہے، اور جب کسی بچہ کی طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے، اور وہ کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اس کو آرام کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ چنانچہ تھکے اور پس ماندہ بچے فوراً بستروں پر پہونچ جاتے ہیں، اور محو استراحت ہوتے ہیں، یا اسکول کے ملحق باغیچہ میں گھومنے لگتے ہیں اور آن کی آن میں تازہ دم ہو کر واپس آجاتے ہیں اور کام میں مصروف ہو جاتے ہیں، تعلیم کی غرض و غایت بچہ کو دنیا کے لئے تیار کرنا ہے، چنانچہ اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ خرد سال بچہ خود کپڑے پہننا، کپڑے اُتارنا، نہانا، کپڑوں کو صاف رکھنا، گری ہوئی چیزوں کو مقررہ جگہ پر حفاظت اور سلیقہ سے رکھنا سیکھیں، اور دوسروں کی مدد حاصل کرنے کی تباہ کن عادت سے محفوظ رہیں۔

اگر بچہ صرف قمیص پہن کر کام کرنا چاہتا ہے تو اُسے باقاعدہ کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگنا چاہئے، اگر کوئی بچہ کوٹ اتار کر فرش پر پھینک دے یا کرسی پر ڈال دے تو اس سے وہ کوٹ اُٹھوایا جاتا ہے اور جائے مقررہ پر ٹانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بچوں سے گڑیوں کی طرح برتاؤ نہیں کیا جاتا، اور ہر کام میں اُن کو ملازموں کی مدد کا حاجتمند نہیں بنایا جاتا، ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بچہ خود اپنے کام حتی الوسع کرے، اور جو نہ کر سکے اس کو سیکھے، اور اُس کے کرنے کی کوشش کرے، بچے جس وقت اسکول میں آتے ہیں تو سب سے قبل اُن کی جسمانی صفائی اور لباس کی ستھرائی کا جائزہ نظری لیا جاتا ہے، اُن کے ہاتھ، ناخن، کان اُن کی گردن اور اُن کے چہرہ کا بغور ملاحظہ کیا جاتا ہے، اگر اس کا کوئی بٹن ٹوٹا ہوتا ہے تو وہ اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے، بچہ کو کان صابن سے اور آنکھیں معمولی پانی سے دھونے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ انھیں دانتوں کو برش سے یا منجن سے صاف کرنا سکھایا جاتا ہے۔ بڑے بچے چھوٹوں کی مدد کرتے ہیں اور اس میں اُن کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ باہمی امداد دینے کی عادت پڑے انھیں اس بات کی بھی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ اپنے ڈیسک پر اس طرح بیٹھیں، اور اس طرح اٹھیں کہ آواز پیدا نہ ہو، انھیں کمروں میں داخل ہونے اور باہر جانے کا طریقہ بتایا جاتا ہے، اس کے علاوہ سلام کرنے اور بات چیت کرنے کے آداب اُن کو بتائے جاتے ہیں، تاکہ بچپن سے وہ متین و سنجیدہ اور خوش وضع و خوش اخلاق ہوں، اور آیندہ چلکر یہ عادات راسخ ہو جائیں۔

سامان - اس عمر میں تعلیم بالخصوص حواس خمسہ کو دی جاتی ہے، مختلف قسم کے آلات اور طریقوں سے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ بچہ کے حواس کی تکمیل کے مواقع مہیا کئے جائیں، سب سے پہلے چیز جو نہایت خورد سال بچہ کو دی جاتی ہے وہ لکڑی کے بٹن (Blocks) بلاکس کا ایک سٹ ہوتا ہے، ہر بلاک میں دس (Cylinders) ہوتے ہیں۔ یہ سلنڈر سلسلہ دار

ایک سے دوسرے سٹ میں رنگ، بلندی اور وضع قطع میں مختلف ہوتے جاتے ہیں معلم تمام سلنڈر اپنے خانوں سے نکال دیتا ہے اور پھر ان میں رکھ دیتا ہے، اس کے بعد بچّہ تمام سلنڈروں کو نکال کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے، پہلے دو تین کوششوں میں بچہ کو اکثر ناکامی ہوتی ہے، وہ اکثر چھوٹے سلنڈر کو بڑے سلنڈر کے خانے میں رکھ دیتا ہے، کم اونچے سلنڈر کو زیادہ اونچے سلنڈر کے خانے میں رکھ دیتا ہے، اور جب ان خانوں کے سلنڈر چھوٹے خانوں میں نہیں آتے تو بچہ تمام سلنڈروں کو نکالکر پھر از سر نو انھیں ترتیب دیتا ہے، اس طرح خود وہ اپنی غلطیاں معلوم کرکے ان کی تصحیح کرلیتا ہے۔ اس مشق کا اصلی منشا دراصل یہ مقابلہ کرانا ہے۔ بچّہ مختلف اونچائی اور قطر کے ٹکڑوں کا مقابلہ کرکے خود اونچائی اور جسامت وغیرہ کے مختلف درجوں سے واقف ہو جاتا ہے۔

Pink Tower (مینار احمر) یہ دس لکڑی کے ٹکڑوں سے بنایا جاتا ہے جن کی جسامت بتدریج گھٹتی ہے، بچہ مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے پر رکھکر مینار بناتا ہے۔ کامیابی اُس وقت ہوتی ہے جب ان ٹکڑوں کا انتخاب بلحاظ جسامت درست ہو۔

Broad stair (چوڑا زینہ) اس میں دس لکڑی کے Rectangular Prism ہوتے ہیں جو چوڑائی میں بتدریج گھٹتے جاتے ہیں مختلف ٹکڑوں کو بلحاظ چوڑائی اس ترتیب سے رکھا جاتا ہے کہ زینہ کی شکل بنجائے۔

Long stair (لمبا زینہ) اس میں مختلف ٹکڑے صرف لمبائی میں گھٹتے ہیں، بچہ مختلف حالتوں میں مختلف جسامت پہچاننے لگتا ہے۔ مندرجہ بالا مشقوں کا مقصد صرف ایک ہے۔

قوت لامسہ و قوت حارہ: قوت لامسہ کے لئے کھردرے اور چکنے لکڑی کے ٹکڑے استعمال کئے جاتے ہیں، ایک لکڑی کے ٹکڑے کا نصف حصّہ چکنا پالش کیا ہوتا ہے، اور باقی نصف ریگمال سے ڈھکا ہوتا ہے، پہلے بچّہ کے ہاتھ صابن سے دھلوائے جاتے ہیں، خشک ہونے کے بعد وہ نیم گرم پانی میں ڈبو دئے جاتے ہیں تب تولیہ سے رگڑ کر خشک کردئے جاتے ہیں، انگلیاں اب مس کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ بچّہ کی آنکھوں پر کپڑا باندھ دیا جاتا ہے، اور وہ اپنی انگلیاں چکنی اور کھردری سطحوں پر پھیرتا ہے، اس کے بعد یہ مشق رفتہ رفتہ اور زیادہ پیچیدہ کردی جاتی ہے، لکڑی کی ایسی پٹیاں بچّہ کو دی جاتی ہیں جن میں باری باری سے کھردرے اور چکنے سطحیں ایک دوسرے کے بعد ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے کپڑوں سے بھی کام لیا جاتا ہے، مثلاً مخمل، ریشم، ململ، فلالین وغیرہ

قوت حارہ ۔ بچّہ اپنے ہاتھوں کو سرد، نیم گرم، اور گرم پانی میں ڈبوتا ہے۔ حرارت کا مقابلہ کرکے اُس کی قوت حارہ نشوونما ہوتی ہے۔

پہلی مشق یہ ہے کہ تمام (Insets) کو ایک (Tray) سے نکال لیا جائے اور پھر انھیں صحیح طور سے ان کی جگہ رکھا جائے۔ دوم (Insets) کو اور اس کے خانے کو بچّہ انگلیوں کے سروں سے چھوتا ہے۔ تیسرے یہ (Insets) آنکھیں بند کرکے اپنی اپنی جگہ رکھنی پڑتی ہیں چوتھے (Insets) کو کارڈوں کی صحیح شکلوں پر رکھنا پڑتا ہے۔

رنگین ٹکڑوں کے ذریعہ سے رنگ کے امتیاز کرنے کی قوت پیدا کی جاتی ہے اور قوت سامعہ چھوٹی چھوٹی جھنجھنوں کے ذریعہ سے نشوونما پاتی ہے۔ اُن میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا دانے بھرے ہوتے ہیں تاکہ بجانے سے مختلف قسم کی آوازیں نکلیں۔

لکچر نمبر ۲۲

ارض القرآن

قاضی جلال الدین صاحب ۔ لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب صدر و ذیعلم حضرات ۔ علم سیر اور فن جغرافیہ کی طرف سے عام بے توجہی کے پہلو پر غور کرتے ہوئے اگر میں اپنی ناچیز رباعی سے آغاز کلام کروں تو شاید بیجا ہو گا ۔

اسلاف کے ہاتھ تھی بنائے تاریخ سیر فی الارض بستدائے تاریخ
اخلاف یہ اُن کے پوچھتے ہیں کیوں جی کس درد کو کھوتی ہے دوائے تاریخ

حضرات ۔ ان ہر دو فنون پر ماہران تعلیم کافی روشنی ڈال چکے ہیں ۔ ان کے گرانقدر لکچر کانفرنس کی رپورٹ کے صفحات کو مزین اور مذہب بنا دیں گے ۔ مجھے ان اشارات کے دوہرانے اور نکات تاریخی اور جغرافی کے اعادہ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن ایک پہلو ضرور باقی ہے جس کا اضافہ کرنا میرے لئے اس وجہ سے لازمی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو مشرقی اور قومی نقطہ خیال سے دیگر یونیورسٹی ہائے عالم کے بالمقابل کچھ امتیاز حاصل کرنا ہے ۔ یونیورسٹی ملنے کی مسرت کسی قوم کو اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کو نصاب اور طریقہ تعلیم کے ردو بدل کے قانونی اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں ورنہ کالج اور یونیورسٹی میں کوئی مابہ الامتیاز تفاوت نہیں ۔ نہ صرف ہماری جماعت بلکہ سارا ہندوستان عالیجناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بالقابہ کے ہمت اور حوصلہ اور تعلیمی اولوالعزمی سے خوب واقف ہے ان کی ذات باصفات سے جو امیدیں وابستہ ہیں ان کی بنیاد پر ہر شخص کو یہ جسارت ہوتی ہے کہ ہر ایک قابل العمل تجویز پیش کرنے اور ذیعلم ارکان کانفرنس کو اس پر غور فرمانے کا موقع ملے ۔ حضرات کسی مسلمان کو جو احکام قرآنی کا تابع ہو یہ سنانا کہ تاریخ و جغرافیہ مفید اور ان کی تعلیم و تعلم ایک امر ناگزیر ہے ایسا ہی ہے جیسے ضروریات دینی کی اہمیت کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا ۔ کیونکہ خود قرآن پاک کا ایک جزو عظیم تاریخ سے پر ہے ۔ طرح طرح پر اور کہیں کہیں بالتکرار اقوام کی جہالت اور نافرمانی اور گمرہی کے ہولناک نتائج دکھلا کر کلام پاک

کو مرقع عبرت بنا دیا گیا ہے تاکہ آنے والی نسلوں میں جذبات فاسدہ کا فقدان اور حسیات لطیفہ کا وجدان ہو۔ عبرت کے لئے مشرکین کو بار بار سیروا فی الارض کی تاکید ہوتی ہے اور جو کھلا راستہ تحصیل علم الارض کا ہے جس کو یونانی جغرافیہ کہتے ہیں اور وہ مقدم ہے تاریخ پر کیونکہ اول سیر زمین کرنا ہے تب وہاں کی تاریخ جس کا اجمال فانظر کیف کان عاقبة الظالمین اور کیف کان عاقبة المکذبین ہے۔ نہ صرف عبرت اور انتباہ کے لئے یہ دونوں فن لازم ہیں بلکہ ایک مسلمان کے لئے اس کے ارکان دین اور ضروریات مذہب روزانہ زندگی میں اس امر کے داعی ہیں کہ وہ اصول جغرافیہ سے بخوبی واقف ہو یعنی اطراف اربعہ کی شناخت ہو عرض البلد اور طول البلد سے آگاہ ہو تقسیم و تعین اوقات تعین بلاد و مقامات سکونت کے نقطہ وقوع سے واقفیت اور ہر ملک کی بری اور بحری راستوں اور منزلوں کا علم رکھتا ہو۔ کیونکہ سمت قبلہ قائم کرکے مساجد کی تعمیر کرنا۔ سفر حج کے لئے طے مراحل اور قطع منازل کرنا۔ غیر معروف مقامات میں پنجوقتہ نماز رو بقبلہ ہو کر ادا کرنا۔ بحری سفر میں جس کی ناخدائی عربوں نے بلا شرکت غیرے ۱۲ سو برس تک کی ہے عرض اور طول بلد کا علم ہونا امر لابد ہے۔ نہ آپ حضرات کے روبرو اس امر کے اعادہ کی ضرورت ہے کہ مسلمان بالتخصیص فن سیر کے موجد ہیں کیونکہ ان کو اپنے ہادی معظم اور نبی اکرم صلعم کے ہر ہر لمحہ کے حالات جمع کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور ان کا یہ دعویٰ ہرگز مبالغہ آمیز نہیں کہ آنحضرت صلعم کی سوانح عمری کی طرح اس عالم میں کوئی بایاگرفی اس کے عشر عشیر بھی تفصیل سے نہیں لکھی گئی اور پھر راویوں کی ثقاہت اور اعتبار قائم کرنے کی غرض سے ہر ایک کے حالات معرض تحریر میں آئے اس طرح دینی اغراض نے علم سیر اور تاریخ کو مکمل کر دیا۔ خلفائے عباسیہ نے ان ہر دو علوم کی تدوین کا شاہانہ طریق پر انتظام کیا اور خود بھی علمائے متبحر نے صدہا کتب مثل تاریخ طبری۔ خلدون۔ ابن خلکان۔ طبقات واقدی۔ ابو الفدا سیرۃ ابن ہشام۔ مروج الذہب۔ مسعودی۔ مقدسی۔ کامل ابن اثیر۔ مغازی الرسول۔ طبقات الامم (ابن ساعد اندلسی) وغیرہ تاریخ میں اور تقویم البلدان۔ معجم البلدان۔ آثار البلاد۔ یعقوبی۔ کتاب الازمنة والامکنة (امام مرزوقی) صفۃ جزیرۃ العرب۔ کتاب الممالک والمسالک (حوقل) رسم المعمور من الارض۔ کتاب الاقالیم۔ احوال الامم الشمالیہ (ابن فضلان) صورۃ الاقالیم۔ البلاذری کی فتوح الممالک۔ کتاب البلدان احسن التقاسیم۔ کتاب الجغرافیا (زہری) اور ایسی کتنی مبسوط کتابیں جغرافیہ پر لکھی گئیں۔ دوسری صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے علوم مختلفہ پر ضخیم کتابوں کے تصنیف و تالیف کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام واقدیؒ جب اپنے مکان واقع بغداد غربی سے شرقی کنارہ دجلہ کی طرف عہد خلیفہ مامون الرشید میں منتقل ہونے لگے تو ان کا اپنا کتب خانہ بقول ابن جوزی ایک سو بیس اونٹوں پر لاد کر لایا گیا تھا۔

حضرات۔ ہمارے علماء وفضلاء وحکماء وفقہا واولیا وشعرا کو جغرافی نسبت سے ایسی دلچسپی تھی کہ وہ اپنے نام سے مقدم اپنی وطنی اضافت کو کر دیتے تھے آج کوئی قوم مشرق ومغرب میں ہے جس کے مشاہیر کے بعض ناموں میں تو با جغرافیہ ختم ہو۔ صرف اپنے بزرگوں کے نام یاد کریئے اور ان کے ساتھ ساتھ آپ کو عرب اور عجم کے اتنے نام خود بخود یاد ہو جاویں گے جو آکسفورڈ کے جدید سیزجیاگرفی میں نہ ملیں گے۔ کون نہیں جانتا شمس تبریزی کو ان کے مرید مولنا روم کو۔ حافظ شیرازی۔ مولنا جامی کو امام بخاری۔ امام ترمذی۔ علامہ زمخشری۔ امام سیوطی۔ علامہ اندلسی۔ امام رازی۔ ملک الفضلا خواجہ کرمانی (ہمعصر سعدیؒ) البیرونی۔ علامی شیرازی (ان کا نام اصلی نامعلوم ہے) الفرغانی۔ الفاریابی البطلی اور طوسی کو لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو ان کے اصلی ناموں سے واقف ہیں اور علامی شیرازی کا تو یہ حال ہے کہ ان کا اصلی نام بالکل گم ہی ہو گیا۔ المختصر عربوں کے نام میں یا وطنی نسبت ہوگی یا نسبی کنیت۔ مثلاً حمیری۔ قحطانی۔ اسرائیلی۔ اسمٰعیلی۔ اموی۔ عباسی۔ علوی۔ حسنی۔ حبینی۔ فاروقی صدیقی۔ فاطمی۔ اور عجموں میں بھی۔ سلجوقی۔ سامانی۔ عثمانی وغیرہ۔ ان دونوں حالتوں میں یا جغرافیہ کی جھلک آتی ہے یا تاریخ کی جھلک پائی جاتی ہے۔

حضرات۔ ان دونوں شعبہائے علمیہ سے آج نہیں کم سے کم چار سو برس سے مسلمانوں نے ایسی بے تعلقی برتی کہ ان کو اپنے مدارس میں نصاب تعلیم تک سے خارج کر دیا۔ تاریخ سے نابلد رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی۔ وطنی اور سیاسی خدمات کی آگ بجھ گئی اور جغرافیہ بھولکر اقتصادی اور تجارتی میدان میں پیچھے رہ گئے۔ تاریخ کے مولف اور مترجم تو خال خال پیدا ہوتے بھی رہے لیکن جغرافیہ کے تو آخری کتاب غالباً حکم ابوریحان بیرونی مصنف قانون مسعودی کے کتاب ہی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس میں مروج الذہب اور معجم البلدان جیسی برگزیدہ کتابیں منسلک ہیں۔ اب جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے غلط ناموں سے پُر پایئے گا۔ اس لئے کہ رسم الخط میں نقطوں کی ردو بدل یا موجودگی و غیر موجودگی اور اعراب نہ ہونے کے باعث جو طوفان اغلاط برپا ہے اس کا ٹھکانا نہیں رہا۔ اور کاپی نویسوں اور مصححوں کا تو ذکر کیا خود مصنفین اور مترجمین کو بحث میں شبہ رہتا ہے۔ مثلاً بنی امیہ کے عہد میں جو راجہ دیار کابل پر حکمراں تھا اس کا نام رتبیل درج ہے اب کسی تاریخ میں وہ رتبیل ہے۔ کسی میں زنبیل اور رتنبیل لکھدیا گیا ہے یہ حال فارسی اور اردو کتابوں کا ہے۔ عربی میں پھر بھی بہتر انتظام ہے۔ ابھی حال میں ایک بڑے پروفیسر کو تاریخ ہند کے ایک حصّہ میں چند ناموں کی تحقیق کرنا تھی جو آخر کار اسی کالج سے کر دی گئی۔ دو نام تھے جو قلمی نسخوں "مابدہ" اور "ایرج" لکھے ہوئے تھے۔ جو بلا تحقیق طرح طرح سے پڑھے جا سکتے ہیں لیکن معلوم کر دیا

گیا کہ وہ بند ملکھنڈ کے دو پرانے قصبے ایرج اور بانڈیر ہیں۔ ہمارے نئے مصنف تاریخ میں بیچھے تلے دیتے
ہیں لیکن جغرافیہ میں آکر غرب اور شرق تک میں لغزش فرما جاتے ہیں۔ ابھی میں نے ایک کتاب میں دیکھا
کہ ابن الحبیب کی جگہ علی التواتر ابن الخبیث چھاپا گیا ہے۔ ہندوستان کی مطبوعہ کتب جغرافی ناموں کی
غلطیوں سے پُر ہیں تمثیلاً تاریخ طبری فارسیہ مطبوعہ منشی نولکشور پریس کو ملاحظہ کر لیجئے جس کو مرقع اغلاط کہنا
بیجا نہ ہوگا۔ شاید کوئی جزو کتابت کے ہولناک ترمیم اور تمسیخ سے مبرا ہو۔ واتق کو واثق اور قنسرین کو خسترین
فسان کو خراسان پڑھکر ایک مورخ جس قدر بھی مغالطہ میں پڑے کم ہے۔ اس میں صاحب مطبع کا ذرہ بھر
قصور نہیں بالخصوص منشی نولکشور کے بار احسان عام سے مسلمانوں کے علمی دنیا تو سر تک نہیں اٹھا سکتی
صدہا نایاب کتب جو کیڑوں کا کھاجا ہو رہی تھیں ان کی اولو العزمی سے زندہ ہو گئیں۔ لیکن ان اغلاط کے
دور کرنے اور کاپی نویسوں کی دراز دستیوں سے محفوظ رہنے کا ان کے یا کسی کے پاس کیا چارہ کار ہے
ذی علم مصحح سیاق عبارت سے سہو کتابت کو رفع کر سکتا ہے لیکن واثق پر واتق اور جزیرہ فسان کو خراسان
پر کیونکر ترجیح دیگا کیونکہ خراسان سے سب واقف ہیں اور فسان سے خال خال حالانکہ تاریخی واقعہ میں
صدہا میلوں کا تفاوت پڑ جاتا ہے۔ ہماری قومی انسٹی ٹیوشنوں کو یہ دیکھنا ہے کہ کتنے مسلمان طلبا اپنی
مذہبی اور قومی تاریخوں کو جغرافیہ سے ملا کر کم از کم اس قابل ہو رہے ہیں کہ پرانی مطبوعات کی تصحیح اغلاط
ہی کر دیں۔ کیا یونیورسٹیاں بھی تاریخی ایم۔اے کی سند یافتوں کو بھی اتنا نہ بنا دینگی کہ وہ اپنے لٹریچر
کے ان شرمناک عیوب کو دور کر دیں۔ موجودہ طرز تعلیم اور نصاب انگریزی تو انھیں اس قابل نہیں بنا
سکتا۔ پھر آخر دنیا کس کے پاس جاوے اور کس سے تحقیق کرائے۔ دو ضرورتیں اور ہیں جو ایک
مورخ یا معلم تاریخ کے لئے رفع کرنا ضروری ہیں اول تو ایک ہی تلفظ کے مختلف ناموں کی جائے وقوع
متعین کرنا دوسرے ایک ہی مقام کے کئی مختلف نام یاد رکھنا اور ہر عہد سے اس کے صحیح نام کو تطبیق
دینا مثلاً رہتاس یا پٹن جو دو دو ہیں۔ دہلی ایک عام لفظ ہے حالانکہ مختلف عہدوں میں دوسرے ناموں
سے تاریخوں میں تذکرہ آیا ہے اگر کوئی واقف نہیں تو خدا جانے ان کو کیا سے کیا سمجھے گا۔ مثلاً اسی دہلی
کا پرانا نام اندرپرست یا اندرپت ہے۔ ترکی سلاطین کا دار الخلافہ وہ دہلی رہی جو قطب مینار کے
متصل واقع تھی۔ اس کا نام قلعہ رائے پتھورا تھا۔ خلجیوں کی تاریخ میں دار السلطنت کلوکھیڑی اور
سری کے نام سے لکھا جاتا ہے۔ تغلق بادشاہوں نے جہاں پناہ۔ تغلق آباد اور فیروز آباد بسائے
سیدوں نے خضر آباد تعمیر کیا۔ شیر شاہ نے اندرپرست کو زندہ کر کے شیر گڈھ نام دیا اور سلیم شاہ نے سلیم گڈھ
ہمایوں نے دین پناہ بسایا۔ اور موجودہ دہلی کا نام شاہجہاں آباد ہے ان سب میں میلوں کا فاصلہ تھا

علیٰ ہٰذا ہرہ وار کے کتنے ہی نام ہیں تزک تیموری ہیں کوٹلہ ہے۔ اگر اس سے ناواقفیت ہے تو قابل سے قابل پرفیسر اور طلبہ کو یہ امر مغالطہ میں ڈال دیگا کہ آخر کوٹلہ کی جنگ کہاں ہوئی۔

حضرات یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ یہ سب دقتیں رفع ہوگئیں پھر بھی یہ سوال رہجاتا ہے کہ تاریخ پڑھنے کے بعد بھی جذبات فطری کو کیوں کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری کئی نسلیں غیر اقوام کی تاریخیں غیر ملکی مصنفین کی لکھی ہوئی پڑھتے آئے ہیں۔ اور کوئی بات ان میں ایسی نہیں ہوتی جس سے قومی۔ مذہبی یا وطنی حمیت پیدا ہو یا ہمت اور حوصلہ بڑھے۔ بلکہ اپنی روایات سے نا آشنا رہتے ہوئے اوروں کے مہیب ناموں اور دہشت انگیز افسانوں سے دل اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ پھر اٹھائے نہیں اٹھتے۔ عرب اپنے باپ دادوں کی مردانگی کے کارنامے رجز کے طرز میں سنا سنا کر ہر نا کردنی کام کر گذرتے تھے بیس بیس پشت تک کے حالات ان کے لوح پر منقش تھے اب تو یہ حال ہے کہ شاید ہم میں سے چند ایسے ہونگے جن کو نگڑ دادا بیچارے تو کیا پردادا کا نام بھی یاد رہا ہوگا۔ ان کے کارنامے تو بڑی بات ہیں اور اگر فرض کر کے مان بھی لیا جاوے تو کن کارناموں پر رگ حمیت زور کرے۔ کسی کے باپ ڈپٹی تھے اور دادا ناظر۔ کوئی صدر اعلیٰ تھے تو کوئی اہلمد یا نقل نویس۔ داروغہ جیل۔ انسپکٹر پولیس یا محرر کانجی ہاؤس یا اسکول ماسٹر تو ان امور کی یاد بھی آئی تو کیا آئی۔ اس لئے ہمیں مغربی معیار پر اپنے کورس ایسے تیار کرنے ہوں گے جن میں دنیاوی اطلاعات تا امروزہ کے ساتھ ساتھ قومی اور ملی رنگ قائم رکھا جاوے اول ہم اپنی تاریخ کو پڑھیں اور پھر دیگر اقوام کے تذکروں کا مطالعہ ہو۔ کیونکہ جب ہم مسعودی۔ خورداذبہ۔ ابن حوقل۔ ابن بطوطہ۔ اور بیراتی وغیرہ کے اکتشافی سفرنامے پڑھیں گے جن میں اس زمانہ کے بے سروسامانی سے بری اور بحری سفروں میں ۲۰۔۲۸ برس گذار کر کامیابی حاصل کرنے کا حال درج ہے تو ہمارے نوجوان سوسائٹی کے نازک دل پر کلمبس۔ ڈائز۔ ویسکوڈی گاما کیبٹ برٹن اور پالگریو وغیرہ کا رعب نہ چھائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے جغرافئے اور حمیت افزا تاریخیں جو ترتیب و تدوین میں اعلیٰ درجہ کے یوروپین تواریخ سے ٹکر کھا دیں کون تالیف کرے اور کون ان کی اشاعت کا ضامن ہو اور حامی اور مصنفین کا ہمت افزا ہو۔ قوم میں ارباب علم و دانش کی اب بھی کمی نہیں ہے کام لینے والوں کی دیر ہے۔ کسی مصنف کا کتب بہم کرنا پھر ہزارہا اجزا کی ورق گردانی کر کے حوالوں کے ساتھ ایک نئی کتاب مرتب فرمانا۔ بعد ازاں اس کی طباعت اور اشاعت کا خود انتظام حتیٰ کہ پروف پڑھنے کا اپنے ہی ہاتھوں سے انصرام کرنا فی زمانا جوئے شیر

لانے سے کم نہیں ہے جب تک کہ علمی کانفرنسیں اس کام کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں اور فنون اسلامیہ کے معتبر اور مستند کتابوں کے ذخیرہ سے زبان اردو کو مالا مال نہ کردیں انفرادی کوششیں ناکام رہینگی المختصریہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہماری تمام تاریخیں نقشوں سے خالی ہیں۔ جغرافی اور شخصی ناموں کی غلطیوں سے پُر ہیں یہ نقائص کوئی دوسری قوم ہمارے لئے کیوں دور کرنے والی ہے یہ کام خود اپنے کو کرنا ہے۔ یورپ کے ذی علم ماہران شرقیات نے ہماری رہبری کے لئے بہت کچھ رہنمائی کردی ہے علم دوست قوم کے بزرگوں کی ذراسی توجہ کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھئے کس قدر جلد ہماری کتب تواریخ مجلہ کس مپرسی سے عروس نو کی طرح مزین و مرتب ہوکر مجالس علوم و فنون میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسی ذیل میں مجھے آپ صاحبوں کے روبرو مثالاً چند نقشے پیش کرنے ہیں جو ادنیٰ نمونہ اس امر کا ہے کہ بزرگان ملت کے ذرا سے چشم ابرو کے اشارہ میں مجھ سا ایک بے بضاعت اور گمنام شخص بیس روز میں اس قدو قامت کے رنگین نقشے اپنی کتب کی مدد سے تیار کرسکتا ہے تو ماہرین فن اس صیغہ میں کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ آخر ہفتہ نومبر میں عالیجناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی و بانی نمائش مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے خواہش ظاہر فرمائی کہ جس طرح بائبل لینڈ کے نقشے یورپ والوں نے بنائے ہیں اسی قسم کے قرآنک لینڈ کے نقشے اور خریطے تیار کرنا چاہئیں جو قرآن پاک کے جغرافی حصہ کی تفسیر میں ممد اور ارض القرآن کی تشریح میں معاون ہوں اور آئندہ چلکر تاریخ اسلام کی بنیاد ٹھیریں۔ بظاہر منزل کٹھن اور راہ نامعلوم تھی۔ اس قسم کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہ تھا جس پر اضافہ یا ترمیم کردی جاتی۔ با ایں ہمہ جناب ممدوح الصدر کی فرمائش اور جناب مولنا طفیل احمد صاحب کی تاکید اور مکرمی خاں صاحب میر ولایت حسین کی تائید مزید نے آمادہ کار کیا۔ ۱۰ دسمبر تک نوٹ فراہم کئے جس کے لئے میں فاضل بے بدل علامہ دوران یگانۂ زماں جناب مولنا سلیمان ندوی مد فیضہٗ کا بدل متشکر ہوں کہ ان کی لاجواب معتبر و محقق کتاب ارض القرآن نے بے انتہا مدد دی اور ان کے حاشیہ اور حوالوں نے بہت کچھ گتھلکوں کے سلجھانے میں معاونت کی اگر یہ کتاب میسر نہ ہوتی تو یقیناً یہ کام دو ماہ سے کم میں نہ انجام پاتا۔ ۱۱ دسمبر سے نقشے تیار کرنے شروع کئے اور دس عدد بہ تقطیع ۲۲ × ۲۹ ہفت رنگ روغنی کاغذ کی تراشوں سے مرتب کرکے ۲۵ دسمبر کو آویزاں کردئے۔ اس عرصہ میں جناب صاحبزادہ صاحب بہادر نے کئی مرتبہ ناتمام کام کا ملاحظہ جاری رکھا جس نے بارود میں شتابہ کا کام دیا۔ مجھے افسوس رہا کہ حضرت مولنائے ندوی کانفرنس میں شرکت نہ فرماسکے ان کی واہ و پسندیدگی کی تمنا رہی۔ بہرحال ان نقشوں کو دیکھے

بعد دیگرے پیش کرتا ہوں۔

نقشہ نمبر۱ کشتی نوح
میں نے تاریخ قبل از ظہور حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کی ہے اور اسلامی روایات کے بنا پر جو زیادہ تر اسرائیلیات پر مبنی ہیں کشتی کا خاکہ قائم کیا ہے (نقشہ دکھا کر) چنانچہ اس کی جسامت ۵۰۴ فٹ × ۵۰ × ۷۵ × ۸۴ ہے۔ کشتی میں تین درجے ہیں۔ درجہ زیریں میں جانوروں کے جوڑے۔ درجہ وسطی میں اسّی انسانوں کی جگہ جن میں حضرت نوحؑ معہ اپنے تینوں فرزندوں سام۔ حام۔ یافث کے پناہ گزیں ہیں۔ چوتھا کنعان غرق ہو رہا ہے۔ بالائی درجہ میں پرندے لئے گئے ہیں۔ کوہ ارارات اور اس کی ایک ٹیکری کوہ جودی جس پر کشتی رکنے والی ہے۔ تنور میں سے پانی اُبلنا۔ گھری بادلوں سے بارش کا ہونا دکھلایا گیا ہے بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا کا اس کشتی پر علم نصب ہے۔

نقشہ نمبر۲۔ ارض القرآن
اس عرب و عجم کے نقشہ میں حضرت نوحؑ کی جائے سکونت متصل کوفہ سے ان کے تینوں بیٹوں سام۔ حام۔ یافث کی نسلوں کا عرب و ایران وافریقہ اور ممالک شمالیہ میں پھیلنا دکھلایا گیا ہے۔ گویا بنی احمر۔ اسود اور اصفر کی تقسیم کا خاکہ ہے۔ نیز حامی اقوام کے مقامی حدود ظاہر کئے ہیں کہ کہاں کہاں حام کے بیٹوں مصرائم۔ کوش اور کنعان نے سکونت اختیار کی۔ گویا آیہ شریف وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ مِنَ الْبَاقِينَ ۵ کی جغرافی تفسیر ہے۔ علاوہ بریں عرب شریف کی تین طبعی تقسیمیں تین رنگوں میں نمایاں کردی ہیں یعنی عرب الرمال (ریگستانی) عرب الجبال یا عرب الحجر (سنگستانی) اور عرب المیمونہ (آبادان)

نقشہ نمبر۳۔ ارض القرآن
تفسیر ہے آیۃ شریفہ۔ کذبت قبلھم قوم نوح واصحٰب الرس وثمود وعاد وفرعون واخوان لوط واصحٰب الایکۃ وقوم تبع الخ کی۔ اس نقشہ میں سامی اقوام کے آبادی مابین ۲۲۰۰ ق م و ۲۰۰۰ ق م دکھلائی گئی ہے جن ناموں کے قرآن پاک اور مواعظ میں روزمرہ تکرار کی جاتی ہے اُن کی جائے سکونت ونشر کی نقشہ میں تشریح کی گئی ہے۔ مل قدیمہ سومری اور اغادی کی عیلامیوں سے جنگ کے مقام سام کے پانچ بیٹوں کی نسلیں۔ ان میں سے آرام کے تین فرزندوں جسیر عوص اور لاذو کی نوآبادیاں یعنی جسیر سے قوم ثمود۔ عوص سے عاد اولے۔ اور لاذو سے عمالیق۔ طسم اور جدیس۔ الغرض اقوام ذیل کے جائے سکونت اس نقشہ میں صاف صاف معین کی گئی ہے۔ عاد اولے۔ اور عاد ثانیہ۔ (بنی لقمان) یا عاد اولے۔ عمالقہ۔ طسم۔ جدیس۔ جرہم۔ عیلامی۔ اسوری۔ ثمود۔ اصحٰب الایکہ۔ اصحٰب الحجر۔ انباط

یا اصحاب مدین - اصحب الرس - آدومی - آرامی - عرب بائدہ و صالحین ہود - اصحب الاخدود - اور اقوام تبع - ضروری مقامات میں یمن حضر موت - عمان - یمامہ - نجد - مکاریہ (مکہ) یثرب - حجر یا مداین صالح وادی القریٰ ہیں - مصر - بابل وغیرہ درج کئے گئے ہیں -

نقشہ نمبر ۴ - ارض القرآن تاریخی حیثیت سے نہایت کارآمد نقشہ ہے جو غالباً اول مرتبہ تیار ہوا ہو اس میں قلنا یا نار کونی بردا الخ کی جائے وقوع - بنی سام میں ارفخشد کی اولاد قحطان کا عرب میں انتشار بتلایا گیا ہے - چنانچہ - بنی مواد - بنی حضار موت - بنو حمیر - بنو یعرب - بنو کیندا - بنو سبا - بنو اوزال - بنو مدورام - بنو سلف وغیرہ قحطان کے بھائی فلج کی نسل میں حضرت ابراہیم اور آنحضرت کے بھائی فاران کی نسل میں حضرت لوطؑ اور بنی مواب جا بجا نقشہ میں درج ہیں - نیز قبطیون - فراعین مصر - لقمانؑ - شداد اور نمرود کا مختصر تذکرہ ہے سنہ تاریخ حواشی پر لکھ دیا گیا ہے -

نقشہ نمبر ۵ - ارض القرآن اس خوشنما عرب کے نقشہ میں بنی اسمٰعیلؑ بنی اسرائیلؑ - بنو مدیان بنی قحطان - بنی عیس یا قوم ادوم - بنو مواب - بنو جرہم جنھوں نے حضرت اسمٰعیلؑ سے رشتہ قرابت کیا - حکومت نمرود - مملکت عمالقہ مصر - مملکت عیلامی کی وسعت - محدود بالحدود کرکے دکھلائی گئی ہیں - واد غیر ذی زرع - بکہ مبارکہ - بلداً امناً فاران - ارض بابل اپنی اپنی جگہ پر نمایاں ہیں - حضرت ابراہیمؑ کی تینوں بیبیوں حضرت ہاجرہ - حضرت سارا اور قطورا کی اولاد جہاں جہاں پھیلی وہ مختلف رنگوں سے قائم کردی گئی ہے -

نقشہ نمبر ۶ - ارض القرآن یہ عرب کے تجارتی کیفیت کا نقشہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں ظہور پذیر تھی - دوامی میلہ عکاظ کا راستہ اور ہر ماہ میں جگہ جگہ قیام مع تاریخوں کے دیا گیا ہے یعنی دومتہ الجندل بحرین - قریہ - دبا - صحار - عمان - شحر - شوق الرابیہ اوزال - عدن - ذوالمجاز - عکاظ اور شاہ راہ اعظم امام مبین کی لائن درج کی گئی ہے اور جو انبیائے تجارت مال و برآمد کے ذریعہ مختلف ممالک کے ساتھ تھی اس کی تفصیل ہے - اور آیہ (واذا راؤ تجارۃ) سورہ جمعہ کی مختصر جغرافی تفسیر ہے -

نقشہ نمبر ۷ - تاریخ اسلامی اس عرب اور عجم کے نقشہ میں فتوحات عرب بعہد مبارک حضرت رسالتمآب صلعم و بعہد مبارک حضرت خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم یعنی فتوح العرب - فتوح الشام فتوح العجم و مصر و ارمینیہ و قفقاز - و حدود فتوحات بزمانہ خلفائے امویہ

۹

مختلف رنگوں سے دکھلائے ہیں - نیز غزوات مخصوصہ مثلاً بدر - حنین - خیبر - ذات الرقاع - احُد تیماء - تبوک - مکہ و جنگہائے عظیم مثلاً اسکندریہ - ہیلیو پولس - بیت المقدس - صفین - قادسیہ - مدائن اُبلاّ - تستر - نہاوند - رے وغیرہ کے جائے وقوع معہ سنین کے درج ہیں -

نقشہ نمبر ۸ - تاریخ قبل از ظہور اسلام | دار الندوہ اور تقسیم کار بر مختلف قبایل کا دلچسپ پیرایہ میں چربہ اُتارا ہے -

نقشہ نمبر ۹ - تاریخ اسلام | مدینۃ المنصور یعنی بغداد قدیم کی رنگین تصویر - نیز صوبہ عراق اور بغداد مابعد کا نقشہ نئی ترکیب سے رنگین بنایا ہے یہ نمونہ ہے ان نقشوں کا جو ہر ایک بڑے اسلامی شہر کے تیار کئے جاوینگے -

نقشہ نمبر ۱۰ - تاریخ جدید | عرب اور روم اور حصہ بلقان کا نقشہ ہے جس میں عہد نامہ ورسَیل کے مطابق جو ممالک اسلامی کی تراش خراش کی گئی تھی وہ دکھلائی گئی ہے - اور حدود رنگین کے ذریعہ سے جو حصص سلطنت ترکیہ کے - شریف حسین - امیر فیصل اور امیر عبداللہ کو دئے گئے وہ اور جس قدر حصہ فرانس - برٹش یونان اور اٹلی والوں کو ملا تھا وہ علحدہ دکھلایا گیا ہے - نیز صوبہ قفقاز کی جمہوری ریاستیں نمایاں کی گئی ہیں - یہ نمونہ ہے ان نقشوں کا جو جدید اسلامی تاریخ کے متعلق تیار کئے جارہے ہیں - اگر یہ نقشے چھپ گئے تو علاوہ نادر الوجود اور مفید ہونے کے مکانوں کی زیبائش کا بھی کام دینگے - پورا سٹ پچاس نقشوں کا ہوگا جو تاریخ اسلام کے ضروری حصص کو مشرح کرنے میں یقین ہے کہ کارآمد ہوں گے فقط

پروفیسر **جلال** - الیف آر جی ایس)
لکچرار تاریخ وجغرافیہ وجغرافیہ تاریخی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

لیکچر نمبر ۲۳

تعلیم اور قرآن

(خواجہ غلام الحسنین صاحب۔ پانی پت ضلع کرنال)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ [علق ۹۶: ۱-۵]

تمہید جناب صدر و معزز حاضرین! اول جناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (بالقابہ) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب ممدوح نے اس جلسہ میں مجھے تقریر کا موقع دیا اس کے بعد عرض کرتا ہوں کہ جناب مولانا و مقتدانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ (مجتہد العصر) کی فرمائش سے ایک لیکچر بزبان انگریزی "اسلام اور توحید" (Islam and Divine Unity) کے عنوان سے مدرسۃ الواعظین کے لئے قلمبند کیا تھا۔ یہ وہی مدرسہ ہے جس کو جناب آنریبل راجہ صاحب محمود آباد (بالقابہ) نے لکھنؤ میں جاری کیا ہے۔

تقریر کا موضوع حضرات! میرے لئے یہ بات آسان تھی کہ وہی لیکچر آپ صاحبوں کو سنا دوں۔ مگر اول تو انگریزی تقریر سے تمام سامعین فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ دوسرے وہ لیکچر بہت طولانی ہے۔ تیسرے اس کا مضمون کانفرنس کے مقررہ مضامین سے کسی قدر جدا گانہ ہے اس لئے اس کا سنانا ملتوی کرتا ہوں۔ چونکہ امسال کانفرنس میں تعلیمی لیکچر ہو رہے ہیں اور بڑے بڑے ماہرین تعلیم دور دور سے لیکچر دینے کے لئے بلائے گئے ہیں۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے بیان کو ان کے بیانات کے سلسلہ میں منسلک کر دوں۔ لہذا میرے بیان کا عنوان "تعلیم اور قرآن" ہوگا۔

ترجمہ آیات جن آیات سے میں نے تقریر کو شروع کیا تھا وہ سب سے پہلی وحی ہے جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) پر غار حرا میں نازل ہوئی تھی۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

(اے پیغمبرؐ!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو۔ جس نے (کل مخلوقات کو)
پیدا کیا۔ جس نے انسان کو علقہ (گوشت کے لوتھڑے) سے بنایا۔ پڑھو اور
تمہارا پروردگار ایسا کریم ہے کہ اُس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ اور
انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اُس کو معلوم نہ تھیں"

آیات مذکورہ بالا کی معجز جامعیت

یہ قدرت کلام الٰہی کے سوا کسی اور کلام میں نہیں ہو سکتی کہ چند الفاظ نے تمام علوم موجودہ و تحقیقات آیندہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ ان میں سے چند مطالب کی طرف میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

۱۔ تعلیم و تعلم کی فضیلت۔ اور انسان سے ان دونوں چیزوں کی خصوصیت۔
۲۔ پروردگار کا خالق عالم ہونا۔
۳۔ انسان کی ابتدائی حالت اور اُس کا اشرف المخلوقات ہونا۔
۴۔ خداوند کریم کا احسان خاص کہ اُس نے انسان کو علم جیسی نعمت سے مالامال کیا۔
۵۔ تعلیم کی دو قسمیں (الف) کتابی یا اکتسابی (ب) فطری یا الہامی۔
۶۔ تعلیم اکتسابی کا دوسرے لوگوں سے یا ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ سے حاصل ہونا۔
۷۔ تعلیم اکتسابی کا خاص ذریعہ یعنی تحریر اور کتابت۔ جس کو قرآن نے تعلیم بالقلم کے نام سے تعبیر کیا ہے۔
۸۔ اشاعت علوم کے دو خاص ذریعے۔ قرأت و کتابت یعنی پڑھنا اور لکھنا۔
۹۔ قوت گویائی کی طرح لکھنے پڑھنے کی قابلیت کا بھی انسان کے ساتھ مخصوص ہونا۔
۱۰۔ فطری الہام سے ایک حد تک ہر انسان کا فیضیاب ہونا۔
۱۱۔ انسانی ترقی کا کسی خاص حد تک محدود نہ ہونا۔
۱۲۔ سلسلۂ تعلیم کا وحی الٰہی کے ذریعہ سے جاری ہونا اور انبیا کا اکتسابی تعلیم سے مستغنی ہونا

علم اور تعلیم کی خاص وقعت

ان آیات سے علم اور تعلیم کی وقعت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ کتابی تعلیم کے ذریعہ سے پچھلی نسلوں کے علمی کارنامے اور ان کی معلومات کے خزانے اگلی نسلوں تک پہنچتے رہتے ہیں (جس میں چھاپہ کی ایجاد نے بہت مدد دی ہے) اور اس تعلیم کا اثر زبانی تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور پائدار ہوتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے تعلیم بالقلم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

قرآن اور مطالعہ کائنات

صحیفۂ فطرت کا مطالعہ اور مناظر قدرت کا مشاہدہ ہی علمی ترقی کے ذریعے اور تمام علوم کی بنیاد ہیں۔ اور جس موثر پیرایہ میں قرآن مجید نے اس مضمون پر زور دیا ہے اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ یہ بیان کسی ایک آدھ مقام پر نہیں بلکہ تمام قرآن اس سے مالامال ہے۔ اور یہ تعلیم اس کے ہر ایک پارہ بلکہ ہر ایک رکوع میں جواہرات کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آیت ملاحظہ ہو۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ [بقرہ ۲:۱۵۹]

"درحقیقت آسمان و زمین کی پیدائش میں۔ رات اور دن کے اول بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کو فائدہ پہونچانیوالی چیزیں (یعنی مال تجارت) لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور بارش میں جس کو خدا آسمان سے برساتا ہے۔ پھر اس سے زمین کو اسکی موت (یعنی افتادہ پڑے رہنے) کے بعد دوبارہ زندہ (یعنی سرسبز و شاداب) کرتا ہے اور ہر قسم کے جانداروں میں جو خدا نے زمین میں پھیلائے ہیں اور ہواؤں کے ادھر اُدھر پھرنے میں اور ابر میں جو آسمان و زمین کے درمیان خدا کے حکم سے گھرا رہتا ہے (ان سب چیزوں میں) ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں (قدرت خدا کی) بہت ہی نشانیاں ہیں۔"

قدرت الٰہی کے دس نشان

اس ایک آیت میں اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے دس نشانات بیان کر کے کل علوم کی طرف اشارے کئے ہیں۔

۱۔ آسمانوں کی پیدائش (علم ہیئت و فلکیات)

۲۔ زمین کی پیدائش (علم طبقات الارض و جمادات و نباتات و حیوانات وغیرہ)

۳۔ شب و روز کا رد و بدل۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا آنا (جغرافیہ طبعی وغیرہ)

۴۔ جہازوں کا سمندر میں چلنا (علم جہازرانی و انجنیری و مدوجزر وغیرہ)

۵۔ بحری سفر سے لوگوں کا طرح طرح کے فائدے حاصل کرنا (علم تجارت و معاش)

۶۔ بارش کا بلندی کی طرف سے پستی کی طرف نازل ہونا (علم موسم و آب و ہوا وغیرہ)

۷۔ آب باران سے مردہ زمین کا زندہ ہونا اور طرح طرح کے نباتات یعنی غلہ، ترکاری

گھاس ۔ چارا ۔ پھل پھول وغیرہ کا اس سے پیدا ہونا (علم نباتات وغیرہ)
۸۔ چھوٹے سے چھوٹے جاندار سے لے کر بڑے سے بڑے جاندار تک ہر قسم کے حیوانات کا زمین پر پھیلانا (علم حیوانات)
۹۔ ہواؤں کا ہیر پھیر ۔ کبھی شرقی ۔ کبھی غربی ۔ کبھی جنوبی ۔ کبھی شمالی ہوا کا چلنا ۔ (حفظ صحت علم ہوا ۔ تجارتی ہوائیں وغیرہ)
۱۰۔ ابر کا آسمان و زمین کے درمیان گھرا رہنا اور حکم خدا سے مناسب وقت میں مناسب مقام پر برسنا (علم برق و باد و باران وغیرہ)

اس قسم کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید تمام موجودات عالم کو موجد عالم کی معرفت کا ذریعہ قرار دیکر چھوٹی بڑی ۔ ادنیٰ اعلیٰ ہر شے کو اس کے علم ۔ اس کی حکمت ۔ اور اس کی قدرت کی دلیل بتاتا ہے ۔ اور عقل خدا داد سے کام لینے کی جا بجا ہدایت و تاکید فرماتا ہے یہی ایک آیت تمام علوم پر حاوی ہے اور کوئی علم اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہے ۔

جسمانی تربیت اور تاریخ و جغرافیہ پر لکچر

آج صبح اسی ہال میں جناب صدر (مسٹر عبداللہ یوسف علی صاحب (بالقابہ) نے نہایت خوبی سے جسمانی تربیت کی اہمیت اور اس کے فوائد بیان کر کے عقلی تربیت کے ساتھ اس کا تعلق بتایا تھا ۔ اور دیگر مقررین نے تاریخ اور جغرافیہ کی ضرورت اور ان علوم کے مقصد اور طریقہ تعلیم کو بیان کیا تھا میرے بیان سے آپ صاحبوں کو یہ بات تو معلوم ہوئی کہ قرآن مجید تمام علوم کا زبردست حامی ہے کیونکہ یہی علوم عقل انسانی کو ترقی دیکر معرفت الٰہی تک پہنچاتے ہیں ۔ اب میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ بالخصوص ان تینوں علوم کی بابت قرآن مجید نے کیا ارشاد فرمایا ہے ۔

جسمانی تربیت

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کے بعد جب جالوت بادشاہ بنی اسرائیل پر ظلم کرنے لگا تو سرداران بنی اسرائیل نے اپنے زمانہ کے پیغمبر حضرت سموئیل (علیہ السلام) سے درخواست کی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے آپؑ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے ۔ سرداروں نے اعتراض کیا کہ وہ ہم پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے ؟ اس سے زیادہ حکومت کے حقدار تو ہم لوگ ہیں ۔ وہ تو کچھ ایسا فارغ البال اور مالدار بھی نہیں ۔ پھر کیوں اس کو فوقیت دی جاتی ہے ۔ حضرت سموئیلؑ نے جو کچھ جواب دیا اس کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰـهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَـةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ	(پیغمبر نے) کہا کہ اللہ نے تم پر (حکومت کے لئے) اُس کو منتخب کیا ہے اور (مال میں نہیں تو نہ سہی) علم اور جسم میں اُس کو فراخی دی ہے اور اللہ جس کو چاہے اپنا ملک دے اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (بقرہ ۲: ۲۴۷)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے علم اور جسم کو مساوی عظمت دی ہے یعنی عقلی تربیت کے ساتھ جسمانی تربیت کو لازمی قرار دیا ہے۔ علمی ترقی کے ساتھ بدن کی صحت اور ورزش کو بھی ضروری بتایا ہے۔ غرضکہ جسم اور روح دونوں کی غور و پرداخت پر یکساں توجہ دلائی ہے اور کسی سے غفلت کرنا روا نہیں رکھا اور ان کے مقابلہ میں مال و دولت کی کوئی حقیقت نہیں سمجھی گئی۔

تاریخ اخلاقی و روحانی تربیت کے لئے تاریخ کا مطالعہ جس قدر ضروری ہے محتاج بیان نہیں قوموں کے حالات، ان کی ذاتی خصوصیات، ان کے عادات و اطوار، اُن کے عروج زوال کا فلسفہ، ان کے بننے اور بگڑنے کے اصول، غرضکہ دنیا کے تمام نشیب و فراز تاریخ ہی سے معلوم ہوتے ہیں اور اگلوں کی زندگی پچھلوں کے لئے عبرت اور ہدایت کا موجب ہوتی ہے۔ یوں تو قرآن مجید کا کوئی ورق بھی اس نصیحت سے خالی نہ ہوگا مگر اس وقت صرف ایک آیت پیش کرتا ہوں جس نے قصص القرآن کی حکمت اور فلسفۂ تاریخ کو چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے وہ آیت یہ ہے:۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝	"حقیقت میں عقل والوں کے لئے اُن (لوگوں) کے حالات میں بڑی عبرت (و نصیحت) ہے"

[یوسف ۱۲: ۱۱۱]

جغرافیہ علم جغرافیہ پر بھی قرآن مجید جا بجا توجہ دلاتا ہے اور اس کے حقائق پر غور و خوض کی تاکید کرتا ہے۔ تمثیلاً سورہ عبس کی آیات ذیل پیش کی جاتی ہیں:۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا	انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے بلندی کی طرف سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے زمین کو شق کیا (یعنی اس قابل بنایا کہ اس میں ہل چلایا جا سکے اور بیج کو سہی

وَّحَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّزَيْتُونًا وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ [عبس۸۰: ۲۴-۳۲]	طاقت دی کہ وہ زمین کو پھاڑ سکے) پھر ہم نے (سب کچھ) اس میں اگایا۔ غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا (اور یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدہ کے لئے"۔

ان آیات میں زمین کے **طبیعی حالات**۔ اس کے **اقسام**۔ اس کی **پیداوار**۔ **بارش** اور اس کے اسباب۔ بارش کا اثر۔ پانی سے زمین کی **آبپاشی**۔ انسان وحیوانات کی **خوراک** حیوانات کے **فوائد**۔ انسان کا **مدنی الطبع** ہونا وغیرہ امور پر غور وخوض کا حکم دیا گیا ہے اور یہی وہ باتیں ہیں جن سے علم جغرافیہ میں بحث ہوتی ہے۔

سائنس کی مذہبی حیثیت کی بابت حکیم ہربرٹ سپنسر کے خیالات

یہ خیال کہ سائنس کی تعلیم انسان کو بے دین یا کم از کم دین سے غافل کر دیتی ہے ایک مدت تک لوگوں کے دل میں جاگزیں رہا۔ اور اب بھی اکثر مسلمانوں کے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ مگر یہ خیال خام ہے جو قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے سے بآسانی دور ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر اس لطیف بحث کا بیان خاص کر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو سرتاج فلاسفۂ یورپ **حکیم ہربرٹ سپنسر** نے اپنی مشہور کتاب "**ایجوکیشن**" میں کی ہے۔ میں نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جو ۱۹۱۰ء میں "**فلسفۂ تعلیم**" کے نام سے چھپکر **انجمن ترقی اردو** کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ حکیم موصوف نے **سائنس کی مذہبی حیثیت** کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے[1]۔

"بیشک سائنس اُن توہمات کا دشمن ہے جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں نہ کہ اصلی وحقیقی مذہب کا جس کو یہ توہمات محض پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سا سائنس جو رائج ہے اس میں لا مذہبی کی روح غالب ہے مگر نہ اس سچے سائنس میں جو سطح سے گذر کر تہ تک پہونچ گیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ بہت لوگوں کا یہ خیال کہ سائنس لا مذہبی اور بے دینی کی تعلیم دیتا ہے محض غلط ہے

---

[1] چونکہ یہ لکچر بالکل زبانی اور بغیر کسی نوٹ کی مدد کے دیا گیا تھا۔ اس لئے تقریر کے وقت سپنسر کے خیالات کا خلاصہ مطلب بیان کر دیا تھا۔ اب اس لکچر کو قلمبند کرتے وقت "فلسفۂ تعلیم" سے اصل عبارت نقل کر دی گئی (غلام الحسنین)

سائنس کا لامذہبی کی تعلیم دینا تو ایک طرف رہا خود سائنس سے غفلت کرنی بیدینی ہے مخلوقات الٰہی جو ہمارے گرد وپیش موجود ہے اس کا مطالعہ نہ کرنا بیدینی ہے۔ ایک ادنیٰ مثال سے اس بات کو سمجھ لو۔ فرض کرو کہ بعض لوگ روزمرہ کسی مصنف کی تعریفوں کے پل باندھا کریں۔ فرض کرو مصنف کی جس قدر تعریفیں کی جائیں ان کا مضمون ہمیشہ یہی ہو کہ اس کی تصانیف کی دانائی، عظمت وجلالت اور خوبی ولطافت کا اعتراف کیا جائے۔ فرض کرو کہ جو لوگ اس طرح اس کی کتابوں کی صفت وثنا متواتر بیان کرتے رہتے ہیں وہ ان کتابوں کی صرف بیرونی صورت دیکھنے پر قناعت کریں اور ان کا مضمون سمجھنے کی کوشش تو الگ رہی کبھی ان کو کھول کر بھی نہ دیکھیں۔ بھلا ایسے آدمیوں کی تعریفوں کی (جو تحسین ناشناس" کا مصداق ہیں) ہم کو کیا قدر کرنی چاہئے؟ ان کی صداقت اور راستبازی کی نسبت ہم کو کیا خیال کرنا چاہئے؟ تاہم اگر چھوٹی چیزوں کا بڑی چیزوں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ موجودات عالم اور اس کی علت (خداتعالیٰ) کی نسبت بھی بنی نوع انسان کا طرز عمل عموماً اسی قسم کا ہے۔ نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ فقط اتنی ہی بات نہیں کہ وہ بغیر مطالعہ کے ان چیزوں کے پاس سے کترا کر نکل جاتے ہیں جن کو وہ روزمرہ نہایت عجیب وغریب بتلاتے ہیں بلکہ جو لوگ قدرت کے مشاہدہ میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، اکثر اوقات ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ فعل عبث میں اوقات ضائع کرتے ہیں۔ جو لوگ ان عجائبات میں عملی ذوق و شوق ظاہر کرتے ہیں، سچ مچ ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ پس ہم مکرر بیان کرتے ہیں کہ سائنس نہیں بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بیدینی ہے۔ سائنس کی محبت خاموش عبادت ہے یعنی جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان کی عظمت کو اور کنایتہً ان کی علت (خدا تعالیٰ) کی عظمت کو چپ چاپ تسلیم کرنا ہے۔ یہ صرف زبانی بندگی نہیں ہے بلکہ ایسی بندگی ہے جو افعال سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایسی اطاعت نہیں ہے جس میں صرف اقرار باللسان ہو۔ بلکہ ایسی اطاعت ہے جس میں تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان بھی شامل ہیں اور اس کا ثبوت وقت، غور وفکر اور محنت کو قربان کرنے سے ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آخر میں ہم سائنس کی ایک اور مذہبی ہیئت دکھاتے ہیں۔ وہ یہ کہ زندگی کے رازہائے سربستہ کے ساتھ ہم کو جو تعلق ہے اور خود اپنے نفس کا صحیح تصور سائنس ہی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ سائنس اُن تمام باتوں کو بتاتا ہے جن کا جاننا ممکن ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے اس حد کو بتاتا ہے جس سے آگے کا حال ہم کو کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔ سائنس ہم کو بطور اعتقاد کے یہ بات نہیں سکھاتا کہ علت العلل کی ماہیت کا سمجھنا محال ہے بلکہ ہر طرف اس سرحد پر پہنچا کر جس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہیں۔ اس امر کے محال ہونے کو کھلم کھلا ہم سے تسلیم کرا لیتا ہے سائنس اس بات کو برائے العین مشاہدہ کرا دیتا ہے اور کسی دوسرے طریقہ سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی کہ اُس ہستی کے آگے جو عقل انسانی سے بالاتر ہے عقل انسانی قاصر و عاجز ہے۔ سماعی روایات اور لوگوں کی اسناد کی طرف اُس کی روش شاید متکبرانہ ہو۔ مگر اُس پردہ اسرار کے آگے جس میں قادر علی الاطلاق چھپا ہوا ہے اور جس میں کوئی شخص باریاب نہیں ہو سکتا۔ اُس کی روش عاجزانہ ہے ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم | فروغِ تجلّی بسوزد پرم

پس سائنس کا کبر بھی سچا ہے اور انکسار بھی۔ صرف سائنس کا سچا عالم (اور اس لقب سے ہماری مراد اُس شخص سے نہیں ہے جو صرف فاصلوں کا اندازہ کرتا ہے یا مرکبات کی تحلیل کرتا ہے یا چیزوں کی نوعیں مقرر کرتا ہے بلکہ ہماری مراد اس شخص سے ہے جو ادنیٰ حقیقتوں کے ذریعہ سے اعلیٰ حقیقتوں کا اور آخر کار اعلیٰ ترین حقیقتوں کا سراغ لگاتا ہے) ہاں صرف سائنس کا پیرو عالم حقیقت میں یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ قادر مطلق کی قدرت جو سب چیزوں پر حاوی ہے نہ صرف انسانی علم بلکہ انسانی خیال و قیاس سے بھی کس قدر برتر ہے اور کائنات۔ حیات اور ادراک اسی قدرت کے کرشمے ہیں۔ سُبْحَانَهٗ مَا اَعْظَمَ شَانَهٗ ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم | وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر | ما ہم چناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

(فلسفۂ تعلیم صفحہ ۷۹-۸۴)

جدید تعلیم یافتہ حضرات کو ایک نصیحت

حضرات! یہ اُس شخص کے خیالات ہیں جس نے تمام عمر سائنس اور فلسفہ کے مطالعہ میں گزاری

تھی اور جو اس زمانہ کا سب سے بڑا عالم اور فلسفی ہوا ہے۔ اور جس کی بابت حکماء کا خیال ہے کہ اگر آج افلاطون زندہ ہوتا اور گذشتہ بائیس سو برس کی علمی ترقیوں سے واقف ہوتا تو بھی ہربرٹ سپنسر سے بہتر نہ لکھ سکتا۔ جو لوگ سائنس کی ابجد پڑھ کر ہمہ دانی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں اور قدرت کے رازہائے سربستہ کی گرہ اپنے ناخن تدبیر سے کھولنا چاہتے ہیں یا اسرارِ الہٰی کے عقدۂ پیچیدہ کو اپنی ناقص اور محدود عقل سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگوں کو ہربرٹ سپنسر کی اس رائے سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔

سائنس کی تعلیم کی بابت قرآن مجید کی تاکید

سائنس کی مذہبی حیثیت کی بابت یورپ کے سب سے بڑے عالم اور نامور حکیم نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بحیثیت اسلامی تعلیم ہے جو ہم کو تیرہ سو برس قبل دی گئی تھی جس سے ہم نے منہ پھیر لیا۔ میں نے "فلسفۂ تعلیم" میں اس مقام پر ایک حاشیہ لکھا تھا جس کی عبارت یہ ہے:-

"قرآن شریف میں سینکڑوں مقامات پر کائنات اور مخلوقات سے خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کی قدرت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اور جابجا انسان کو اس امر کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مظاہر قدرت کا بغور مطالعہ کر کے خدا تعالیٰ کی عظمت و جلالت کو سمجھے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے۔

(۱) اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۙ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران ۱۸۷-۱۸۸)	آسمان و زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے ردوبدل میں عقلمندوں کیلئے قدرت الٰہی کی نشانیاں موجود ہیں جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور بے اختیار بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس عالم کو بیفائدہ نہیں بنایا تیری ذات پاک ہے ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیو۔

سورہ نحل میں ہے۔

(۲) هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝ یُنْۢبِتُ لَکُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

[نحل ۱۰-۱۲]

وہی قادر مطلق ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس میں سے کچھ تمہارے پینے کا ہے اور اسی سے درخت پرورش پاتے ہیں جنہیں مویشیوں کو کھلاتے ہو۔ اسی پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس میں (قدرت خداوندی کا) ایک نشان ہے اور اسی نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو تمہارا تابع کر رکھا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے تمہارے فرمانبردار ہیں عقل والوں کے لئے ان چیزوں میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔

شیخ سعدیؒ نے قرآن شریف کے اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

قرآن شریف میں سینکڑوں آیتیں اس مضمون کی موجود ہیں۔ جن کو ہم بخوف طوالت اس مختصر نوٹ میں درج نہیں کر سکتے۔ جن سے ثابت ہے کہ خدا تعالےٰ نے موجودات قدرت کا علم (یعنی سائنس) کے حاصل کرنے کی انسان کو کس قدر تاکید کی ہے۔ پس مصنف کا یہ قول کہ "سائنس سے غفلت کرنی بیدینی ہے" بجائے خود درست ہے۔"

سائنس اور مذہب کے حدود

سائنس کے عالم اپنی تحقیقات میں مادیات سے آگے قدم نہیں رکھ سکتے۔ مثال کے طور پر کیمسٹری کو لو۔ اس علم میں مادہ کے کیمیائی تغیرات سے بحث ہوتی ہے۔ جن کی وجہ سے نئے نئے خواص والے مرکبات پیدا ہوتے ہیں۔ کیمیائی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ گندھک کے تیزاب میں تین عنصر پائے جاتے ہیں

ہائیڈروجن۔ گندھک اور آکسیجن۔ اور آب خالص میں باعتبار حجم کے آکسیجن کا ایک ذرہ اور ہائیڈروجن کے دو ذرے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں عنصر ایک دوسرے سے مختلف اور ان کے خواص بالکل جداگانہ ہیں مگر جبکہ وہ ایک اور دو کی نسبت سے باہم ملتے ہیں تو ایک مرکب یعنی پانی بن جاتا ہے۔ پانی کے خواص آکسیجن اور ہائیڈروجن کے خواص سے بالکل الگ ہیں۔ اسی طرح تمام عناصر جن کی تعداد اس وقت تک اسّی کے قریب دریافت ہو چکی ہے مختلف خواص رکھتے ہیں۔ اور یہی حالت تمام مادی مرکبات کی ہے جو عناصر کی مختلف ترکیبوں سے بنتے ہیں۔ مثلاً جمادات۔ نباتات۔ حیوانات وغیرہ اور ان کے بیشمار انواع و اقسام۔

یہ ہے وہ حد انتہائی جس سے آگے سائنس کی رسائی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سائنس کے عالموں کے پاس اس قسم کے سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے:۔

(۱) واحد مادہ سے متعدد عناصر کیونکر بن گئے؟

(۲) عناصر کے خواص میں اختلاف کس نے پیدا کر دیا؟

(۳) مرکبات میں مختلف عناصر کیونکر جمع ہوئے؟

(۴) عناصر کی باہمی نسبتیں کس طرح مختلف ہو گئیں؟

(۵) نسبتوں کے بدلنے سے جدید خواص والے مرکبات کس طرح پیدا ہو گئے؟

مگر مذہب کی حکومت سائنس کی حدود سے بہت آگے اور اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اس قسم کے سوالات کا جواب دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام موجودات عالم (عناصر ہوں یا مرکبات۔ ارواح ہوں یا اجسام) اور ان کے خواص اور افعال ایک۔ کامل بالذات علیم و حکیم و خبیر و قدیر کی مشیت کے تابع اور اسی کی مخلوق ہیں۔ جس کی حکمت و قدرت و صنعت کا کمال ذرہ سے لیکر آفتاب تک ہر شے میں نظر آتا ہے۔

مادہ عالم کے مخلوق ہونیکا ثبوت

میں اس مطلب کو ایک مثال کے ذریعہ سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اسٹریچی ہال جس میں بیٹھے ہوئے آپ میری تقریر سن رہے ہیں۔ اس کے فرش۔ چھت۔ دیواروں۔ دروازوں۔ کھڑکیوں۔ گیلریوں اور دوسرے حصوں اور اس کی مجموعی حیثیت کو دیکھ کر آپ فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جس انجنیر نے اس کا نقشہ تجویز کیا تھا وہ اپنے فن میں کامل تھا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر مٹی۔ پانی۔ چونا۔ لوہا۔ لکڑی۔ پتھر وغیرہ سامان عمارت موجود نہ ہو تو صرف انجنیر کی علمی قوت اور عقلی طاقت سے کوئی عمارت

نہیں بن سکتی۔ مثلاً اگر مٹی میں یہ خاصیت نہ ہوتی کہ پانی کے ملنے سے گارا بن جائے۔ گارا سانچہ میں ڈھل کر ایک مجسم مکعب کی صورت اختیار کرے اور بھٹے میں ایک خاص درجہ تک حرارت پہنچانے سے پختہ اینٹیں تیار ہو جائیں تو کسی انسان میں یہ قدرت نہیں تھی کہ ایک دیوار بھی قائم کر سکے۔ اسی طرح اگر مادہ کے ذرّوں میں کشش کیمیائی اور کشش اتصال موجود نہ ہوتی تو وہ بالکل الگ الگ رہتے۔ اور یہ گوناگوں مخلوقات کیونکر پیدا ہوتی؟ زمین۔ آسمان انسان۔ حیوان۔ جمادات۔ نباتات وغیرہ کوئی شے بھی وجود میں نہ آتی۔ عالم میں خاک دھول کے انبار اور گرد و غبار کے سوا اور کیا ہوتا؟ المختصر جو قدرت و حکمت آفتاب عالمتاب میں نظر آتی ہے وہی ایک ذرّہ میں بھی نظر آتی ہے اور جو باضابطگی عالم کی بڑی سے بڑی شے میں پائی جاتی ہے وہی باضابطگی ایک چھوٹی سی چھوٹی شے میں بھی پائی جاتی ہے۔ پس جس دلیل سے عقل سلیم نے آفتاب کو مخلوق ثابت کیا ہے وہی دلیل ایک ذرّہ کو بھی مخلوق ثابت کرتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ "آفتاب تو حادث اور مخلوق ہے مگر جن ذرّوں سے وہ بنا ہے وہ قدیم اور غیر مخلوق ہیں" تو یہ قول ایسا ہی لچر ہوگا جیسا یہ قول کہ "اسٹریچی ہال تو بے بنائے نہیں بنا مگر اس کی اینٹیں خود بخود بنی ہوئی موجود تھیں اور کوئی ان کا بنانے والا نہیں تھا" یہ ذرّے جن کو ایٹمز (Atoms) یا اجزائے لایتجزیٰ کہتے ہیں وہی اینٹیں ہیں جن پر اس عالم کی عمارت قائم ہے۔ اگر کسی مکان کی اینٹیں خود بخود نہیں بن سکتیں تو یہ ذرّے بھی خود بخود موجود نہیں ہو سکتے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اینٹ کا بنانے والا ایک محدود العلم اور محدود القدرت انسان ہے جو مٹی کی خدا داد خاصیتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر ایٹم کا خالق وہی غیر محدود علم و قدرت والا ہے جس نے تمام عالم کو پیدا کیا ہے جو سب کا حاکم۔ سب کا مالک اور سب کا نگہبان ہے۔ اس مطلب پر قرآن مجید نئے نئے عنوانوں سے روشنی ڈالتا ہے۔ چند آیات بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔

(۱) هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ [زمر ۳۹: ۶] "وہ واحد (اور) بڑا زبردست خدا ہے"۔

(۲) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ "اللہ ہر شے کا خالق ہے اور وہی ہر شے کا

ف۱ برادر مرحوم آنریبل مولوی خواجہ غلام الثقلین نے "حدوث مادہ" کے چاروں حصوں میں مادہ کے مخلوق اور حادث ہونے کے متعلق نہایت عمدہ اور لطیف بحث کی ہے اور مادیئین کے کل اعتراضات کے معقول اور عالمانہ جوابات دیے ہیں جو لوگ اس بحث کو مکمل دیکھنا چاہیں وہ کتاب مذکور کی طرف رجوع کریں۔ (غلام الحسنین)

شَیْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ [زمر ۳۹: ۶۳] نگہبان ہے"۔

(۳) وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ [بقرہ ۲: ۲۸۲] "اور اللہ ہر شے کا پورا پورا عالم ہے"

(۴) وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ [بقرہ ۲: ۲۸۴] "اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا (قادر مطلق) ہے"

(۵) وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ [مجادلہ ۵۸: ۶] "اور اللہ ہر شے کا نگراں ہے"

تقسیم علوم وقت تو ختم ہو گیا مگر جناب صدر کی اجازت سے ایک بات اور بیان کر کے اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ یعنی تمام علوم جن کی تحصیل پر قرآن مجید نے اس قدر زور دیا ہے اُن کی تقسیم کس طرح ہے؟ ایک حدیث نبوی نے ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْيَانِ "علم دو قسم کے ہیں علم ابدان (مادی علوم) اور علم ادیان (روحانی علوم)"

مادی علوم مادی علوم حساب۔ جغرافیہ۔ ہندسہ وغیرہ تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں سائنس کی تمام شاخیں شامل ہیں۔ مثلاً:-

(الف) جی الوجی یعنی علم طبقات الارض
(ب) باٹنی یعنی علم نباتات
(ج) زوآلوجی یعنی علم حیوانات
(د) فزکس یعنی علم طبیعات
(ہ) کیمسٹری یعنی علم کیمیا
(و) اکونامکس یعنی علم اقتصادیات
(ز) مکینکس یعنی علم جر ثقیل
(ح) اسٹرانومی یعنی علم ہیئت
(ط) اناٹمی یعنی علم تشریح
(ی) فزیالوجی یعنی علم افعال الاعضاء
(ک) سرجری یعنی علم جراحی
(ل) مڈیسن یعنی علم طب

روحانی علوم روحانی علوم میں علم کلام اور الٰہیات کے تمام مسائل شامل ہیں جیسے۔

۱- خدا کا وجود
۲- خدا کی توحید
۳- خدا کی صفات
۴- نبوت
۵- معاد
۶- عبادات و معاملات
۷- اخلاق و آداب
۸- حقوق و فرائض
۹- تمدن و معاشرت وغیرہ وغیرہ۔

ان مسائل پر عقلی و نقلی حیثیت سے نظر کی جاتی ہے۔ اور تمام ادیان کے خیالات سے بھی بحث کیجاتی ہے

خلاصۂ تقریر میری تقریر کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ قرآن مجید نہایت تاکید کے ساتھ تمام علوم کی تحصیل کا حکم دیتا ہے اور دنیوی اور مادی علوم کو دینی و روحانی علوم کا وسیلہ اور معرفت الٰہی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنی حالت اور حیثیت اور طبیعی مناسبت کے لحاظ سے حتی الامکان دونوں قسم کے علوم حاصل کر کے دنیا و عقبیٰ میں کامیاب ہو۔ مگر طرح طرح کی لغزشوں سے محفوظ رہنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ علوم کا مطالعہ کتابِ مبین (قرآن) کی روشنی میں کیا جائے کیونکہ یہی وہ بے عدیل قندیل ہے جس کی مدد سے دنیا کی تاریک اور دشوار گذار گھاٹی کو عبور کر سکتے ہیں۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ[1]

پانی پت
۰ جنوری ۱۹۲۴ء
(شنبہ)

خادم علم و دین
خاکسار غلام الحسنین پانی پتی نجفی

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس نور اور کتاب روشن آچکی ہے (مائدہ ۵: ۱۸)

ضمیمہ اوّل

فہرست اصحاب جنھوں نے تعلیمی نمائش میں نادر کتابیں بھیجیں

۱	نواب سالار جنگ بہادر	حیدرآباد	۴ کتب
۲	مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت	حیدرآباد	قلمی کتابات
۳	کتب خانہ حبیب گنج	حبیب گنج ضلع علی گڑھ	نادرالوجود قلمی کتابیں اور کتبات
۴	نواب صاحب کنجپورہ	کنجپورہ ضلع کرنال	قدیم قلمی کتب عربی و فارسی
۵	مولوی بشیرالدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول	اٹاوہ	قلمی کتب و فرامین شاہی
۶	سید احسن شاہ صاحب تحصیلدار	علی گڑھ	قرآن مجید اور کتبات
۷	حافظ شرافت اللہ صاحب	علی گڑھ	نہایت نادر قدیم کتبات
۸	میر ذوالفقار حسین صاحب	علی گڑھ	قلمی قرآن مجید، نادرالوجود کتبات
۹	آغا حیدر حسن صاحب	آشیانہ باغ ظفر جنگ سیف آباد	اردو کی سب سے قدیم نثر کا مجموعہ ایک قدیم فارسی فرہنگ
۱۰	محمد عزیز خاں صاحب	حیدرآباد	ایک کتاب
۱۱	مولوی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار	لاہور	۵ کتب
۱۲	سید عبدالغنی صاحب	نلگنڈہ ریاست حیدرآباد	۸ کتب
۱۳	مطبع نولکشور	لکھنؤ	متعدد کتب
۱۴	سید محمد الدین صاحب ٹونکی	بھوپال	۴ کتابیں
۱۵	کتب خانہ	"	متعدد کتابیں
۱۶	دائرہ ادبیہ	لکھنؤ	
۱۷	مولوی سلامت اللہ صاحب	گونڈہ	سلسلہ ابتدائی درس قرآن مجید
۱۸	للو مل مدرس بی۔ ڈی۔ ہائی اسکول	انبالہ	دلچسپ حساب
۱۹	نیاز محمد خاں صاحب	نارمل اسکول الہ آباد	نقشہ و کتب
۲۰	برزورجی صاحب	بمبئی	کتابیں
۲۱	برج موہن سروپ صاحب ماسٹر	ضلع بجنور	نخود و گندم پر کلمہ
۲۲	رائے صاحب گلاب سنگھ وپسران	لاہور	چارٹ دیسی ورزش

ضمیمہ دوم

فہرست مدارس جنھوں نے تعلیمی نمائش میں سامان بھیجا

نمبر شمار	نام صوبہ	نام مدرسہ معہ مقام	قسم سامان
۱	ممالک متحدہ	گورنمنٹ لیدر ورکنگ اسکول کانپور	اشیاء چمڑا
۲	"	گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور	نقشہ جات
۳	"	ویونگ اسکول مظفرنگر	کمل
۴	"	ڈی، اے، وی ہائی اسکول الہ آباد	نقشہ
۵	"	ڈبلو، آئی، ایم ہائی سکول بریلی	ڈرائنگ
۶	"	گورنمنٹ آرٹ اینڈ کرافٹ اسکول لکھنؤ	مختلف نمونے
۷	"	کانیکبج اینڈ سٹریل کالج "	نقشہ جات
۸	"	ڈی اے وی ہائی سکول "	نقشہ و چارٹ
۹	"	مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڑھ	نقشہ جات و ماڈل
۱۰	"	مسلم یونیورسٹی اسکول "	پینٹنگ و ڈرائنگ
۱۱	"	گورنمنٹ ہائی اسکول "	ڈرائنگ
۱۲	"	برج بہاری لال صاحب مصور علی گڑھ	تصاویر
۱۳	"	جی اے اسکول باندہ	ڈرائنگ
۱۴	"	گورنمنٹ اسکول گونڈہ	"
۱۵	"	گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج مرادآباد	"
۱۶	"	گورنمنٹ ہائی سکول ہاتھرس	تصاویر
۱۷	"	" انٹرمیڈیٹ کالج فیض آباد	نقشہ

نمبر شمار	نام صوبہ	نام مدرسہ معہ مقام		قسم سامان
۱۸	ممالک متحدہ	گورنمنٹ ٹریننگ کالج	آگرہ	نقشہ جات
۱۹	"	ہر نراین دی اسکول	سندیلہ ضلع ہردوئی	ڈرائنگ
۲۰	"	گورنمنٹ ہائی اسکول،	ہاپوڑ ضلع میرٹھ	"
۲۱	"	انٹرمیڈیٹ کالج	چندوسی ضلع مرادآباد	" ونقشہ جات
۲۲	"	ہالمر ویونگ اسکول	شاہجہانپور	کپڑا
۲۳	"	کانون ہائی اسکول	محمود آباد ضلع سیتاپور	نقشہ جات
۲۴	"	گورنمنٹ ہائی اسکول	بدایوں	" وتصاویر
۲۵	"	ٹامسن کالج	روڑکی	نقشہ ریل
۲۶	"	سٹی ہائی اسکول	غازیپور	نقشہ وتصاویر
۲۷	"	راجپوت ہائی سکول	پہاسو ضلع علی گڑھ	"
۲۸	"	اسلامیہ ہائی سکول	اٹاوہ	کتب
۲۹	"	زنانہ اسکول	آگرہ	مختلف اشیاء
۳۰	"	اسلامیہ ہائی سکول	بدایوں	نقشہ جات ڈرائنگ
۳۱	"	حلیم مسلم ہائی سکول	کانپور	ڈرائنگ
۳۲	"	شعیب محمدیہ ہائی سکول	آگرہ	نقشہ جات
۳۳	پنجاب	بیگم آرا بیوہ راجہ احمد خاں مرحوم	گجرات	سلمہ کا کام
۳۴	"	ڈی پی ہارڈنگ ٹیکنکل اسکول	لائلپور	لکڑی کا کام
۳۵	"	گورنمنٹ ہائی سکول	شملہ	اشیاء ڈرائنگ وٹیکنیکل ٹریننگ
۳۶	"	" ٹریننگ کالج	لاہور	
۳۷	"	" ریلوے ٹیکنیکل سکول	"	ڈرائنگ
۳۸	"	ایس کھوسلا	"	نقشہ
۳۹	"	ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم	"	چارٹ
۴۰	"	ڈرائنگ ماسٹر مڈل سکول	ہنوکی ضلع لاہور	تصاویر
۴۱	"	ایگریکلچرل اسکول بمبئی	"	زرعی پیداوار

نمبر شمار	نام صوبہ	نام مدرسہ معہ مقام		قسم سامان
۴۲	پنجاب	گورنمنٹ ہائی و نارمل سکول	ملتان	مصنوعات
۴۳	"	انڈسٹریل مڈل سکول	"	"
۴۴	"	گورنمنٹ ہائی سکول	انبالہ	ڈرائنگ
۴۵	"	مشن ہائی سکول	"	"
۴۶	"	بی ڈی ہائی سکول	"	نقشہ
۴۷	"	کارپنٹری کلاس راجہ ساسی مڈل سکول	امرتسر	لکڑی کی چیزیں
۴۸	"	ڈی جی ہائی سکول	جرانوالہ	ڈرائنگ
۴۹	"	گورنمنٹ ہائی و نارمل سکول	رہتک	کاپیاں
۵۰	"	اسلامیہ ہائی سکول	راولپنڈی	ڈرائنگ
۵۱	"	ہرتری ہائی سکول	مظفر گڈھ	مصنوعات
۵۲	"	ہائی سکول	اکال گڑھ	نقشہ
۵۳	مدراس	میسرز آر اینڈ سنز	مدراس	آلات ریاضی
۵۴	بمبئی	بلک آفس	کراچی	اسکول بیج

گوشوارہ صوبہ وار

نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد مدارس
۱	ممالک متحدہ آگرہ و اودھ	۳۲
۲	پنجاب	۲۰
۳	مدراس	۱
۴	بمبئی	۱
	میزان	۵۴

ضمیمہ سوم

فہرست تعلیمی نمائش میں انعام پانے والوں کی

نمبر شمار	نام		بابت	رقم روپیہ	آنہ	پائی
۱	قاضی جلال الدین صاحب لکچرر مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	نقشہ ارض القرآن	۱۰		
۲	محمد حنیف احمد طالب علم انٹرمیڈیٹ کالج	״	نقشہ ہندوستان اور لڑائی کے میدان	۶		
۳	حفیظ الرحمن طالب علم انٹرمیڈیٹ کالج	״	نقشہ سلطنت مرہٹہ	۴		
۴	انوار احمد طالب علم مسلم یونیورسٹی برانچ سکول	״	نقشہ	۵		
۵	تیج بہادر طالب علم درجہ ہشتم گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج	اٹاوہ	خوشنویسی انگریزی	۳		
۶	بانو دت ״ ״ ״ ״	״	״ ہندی	۳		
۷	اوما شنکر طالب علم درجہ دہم دھرم سماج ہائی سکول	علی گڑھ	״ اردو	۳		
۸	افتخار علی طالب علم درجہ نہم مسلم یونیورسٹی برانچ سکول	״	״ ״	۳		
۹	شبیر حسین اول طالب علم درجہ ہفتم ״	״	״ عربی	۳		
۱۰	جمعیت الرحمن طالب علم درجہ دہم انٹرمیڈیٹ کالج	״	جنرل پینٹنگ	۱۰		
۱۱	سید فضل رب طالب علم درجہ ہشتم بی مسلم یونیورسٹی سکول	״	״	۹		
۱۲	واحد حسین خاں طالب علم درجہ نہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی	״	״	۸		
۱۳	محمد فاروق ״ ״ ״ ״	״	״	۷		
۱۴	طفیل احمد خاں طالبعلم درجہ ہشتم مسلم یونیورسٹی سکول	״	جنرل ڈرائنگ	۸		
۱۵	آر بی سری واستو طالبعلم گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج	اٹاوہ	״	۷		
۱۶	شیام بہاری لال طالبعلم گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج	״	״	۶		
۱۷	جانکی پرشاد شرما طالب علم درجہ دہم دھرم سماج ہائی سکول	علی گڑھ	ڈرائنگ	۵		
۱۸	سید احمد طالب علم درجہ ہشتم مسلم یونیورسٹی سکول	״	״	۴		
۱۹	مقصود شاہ طالب علم درجہ ہفتم بی مسلم یونیورسٹی سکول	״	״	۴		

نمبر شمار	نام		بابت	دفعہ پائی	آنہ	روپیہ
۲۰	خواجہ مقصود شاہ طالبعلم درجہ ہفتم مسلم یونیورسٹی سکول	علی گڑھ	ڈرائنگ			۴
۲۱	نور الحسن طالبعلم درجہ ہشتم گورنمنٹ ہائی سکول	"	"			۳
۲۲	دیال چند طالبعلم درجہ نہم "	راولپنڈی	"			۲
۲۳	ارجن سنگھ طالب علم درجہ ہشتم "	"	لکڑی کا تعلیمی کام			۴
۲۴	ارجن سنگھ طالبعلم درجہ ہشتم گورنمنٹ نارمل ٹریننگ	"	"			۲
۲۵	محمد یسین طالبعلم درجہ ہشتم مسلم یونیورسٹی برانچ اسکول	علی گڑھ	سوتی کام			۵
۲۶	محمد حنیف طالبعلم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی	"	نقشہ			۵
۲۷	موتی لال طالب علم انٹرمیڈیٹ کالج	اٹاوہ	"			۸
۲۸	محمد یونس طالبعلم مسلم یونیورسٹی برانچ اسکول	علی گڑھ	"			۴
۲۹	ظہور احمد طالبعلم درجہ دہم انٹرمیڈیٹ کالج	"	"			۳
۳۰	فضل رب طالبعلم مسلم یونیورسٹی اسکول	"	"			۴
۳۱	طاہر حسین طالبعلم درجہ ششم مسلم یونیورسٹی سکول	"	"			۳
۳۲	محمد رفیق طالب علم درجہ پنجم مسلم یونیورسٹی برانچ سکول	"	"			۳
۳۳	ہزاری لال طالب علم انٹرمیڈیٹ کالج	چندوسی	نقشہ ہندوستان سنہ ۱۳۱۸			۴
۳۴	ہربرشاد "	"	" سنہ ۱۶۰۵			۴
۳۵	رگھناتھ پرشاد طالب علم کانیکبج کالج	لکھنؤ	چارٹ تواریخ ہند			۷
۳۶	شیو درشن چکرورتی "	"	ڈرائنگ			۳
۳۷	سید محمد عبد المغنی بخاری طالبعلم ضلع اسکول	گونڈہ	"			۵
۳۸	فیاض حسین طالب علم اسلامیہ ہائی سکول	بدایوں	"			۴
۳۹	عبد الاول " "	"	نقشہ			۳
۴۰	عطاء اللہ	"	"			۳
۴۱	جگ جیون سنگھ طالب علم گورنمنٹ ہائی سکول	ہاتھرس	ڈرائنگ			۴
۴۲	ہاشم حسین طالب علم ولیو آئی ایم ہائی سکول	بریلی	"			۴
۴۳	مشکور علی خاں طالب علم مسلم راجپوت اسکول	پہاسو اسٹیٹ	"			۴

نمبر شمار	نام		بابت	دفتر روپیہ	آنہ	پائی
۴۴	صدیق احمد طالب علم حلیم مسلم ہائی سکول	کانپور	ڈرائنگ	۴		
۴۵	عبد الرؤف طالب علم گورنمنٹ ہائی سکول	شملہ	لکڑی کا تعلیمی کام	۳		
۴۶	عبد العزیز طالب علم درجہ دوم انڈسٹریل سکول	ملتان	آہنی کام	۵		
۴۷	عبد الحق 〃 درجہ پنجم 〃	〃	〃	۸		
۴۸	نذیر الدین 〃 تھرڈ مڈل 〃	〃	لکڑی کا نقشی کام	۵		
۴۹	غلام رسول طالب علم فرسٹ مڈل 〃	〃	لکڑی کا کام	۸		
۵۰	دھیان سنگھ طالب علم گورنمنٹ ہائی سکول	ہاپوڑ	نقشہ	۴		
۵۱	اللہ مہر 〃	〃	〃	۲		
۵۲	ایل گنیش داس طالب العلم ہیر تری ہائی اسکول	لیہ ضلع مظفر گڈھ	ہڈی کا کام	۵		
۵۳	بنارسی داس طالب علم ہائی سکول	انبالہ	نقشہ	۴		
۵۴	ولایت حسین طالب علم درجہ دہم ہائی سکول	فتحگڈھ	〃	۴		
۵۵	مظہر علی طالب علم درجہ دہم شیعیہ ہائی سکول	آگرہ	〃	۵		
۵۶	منظور علی 〃 درجہ ہشتم 〃	〃	〃	۴		
۵۷	محمد عزیز طالب علم درجہ دہم ہائی سکول	اکالگڈھ پنجاب	〃	۶		
۵۸	ڈی ڈی مہتا 〃 ڈی اے وی ہائی سکول	لکھنؤ	〃	۴		
۵۹	قیوم احمد طالب علم درجہ ہفتم اسلامیہ ہائی سکول	اٹاوہ	〃	۵		
۶۰	طاہر حسین 〃 درجہ پنجم 〃	〃	ڈرائنگ	۳		
۶۱	صغیرہ بی بی		زنانہ نمائش	۶		
			میزان	۲۸۷		

ضمیمہ چہارم

فہرست زنانہ نمائش میں تمغے اور انعامات پانے والوں کی

نمبر شمار	نام	بابت	انعام
۱	گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول حیدرآباد دکن	مصنوعات پیش کردہ	تمغہ طلائی
۲	سلطانیہ زنانہ ہائی اسکول بھوپال	〃	〃
۳	مدرسہ بلقیسیہ بھوپال	〃	تمغہ نقرئی
۴	محبوبیہ زنانہ اسکول حیدرآباد	〃	〃
۵	مسلم زنانہ اسکول لکھنؤ	〃	〃
۶	〃 علی گڑھ	〃	〃
۷	بیگم صاحبہ شیخ محمد نذیر صاحب بھیرہ	〃	〃
۸	زینب بی بی صاحبہ دختر ڈاکٹر ولی محمد صاحب علی گڑھ	〃	〃
۹	احمدی بیگم صاحبہ مسلم گرلس اسکول لکھنؤ	نیٹنگ	〃
۱۰	فاطمہ صاحبہ حیدرآباد	پینٹنگ	〃
۱۱	حیدرآباد	ڈرائنگ مع سوئی کا کام	〃
۱۲	زنانہ ہائی اسکول حیدرآباد	سوزن کاری	〃
۱۳	قدسیہ گرلس اسکول لکھنؤ	سلائی کا کام	مبلغ ۵ر
۱۴	حامدہ بیگم صاحبہ سہارنپور	〃	[illegible]
۱۵	س ...... سلطانیہ گرلس اسکول بھوپال	۔	سرٹیفکیٹ
۱۶	بلقیسیہ گرلس اسکول بھوپال	فیتہ کا کام	〃
۱۷	نورجہاں صاحبہ رائے پور	سنہری لیس کا کام	〃
۱۸	زنانہ ہائی اسکول نارپولی	گڑیا کے کپڑے	〃
۱۹	کنیز عباس صاحبہ مسلم گرلس اسکول لکھنؤ	نقشہ کشی	〃
۲۰	صغیرہ بی بی دختر سید عبدالباقی چیف اکونٹنٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	〃	〃

رپورٹ کانفرنس کی مختلف جلدوں کی کیفیت

اس سال کانفرنس کے ساتھ چونکہ تعلیمی نمائش تھی اور اس میں تعلیمی لکچر بھی دئے گئے تھے اس لئے رپورٹ زیادہ ضخیم ہوجانے کی وجہ سے اس کو متعدد جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جلد اوّل و دوم یکجائی - جلد اوّل میں کل اجلاسوں کی روئداد اردو میں ہی اور جلد دوم میں وہ تعلیمی لکچر ہیں جو اُردو زبان میں جن کی تعداد ۲۳ ہے دئے گئے دونوں جلدوں کی یکجائی قیمت عہ ؍ ہی۔

جلد دوم علیحدہ - تنہا جلد دوم میں وہ تعلیمی لکچر اردو زبان میں ہیں جن کا تذکرہ اوپر ہوا قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

جلد سوم - انگریزی میں ہی۔ اس کے پہلے حصہ میں جو ایڈریس ہز اکسلنسی سر ولیم میرس صاحب گورنر صوبہ متحدہ کو دیا گیا اور اس کا جواب اور ڈائرکٹر صاحبان سررشتہ تعلیم کے ایڈریس ہیں اور حصہ دوم میں انگریزی زبان میں جو تعلیمی لکچر دئے گئے وہ ہیں۔ کل تقریروں اور لکچروں کی تعداد ۲۱ ہی۔ اس جلد کی قیمت عہ ؍ ہے۔

جلد چہارم - صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا مشہور خطبہ صدارت ہی جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں ہی ہر ایک کی قیمت ۸ ؍ ہی۔

نوٹ - جو اصحاب سب جلدوں کو یکجائی خریدنا چاہیں اُن کے لئے قیمت سہ ؍ ہے۔

معذرت - کانفرنس کی رپورٹ کے سلسلہ میں سب سے اوّل اس کے دیر میں شایع ہونے کی معذرت پیش کرنی لازمی ہی۔ سب سے بڑی دقت لکچروں کے فراہم کرنے میں ہوئی جن کی نسبت بعض لکچرار صاحبان کی خدمت میں متعدد بار عرض کیا گیا، چنانچہ اب تک بعض لکچر اور تقریریں موصول نہیں ہوئیں۔ اس لئے جن اصحاب کے لکچر طبع ہونے سے رہ گئے۔ امید کہ وہ معاف فرمائینگے

مذکورہ بالا رپورٹ سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر کانفرنس واقع سلطان جہاں منزل علی گڑھ سے نقد قیمت ارسال کرنے یا قیمت طلب منگانے پر دستیاب ہو سکتی ہے۔